جدید اضافہ شدہ

توضیح البلاغۃ

شرح اُردو

دروس البلاغۃ

تالیف
مصلح الدین قاسمی
معین مدرس دار العلوم دیوبند

قدیمی کتب خانہ
مُقابل آرام باغ۔ کراچی

جدید اضافہ شدہ

توضیح البلاغۃ

شرح اُردو

دروس البلاغۃ

تالیف

مصلح الدین قاسمی

معین مدرس دارالعلوم دیوبند

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ۔ کراچی

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
تقریظ مولانا عبدالخالق صاحب	۸
پیش لفظ از شارح	۱۰
خطبۂ دروس البلاغہ	۱۲
علوم البلاغت	۱۴
فصاحت وبلاغت کا بیان	۱۴
فصاحت	۱۵
فصاحت کلمہ	۱۵
فصاحت کلام	۱۹
فصاحت متکلم	۲۹
بلاغت	۲۹
بلاغت کلام	۳۰
بلاغت متکلم	۳۲
علم معانی	۳۴
پہلا باب: بیان خبر وانشاء	۳۶
جملہ خبریہ کا بیان	۳۹
خبر کی اقسام	۴۶
کلام انشائی کی بحث	۴۹
امر	۴۹
نہی	۵۶
استفہام	۵۹
تمنی	۷۵
نداء	۷۹
دوسرا باب: ذکر وحذف کا بیان	۸۷
ذکر کے دواعی (اسباب)	۸۸
حذف کے دواعی (اسباب)	۹۲
تیسرا باب: تقدیم وتاخیر کا بیان	۱۰۲
چوتھا باب: تعریف وتنکیر کا بیان	۱۱۱
ضمیر	۱۱۲
علم	۱۱۴
اسم اشارہ	۱۱۶
اسم موصول	۱۲۱
محلی بال (الف لام)	۱۲۷
مضاف لمعرفہ	۱۳۱
منادیٰ	۱۳۶
نکرہ	۱۳۷
پانچواں باب: اطلاق وتقیید کا بیان	۱۴۱
تقیید مفاعیل کے ساتھ	۱۴۲
تقیید نواسخ کے ساتھ	۱۴۶
تقیید شرط کے ساتھ	۱۴۸
ان، اذا اور لو میں فرق	۱۵۰
تقیید نفی کے ساتھ	۱۵۶
تقیید توابع کے ساتھ	۱۵۸
چھٹا باب: قصر کا بیان	۱۶۳

مضمون	صفحہ
قصر حقیقی	۱۶۴
قصر اضافی	۱۶۴
قصر صفت علیٰ موصوف	۱۶۶
قصر موصوف علیٰ صفت	۱۶۶
قصر افراد	۱۶۸
قصر قلب	۱۶۸
قصر تعیین	۱۶۸
قصر کے چار طریقے	۱۶۹
ساتواں باب:	
وصل وفصل کا بیان	۱۷۰
واؤ کے ذریعہ وصل کے مواقع	۱۷۰
مواقع فصل	۱۷۳
آٹھواں باب:	
ایجاز، اطناب ومساوات	۱۸۲
مساوات	۱۸۲
ایجاز	۱۸۲
اطناب	۱۸۵
ایجاز کی قسمیں	۱۹۰
ایجاز قصر	۱۹۰
ایجاز حذف	۱۹۱
اطناب کی قسمیں	۱۹۳
عام کے بعد خاص کا ذکر کرنا	۱۹۳
خاص کے بعد عام کا ذکر کرنا	۱۹۳
ابہام کے بعد ایضاح کرنا	۱۹۴

مضمون	صفحہ
توشیع	۱۹۵
تکریر (کلام کا مکرر لانا)	۱۹۶
اعتراض (جملہ معترضہ کا آنا)	۱۹۷
ایغال	۱۹۷
تذییل	۲۰۱
احتراس	۲۰۳
تکمیل	۲۰۴
خاتمہ: کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف لانا	۲۰۴
جاننے والے کو نہ جاننے والے کے درجہ میں اتارنا	۲۰۵
غیر منکر کو منکر کے درجہ میں اتارنا	۲۰۶
غیر منکر کی دو قسمیں	۲۰۷
انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کو خالی الذہن کے درجہ میں اتارنا	۲۰۸
ماضی کو مضارع کی جگہ استعمال کرنا	۲۰۹
مضارع کو ماضی کی جگہ استعمال کرنا	۲۱۱
خبر کو انشاء کی جگہ استعمال کرنا	۲۱۲
انشاء کی جگہ جملہ خبریہ استعمال کرنا	۲۱۳
اسم ظاہر کی جگہ ضمیر لانا	۲۱۶
ضمیر کی جگہ اسم ظاہر لانا	۲۱۶
التفات	۲۱۷
تجاہل عارف	۲۲۱

مضمون	صفحہ
اسلوب حکیم	۲۲۲
تغلیب	۲۲۶
علم البیان	۲۲۹
تشبیہ	۲۲۹
مبحث اول: بیان ارکان تشبیہ	۲۳۱
مبحث ثانی: اقسام تشبیہ	۲۳۶
(۱) مفرد کی تشبیہ مفرد سے	۲۳۷
(۲) مرکب کی تشبیہ مرکب سے	۲۳۷
(۳) مفرد کی تشبیہ مرکب سے	۲۳۷
(۴) مرکب کی تشبیہ مفرد سے	۲۳۷
تشبیہ ملفوف	۲۴۰
تشبیہ مفروق	۲۴۱
تشبیہ تسویہ	۲۴۳
تشبیہ جمع	۲۴۳
تشبیہ تمثیل	۲۴۵
تشبیہ غیر تمثیل	۲۴۵
تشبیہ مفصل	۲۴۶
تشبیہ مجمل	۲۴۷
تشبیہ مؤکد	۲۴۷
تشبیہ مرسل	۲۴۷
مبحث ثالث: تشبیہ کے مقاصد کا بیان	۲۴۸
مشبہ کا امکان	۲۴۹
بیان حال مشبہ	۲۴۹
بیان مقدار حال مشبہ	۲۵۰
تقریر حال مشبہ	۲۵۳
تزئین حال مشبہ	۲۵۵
تقبیح حال مشبہ	۲۵۵
تشبیہ مقلوب یا معکوس	۲۵۶
مجاز	۲۵۷
استعارہ	۲۶۰
استعارہ مصرحہ	۲۶۳
استعارہ مکنیہ	۲۶۳
استعارہ تخییلیہ	۲۶۳
استعارہ اصلیہ	۲۶۶
استعارہ تبعیہ	۲۶۶
استعارہ مرشحہ	۲۶۸
استعارہ مجردہ	۲۶۹
استعارہ مطلقہ	۲۶۹
مجاز مرسل	۲۷۱
مجاز مرکب	۲۷۵
مجاز عقلی	۲۷۷
کنایہ	۲۸۱
مکنی عنہ صفت	۲۸۲
مکنی عنہ نسبت	۲۸۲
مکنی عنہ نہ صفت ہو نہ نسبت	۲۸۲

مضمون	صفحہ
تلویح	۲۸۶
رمز	۲۸۶
ایماءواشارہ	۲۸۷
تعریض	۲۸۷
علم البدیع	۲۸۸
محسنات معنویہ	۲۹۰
توریہ	۲۹۰
ایہام	۲۹۰
توجیہ	۲۹۳
طباق	۲۹۴
مقابلہ	۲۹۶
تدبیج	۲۹۷
ادماج	۲۹۷
استتباع	۲۹۷
مراعات نظیر	۳۰۰
استخدام	۳۰۲
استطراد	۳۰۳
افتنان	۳۰۳
جمع	۳۰۸
تفریق	۳۰۸
تقسیم	۳۰۸
طی ونشر	۳۱۳
ارسال مثل وکلام جامع	۳۱۴

مضمون	صفحہ
مبالغہ	۳۱۴
تبلیغ	۳۱۴
اغراق	۳۱۴
غلو	۳۱۴
مغایرت	۳۱۹
تاکید المدح بمایشبہ الذم	۳۱۹
تاکید الذم بمایشبہ المدح	۳۲۰
تجرید	۳۲۴
حسن تعلیل	۳۲۵
ائتلاف اللفظ مع المعنی	۳۲۵
محسنات لفظیہ	۳۳۱
تشابہ الاطراف	۳۳۱
جناس تام	۳۳۲
جناس مستوفی	۳۳۲
متشابہ	۳۳۲
مفروق	۳۳۲
غیر تام	۳۳۷
محرف	۳۳۷
مطرف	۳۳۷
مذیل	۳۳۸
مضارع	۳۳۸
جناس لاحق	۳۳۸
جناس قلب	۳۳۸

انتساب

☆ مرکزِ علم وفن دار العلوم دیوبند کے نام

☆ مشفق ومکرم والدین کے نام

☆ ان تمام اساتذۂ کرام کے نام

جن کے سامنے احقر نے زانوئے تلمذ تہہ کیا

مصلح الدین قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

از: حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی دامت برکاتہم

استاذ فقہ وادب دارالعلوم دیوبند

حامداً ومصلیاً ومسلماً وبعد!

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ علوم بلاغت (معانی، بیان، بدیع) کا شمار فنون عالیہ میں ہوتا ہے، کیوں کہ یہ علوم قرآنی بلاغت کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں، انسان ان کی مدد سے ''کتاب مبین'' کے بحر ناپیدا کنار سے بہت سے قیمتی موتی نکال سکتا ہے، لہٰذا قرآن فہمی اور حدیث فہمی کے طالب اور علوم نبوت کے وارث کے لیے جہاں قواعد نحو وصرف اور دیگر علوم وفنون سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے، وہیں قرآن پاک کی حلاوت اور چاشنی سے لذت آشنا ہونے کے لیے علوم بلاغت سے واقف ہونا بھی ازحد ضروری ہے، اسی کے مدنظر اکابر نے اس فن کی کتب بھی درسِ نظامی میں شامل فرمائیں۔

تلخیص المفتاح اور مختصر المعانی عرصے سے داخل نصاب ہیں، چند سالوں سے طلبہ کی سہولت کی خاطر ''دروس البلاغۃ'' بھی بلاغت کے اسباق میں شامل کردی گئی ہے، یوں تو عالمیت (الٰہ آباد بورڈ) کے کورس میں عرصۂ دراز سے چلی آرہی ہے مگر ہمارے یہاں نصاب کے اعتبار سے یہ نوخیز ہے، سہل ہونے کے ساتھ ساتھ بعض مضامین اس کے اہم اور دقیق ہیں، خاص کر نظائر وشواہد میں پیش کردہ بعض اشعار طفلانہ ذہن کے لیے بارگراں بنے ہوئے ہیں، اور چوں کہ اس

کتاب سے فن کی بسم اللہ ہوتی ہے اس لیے آسان مضامین بھی مبتدی طلبہ کے لیے مشکل ترین معلوم ہوتے ہیں، ان مشکلات کا بعض لوگوں نے حل بھی پیش کیا ہے، مگر کچھ نے تو کتاب کے ترجمے پر اکتفا کیا جس سے مقصد برآری نہیں ہوتی، بعض نے تفصیلات بھی پیش کیں مگر تشنگی باقی تھی، اسی پیاس کو بجھانے کے لیے عزیز مکرم جناب مولانا مصلح الدین قاسمی حفظہ اللہ۔ معین المدرسین دارالعلوم دیوبند۔ نے دروس البلاغۃ کے مضامین کو سمجھنے کے لیے ترجمے کے ساتھ تشریحات کا ایک عمدہ جوس تیار کر دیا ہے، قوی امید ہے کہ اس سے تشنگانِ علوم بلاغت کو سیرابی حاصل ہوگی، انشاء اللہ۔

بندے نے اس کے اکثر مضامین پر نظر ڈالی ہے، ماشاء اللہ شارح نے مناسب ترجمہ کیا ہے اور ضروری تشریح کی ہے، نہ تو اتنی طوالانی ہے کہ ذہن مضامین کا احاطہ نہ کر سکے اور نہ اتنا اختصار ہے کہ گنجلک باقی رہے، خداوند تعالیٰ اس کامیاب کوشش پر عزیز موصوف کو جزائے خیر دے اور مزید علمی و دینی خدمات کی توفیق بخشے۔

آمین یارب العالمین

خیر خواہ

عبدالخالق سنبھلی

خادم تدریس دارالعلوم دیوبند

۹/۴/۱۴۱۹ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

درس نظامی میں داخل مشہور کتاب "دروس البلاغۃ" اپنے اختصار کے باوجود علوم ثلاثہ "معانی، بیان، بدیع" کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جن کا سیکھنا ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہے، کیوں کہ ان علوم ثلاثہ کے بغیر کلامِ الٰہی کی فصاحت و بلاغت اور اس کے اعجاز کا سمجھنا ناممکن ہے۔

گزشتہ سال سے ہی احقر کی خواہش تھی کہ اس کتاب کی آسان زبان میں کوئی ایسی شرح لکھے جس سے طلبہ کے لیے کتاب کے جملہ مباحث کا سمجھنا آسان ہو جائے اور طلبہ کتاب سے کما حقہ استفادہ کرسکیں، اس لیے کہ کتاب کے بعض مقامات بہت پیچیدہ ہیں اور کوئی ایسی شرح نہیں تھی، جس کی طرف طلبہ رجوع کرسکیں، رب کریم کے فضل و کرم اور اساتذۂ کرام کی دعاؤں کے طفیل اس اہم کام کے کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، **فالحمد للّٰہ علی ذٰلك**۔

کتاب میں طویل تقریر سے احتراز کرتے ہوئے عبارت کے ترجمے، مختصر مگر جامع تشریح اور تمام مثالوں کے محل استشہاد کی وضاحت پر اکتفا کیا گیا ہے، تاکہ نہ تو مقصد فوت ہو اور نہ طلبہ کو اکتاہٹ ہو، آیات کریمہ کے ترجمے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے کا سہارا لیا گیا ہے۔

اس موقع پر میں اپنے مشفق و مکرم استاذ محترم حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی دام ظلہم العالی — استاذ فقہ و ادب دارالعلوم دیوبند — اور جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب — استاذ تفسیر دارالعلوم دیوبند — کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود احقر کی حقیر درخواست کو شرف

قبولیت سے نوازا، مسودے پر نظر ثانی فرمائی اور گراں قدر کلمات تحریر فرما کر حوصلہ افزائی فرمائی، نیز مفید مشوروں سے نوازا۔

راقم کی جانب سے برادر مکرم جناب مولانا سعود عالم صاحب قاسمی — معین المدرسین دارالعلوم دیوبند — و برادرم جناب مولوی شمشیر احمد مہاراشٹری بے پناہ شکریے کے مستحق ہیں کہ اول الذکر نے نظر ثانی و پروف ریڈنگ میں احقر کو اپنے تعاون سے نوازا جب کہ مؤخر الذکر نے کتابت سے لے کر طباعت تک کے مراحل تک احقر کا ساتھ دیا اور اپنے ہر ممکن تعاون سے نواز کر کتاب کو منظر عام پر لانے کی بے حد کوشش کی۔

کتاب کی اشاعت ثانی کے موقع پر جب کہ کتاب میں استشہاد کے طور پر ذکر کردہ اشعار کے لغات و ترکیب کے اضافے نیز بعض مواقع میں حذف و اضافے کی وجہ سے از سر نو کتابت ناگزیر ہوگئی، برادران عزیز افتخار احمد بانکوی و محمد اکرم اعظمی متعلمان دارالعلوم دیوبند نے پروف ریڈنگ میں احقر کا پورا پورا ہاتھ بٹایا، یہ عزیز طلبہ بھی احقر کی جانب سے شکریے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

دعا ہے کہ حق جل مجدہ اساتذۂ کرام اور جملہ معاونین کی محنتوں کو قبول فرما کر اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے، کتاب ہٰذا کو قبولیت عامہ نصیب فرمائے اور احقر کو مزید خدمت دین کی توفیق بخشے، آمین۔

مصلح الدین قاسمی سدھارتھ نگری
معین مدرس دارالعلوم دیوبند
۱۴ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
۱۰ جولائی ۱۹۹۸ء

خطبة دروس البلاغة

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدُ للّٰه الّذِيْ قصُرتْ عِبارةُ البُلَغاءِ عَن الإحاطةِ بمَعاني آياتهٖ ، وعجزتْ ألسُنُ الفُصَحاءِ عن بيانِ بدائِع مصنُوعاتهٖ ، والصَّلٰوة والسَّلامُ علٰى من ملكَ طرَفَيِ البلاغةِ إطنابًا وإيجازًا ، وعلٰى آلهٖ وأصحابهٖ الفاتحين بهَديِهم إلى الحقيقةِ مجازًا .

وبعدُ! فهٰذا كتابٌ في فنون البلاغةِ الثلاثةِ ، سهلُ المنالِ ، قريبُ المأخَذِ ، بَرِيٌّ مِن وصمةِ التَّطويلِ المُمِلّ ، وعَيبِ الاختِصارِ المُخِلّ ، سلكْنَا في تأليفهٖ أسهَلَ التَّراتيبِ ، وأوضحَ الأساليبِ ، وجمعنَا فيهِ خُلاصةَ قواعدِ البلاغةِ ، وأمَّهاتِ مَسائِلِها ، وتركْنا مالا تمسُّ إليهِ حاجةُ التلامذةِ مِنَ الفوائدِ الزَّوائدِ ، وقوفًا عندَ حدِّ اللَّازمِ ، وحرصًا علٰى أوقاتِهِم أن تضيعَ فِي حلِّ مُعقَّدٍ، أو تلخِيصِ مُطَوَّلٍ ، أو تكميلِ مُختصرٍ؛ فتَمّ بهٖ مع "كُتُبِ الدُّروسِ النحوِيَّةِ" سُلَّمُ الدِّراسةِ العرَبيَّةِ في المدارسِ الابتدائيَّةِ والتجهِيزيَّةِ ، والفضلُ في ذٰلك كُلِّهٖ للأميرَين الكبيرَين نُبلًا والإنسانينِ الكامِلينِ فضلًا : ناظِرِ المعارِفِ المُتافِي عن مهادِ الراحةِ في

خِدمةِ البلادِ الواقفِ في منفعتِها علىٰ قدَمِ الإستعدادِ صاحبِ العطُوفةِ "محمَّد زكي باشا" ووكيلِها ذِي الأيادِي البيضاءِ في تقدُّمِ المعارفِ نحو الصِّراطِ المستقيم وإدارةِ شُؤونِها علَى المِحورِ القويمِ ، صاحبِ السعادةِ "يعقوب أرتين باشا" فهُما اللّذانِ أشار علينا بوَضعِ هٰذا النِّظامِ المفيدِ وسُلوكِ سبيلِ هٰذا الوضع الجديدِ ، تحقيقًا لرغائبِ أمير البلادِ وليِّ أمرِها الناشئِ في مَهْدِ المعارفِ العارفِ بقدرِها مُجدِّد شُهرةِ الديارِ المِصريّةِ ومُعيد شبيبةِ الدّولةِ المُحمَّديَّة العلَويّةِ مولانا الأفخم "عبَّاس حِلمي باشا" الثاني أدام اللّٰه سعُود أمّتِه وأقرّبِه عيونَ آلِه ورجالِه وسائرِ رعيّتِه ، آمين .

حِفْني بِكَ ناصِف   محمّد بك ديّاب

سلطان أفندي محمّد   الشيخ مصطفىٰ طمّوم

علوم البلاغة

مُقدّمةٌ في الفصاحةِ والبلاغة

﴿الفصاحةُ﴾ في اللُّغة تُنبِئُ عَنِ البَيانِ والظُّهُورِ يُقالُ "أفصحَ الصَّبيُّ في منطِقِهِ" إذا بانَ وظهرَ كَلامُهُ ، وتقَعُ في الاصطِلاحِ وَصْفًا لِلْكلِمةِ والكَلامِ والمُتكلِّمِ.

علوم بلاغت

یہ مقدمہ ہے فصاحت وبلاغت کے بیان میں

فصاحت لغت میں بیان اور ظہور کو بتاتی ہے (فصاحت کے لغوی معنی بیان اور ظہور کے ہیں) أفصح الصبيّ في منطقه (بچے نے اپنی بات واضح کی) اس وقت کہا جاتا ہے جب بچے کی بات واضح اور ظاہر ہوجائے اور اصطلاح میں فصاحت، کلمہ، کلام اور متکلم کی صفت واقع ہوتی ہے۔

تشریح: مقدمہ دراصل مقدمہ الجیش سے ماخوذ ہے، مقدمۃ الجیش لشکر کے اس حصے کو کہتے ہیں جو لشکر کے آگے رہتا ہے، پس جس طرح مقدمۃ الجیش لشکر کے آگے رہتا ہے اسی طرح مقدمۃ الکتاب بھی کتاب سے پہلے اور آگے ہوتا ہے اسی مناسب کی وجہ سے اس کا نام مقدمہ رکھا گیا۔

مُقَدَّمَةٌ میں دو لغتیں ہیں (۱) مُقَدَّمَةٌ: دال کے فتحہ کے ساتھ، اس صورت میں باب تفعیل کا اسم مفعول ہوگا (۲) مُقَدِّمَةٌ: دال کے کسرے کے ساتھ، اس صورت میں اسی باب سے اسم فاعل ہوگا، جنہوں نے اسم مفعول پڑھا ہے

انہوں نے تقدیم کو فعل متعدی قرار دیا ہے اور جنہوں نے اسم فاعل پڑھا ہے انہوں نے تقدیم کو لازم قرار دیا ہے اور مقدّمۃ کو متقدّمۃ کے معنی میں لیا ہے، یہاں مقدمہ سے مراد وہ تمہیدی کلمات ہیں جو کسی کتاب کے آغاز میں کتاب کے مباحث مقصودہ سے متعلق بیان کئے جائیں۔

الفصاحة الخ: حضرات مصنفین نے سب سے پہلے فصاحت کی لغوی تعریف کی ہے کہ فصاحت کے لغوی معنی بیان اور ظہور کے ہیں، بعدازاں ذکر کردہ معنی کے اصل مخرج کو بیان کیا ہے کہ فصاحت کے یہ معنیٔ مذکور، اہل عرب کے محاورے ''أفصح الصبی في منطقه'' سے لیا گیا ہے جو اہل عرب اس وقت بولتے ہیں جب کہ بچے کی زبان سے صحیح کلمات نکلنے لگتے ہیں۔

وتقع في الاصطلاح الخ: فرماتے ہیں کہ فصاحت کی کوئی ایسی اصطلاحی تعریف نہیں ہے جو اس کے تمام اقسام کو شامل ہو البتہ یہ اصطلاح میں کلمہ، کلام اور متکلم کی صفت واقع ہوتی ہے اور انہیں کی ساتھ مل کر ہمیشہ پائی جاتی ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے ''كلمةٌ فصيحةٌ ، كلامٌ فصيحٌ ، متكلمٌ فصيحٌ'' گویا کہ فصاحت کی مثال ایسے ہی ہے جیسے استثنا، کہ استثنا کی بھی کوئی مستقل تعریف نہیں؛ بل کہ وہ بھی اپنے اقسام متصل و منفصل کے ضمن میں ہمیشہ پایا جاتا ہے۔

﴿ففصاحةُ الكَلِمةِ﴾ سَلامتُها مِنْ تنافُرِ الحُرُوفِ ومُخالَفةِ القِياسِ والغَرابَةِ، فتنافُرُ الحُرُوفِ وصْفٌ في الكَلِمَةِ يُوجِبُ ثِقْلَها علَى اللِّسانِ وعُسرَ النُّطقِ بِها ، نحوُ ''الظشّ'' للمَوضعِ الخَشِنِ و ''الهُعْخُعُ'' لِنباتٍ تَرْعاهُ الإبلُ و ''النُّقاخُ'' لِلماءِ العَذْبِ الصَّافِي و ''المُسْتَشْزِرِ'' للمَفتُولِ.

ترجمہ: تو فصاحت کلمہ تنافر حروف، مخالفت قیاس اور غرابت سے کلمہ کا محفوظ ہونا ہے، تو تنافرِ حروف کلمہ کا وہ وصف ہے جو زبان پر کلمے کے ثقل اور اس کے تلفظ کی دشواری کا باعث ہو، جیسے ''ظَشٌّ''، ''خَشِنٌ'' کی جگہ، کھردری جگہ

کے لیے ''ھُعْخُعٌ'' اس گھاس کے لیے جسے اونٹ چرتے ہیں اور لفظ ''نُقَاخٌ'' شیریں وصاف وشفاف پانی کے لیے اور ''مُستشزِرٌ'' بٹی ہوئی چیز کے لیے (خواہ وہ بال ہو یا رسی)

تشریح: ففصاحۃ الکلمۃ الخ: عبارت مذکورہ میں حضرات مصنفینؒ نے فصاحت کلمہ کی تعریف بایں طور کی ہے کہ فصاحت کلمہ نام ہے کلمہ کا تنافر حروف، مخالفت قیاس اور غرابت سے خالی ہونے کا، یعنی کوئی کلمہ فصیح اس وقت کہلائے گا جب مذکورہ موانعِ ثلاثہ اس میں نہ پائے جائیں، اور اگر کوئی بھی مانع پایا گیا تو وہ کلمہ فصیح نہیں ہوگا، ان تینوں موانع کی حضرات مصنفینؒ خود وضاحت فرماتے ہیں۔

یہاں یہ جان لینا خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ انہیں تینوں اوصاف میں انحصار کی وجہ کیا ہے؟ تو جاننا چاہئے کہ کلمہ کی فصاحت میں مخل یا تو اس کلمہ کے مادہ اور حروف میں کوئی عیب ہوگا یا کلمہ کی صورت اور صیغے میں کوئی عیب ہوگا، یا پھر کلمہ کے اپنے معنی پر دلالت میں کوئی عیب ہوگا، پہلی صورت میں تنافرِ حروف، دوسری صورت میں مخالفتِ قیاس، اور تیسری صورت میں غرابت ہے، ان مذکورہ تینوں چیزوں کے علاوہ کلمہ کی فصاحت میں مخل اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

فتنافر الحروف الخ: یہاں سے مصنفینؒ نے تنافر حروف کی تعریف کی ہے کہ تنافر حروف کلمے کی ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کی وجہ سے کلمہ زبان پر ثقیل ہو جائے اور اس کی ادائے گی دشوار ہو جائے، جیسے کھردرے پن کے معنی کی ادائیگی کے لیے ''خشِنٌ'' کے بجائے ''ظَشٌ'' اونٹوں کے گھاس کے لیے ''ھُعْخُعٌ'' شیریں صاف وشفاف پانی کے لیے ''نُقَاخٌ'' اور بٹی ہوئی چیز کے لیے ''مفتولٌ'' کی جگہ ''مُستَشْزِرٌ'' استعمال کرنا۔

وَمُخالفةُ القِیاسِ کَونُ الکَلِمةِ غَیرَ جارِیةٍ علَی القَانُونِ الصَرفِيِّ کَجمعِ بُوقٍ علٰی "بُوقاتٍ" في قَولِ المُتنبِّي ؎

فإنْ يكُ بعضُ النَّاسِ سيفًا لدولةٍ　　ففِي النَّاسِ بُوقاتٌ لَهَا وطُبُول

إذ القياسُ في جمعِهِ للقِلَّةِ أبواقٌ وكَمَودَدَةٍ في قولِهِ ؎

إنَّ بَنِيَّ لَلِئَامٌ زَهَدَةْ　　مالِيَ فِي صُدُورِهم مِنْ مَودَدَهْ

والقِياسُ مَوَدَّةٌ بالإدغامِ.

ترجمہ: اورمخالفت قیاس کلمے کا صرفی قاعدے کے خلاف جاری ہونا ہے، جیسے کہ "بُوق" کی جمع "بوقات" متنبّی کے شعر میں فان یك الخ ؎

پس اگر کوئی شخص کسی سلطنت کے لیے تلوار ہے تو بعض لوگ اس کے لیے بگل اور ڈھول ہیں۔

اس وجہ سے کہ قیاس اس کی جمع قلت میں "أبواق" کا مقتضی ہے اور جیسے کہ "مودَدَة" شاعر کے شعر انّ بنيَّ الخ میں ؎

بلاشبہ میرے بیٹے کمینے اور بخیل ہیں ان کے دلوں میں میری ذرہ برابر بھی محبت نہیں ہے۔

حالاں کہ قیاس "موَدَّة" ادغام کے ساتھ لانے کا تھا۔

تشریح: ومخالفة القياس الخ: عبارت مذکورہ میں مصنّفین نے مخالفت قیاس کی تعریف کی ہے اور دو مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے، فرماتے ہیں کہ مخالفت قیاس یہ ہے کہ کلمہ کو قاعدہ صرفی کے خلاف استعمال کیا جائے، مثلاً "بُوق" کی جمع "بُوقَات" استعمال کرنا، جیسا کہ متنبّی نے استعمال کیا ہے ؎

فإن يكُ بعض الناس سيفًا لدولة　　ففي الناس بوقات لها وطبول

لغات: سيفٌ (ج) سُيُوفٌ تلوار۔ دولةٌ (ج) دُوَلٌ، سلطنت، حکومت۔ بُوقاتٌ (واحد) بُوقٌ، بگل۔ طُبُولٌ (واحد) طَبْلٌ ڈھول۔

ترکیب: يكُ اصل میں يكن تھا، اِن شرطیہ جازمہ کی وجہ سے واو حذف ہوگیا، خلاف قیاس نون کو بھی حذف کر دیا، بعض الناس، يك کا اسم ہے

سیفًا لدولة خبر، فعل ناقص اپنے اسم وخبر سے مل کر شرط، فاجزائیہ، في الناس خبر مقدم، بوقات لها وطبول مبتدا موخر، مبتدا موخر اپنی خبر مقدم سے مل کر جملہ شرطیہ جزائیہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشہاد لفظ ''بوقات'' ہے جو ضابطہ کے خلاف استعمال کیا گیا ہے، کیوں کہ ضابطہ یہ تھا کہ ''أبواق'' استعمال کیا جاتا، اس لیے کہ جمع قلت کے اوزان مقرر ہیں اور ان میں سے کوئی بھی وزن ''فُعْلاتٌ'' نہیں ہے۔

جمع قلت کے اوزان یہ ہیں: أَفْعُلٌ ، أَفْعَالٌ ، أَفْعِلَةٌ ، فِعْلَةٌ .

مخالفت قیاس کی دوسری مثال اس شعر میں ہے ۔

إنَّ بنيَّ لِلِـــئَـامٌ زَهَـــدَهْ   مَا لِي في صُدُورهم من مَوْدَدَهْ

لغات: لِئَامٌ (واحد) لئیمٌ کمینہ۔ زَهَدَةٌ (واحد) زاهِدٌ تارک الدنیا، یہاں بخیل کے معنی میں ہے، صُدُورٌ (واحد) صدرٌ سینہ، دل۔ مَوْدَدَةٌ، ودَّ یودُّ مودَّةً (س) محبت کرنا۔

ترکیب: إنَّ حرف مشبہ بہ فعل، بنيَّ اس کا اسم (یہ اصل میں بنینَ یَ تھا، نون اضافت کی وجہ سے گر گیا، پھر یا کو یا میں مدغم کر دیا بنيَّ ہو گیا) لام برائے تاکید لِئَامٌ خبر اول زهدة خبر ثانی۔

اس دوسرے شعر میں محل استشہاد لفظ ''مَوْدَدَةٌ'' ہے جو خلاف قیاس مستعمل ہے، کیوں کہ ضابطہ یہ ہے کہ جب ایک جنس کے دو حرف جمع ہو جائیں اور دونوں متحرک ہوں تو اول کی حرکت کو ماقبل کو دے کر دونوں کا آپس میں ادغام کر دیتے ہیں، لہٰذا اس ضابطہ کے تحت ''مودَّةٌ'' ہونا چاہئے تھا، جب کہ شاعر نے بغیر ادغام کے ''مَوْدَدَةٌ'' استعمال کیا ہے۔

وَالغَرابَةُ كَونُ الكَلِمَةِ غيرَ ظاهِرَةِ المَعْنٰى ، نحوُ "تكَأْكَأ" بِمَعْنٰى اجتَمَعَ وَ "افْرَنْقَعَ" بِمَعْنٰى انصرفَ و "اطْلَخَمَّ" بِمعنٰى اِشْتَدَّ .

ترجمہ: اور غرابت کلمے کے معنی کا ظاہر نہ ہونا ہے، جیسے ''تکأکأ ، اجتمعَ'' کے معنی میں (جمع ہونا) ''افرنقع ، انصرف'' کے معنی میں (واپس ہونا) اور ''اطْلَخَمَّ ، اشتدَّ'' کے معنی میں (سخت ہونا)۔

تشریح: الغرابة الخ: یہاں سے مصنفینؒ نے غرابت کی تعریف کی ہے پھر اسے مثالوں سے واضح کیا ہے چناں چہ فرماتے ہیں کہ غرابت کا مطلب یہ ہے کہ لفظ وحشی، مجهول المعنی، یا غیر مانوس الاستعمال ہو، جیسے ''تکأکأ، اجتمع'' کے معنی مین (اکٹھا ہونا) ''افرنقع ، انصرف'' کے معنی میں (لوٹنا، واپس ہونا) ''اِطْلَخَمَّ، اِشْتَدَّ'' کی معنی میں (سخت ہونا) تو امثال مذکورہ میں اجتمع، انصرف ، اشتدّ یہ تینوں افعال تو معروف المعنی اور مانوس الاستعمال ہیں مگر تکأکأ ، افرنقع اور اطلخَمَّ مجہول المعنی اور غیر مانوس الاستعمال ہیں گویا ان تینوں افعال میں غرابت پائی جاتی ہے۔

﴿وفصاحةُ الكلام﴾ سلامَتُهُ من تنافُرِ الكلِماتِ مُجتمِعةً ومن ضعفِ التأليفِ ومن التعْقِيدِ مَعَ فصاحةِ كلِماتِهِ ، فالتَّنافُرُ وصفٌ في الكلامِ يُوجبُ ثِقلَهُ علَى اللِّسانِ وعُسرَ النُّطقِ بهِ نحوُ ـ

ع في رفع عرش الشَّرع مِثْلكَ يشرَعُ

ع وليسَ قربَ قبرِ حربٍ قبْرٌ

وكذا قوله:

كرِيمٌ متى أمدَحْهُ أمْدَحْهُ والورىٰ معِي وإذا ما لُمتُهُ لُمتُهُ وَحدِيْ

ترجمہ: فصاحت کلام، مسلسل متنافر حروف، ضعف تالیف اور تعقید سے کلام کا محفوظ ہونا ہے اس کے ساتھ ساتھ کہ کلام کے کلمات بھی فصیح ہوں، پس تنافر کلمے کا ایسا وصف ہے جو زبان پر کلمے کے ثقل اور اس کے تلفظ کی دشواری کا سبب بنے جیسے في رفع عرش الشرع الخ ـ

شریعت کی عزت وتخت کی سربلندی کا کام آپ جیسا شخص ہی کرسکتا ہے،

حرب کی قبر کے قریب کوئی قبر نہیں ہے۔

(میرا ممدوح) ایسا شریف وسخی ہے کہ جب میں اس کی تعریف کرتا ہوں تو ساری مخلوق میرے ساتھ اس کی تعریف کرتی ہے اور جب میں اس کی ملامت کرتا ہوں تو تنہا ملامت کرتا ہوں۔

تشریح: فصاحة الكلام الخ: فصاحت کلمہ کی تعریف اوراس کی تشریح وبیان سے فرمانے کے بعد یہاں سے حضرات مصنفینؒ فصاحت کلام کی تعریف کررہے ہیں کہ کلام فصیح وہ کلام ہے جس کے تمام کلمات فصیح ہوں، اور تنافر کلمات، ضعفِ تالیف اور تعقیدِ لفظی ومعنوی سے خالی ہو، مطلب یہ ہے کہ کوئی کلام اسی وقت فصیح ہوسکتا ہے جب کہ اس کے تمام کلمات فصیح ہوں اور وہ کلام تین عیوب سے پاک ہو (۱) تنافر کلمات مجتمعۃ (۲) ضعف تالیف (۳) تعقید لفظی ومعنوی۔

فالتنافر وصف في الكلام الخ: یہاں سے مصنفینؒ فصاحت کلام میں لگی ہوئی قیود کی الگ الگ وضاحت فرمارہے ہیں کہ تنافر کلمات نام ہے چند کلمات کا اس طرح جمع ہونا کہ ان کے تلفظ میں زبان پر ثقل پیدا ہوجائے اوران کی ادائے گی دشوار ہوجائے اگرچہ وہ کلمے خود الگ الگ اپنی جگہ فصیح ہوں مثلاً

في رفع عرش الشرع مثلُك يشرع

لغات: رَفَعَ يَرْفَعُ رفعًا (ف) اٹھانا، بلند کرنا۔ عرشٌ (جمع) عروشٌ تخت۔ شرَعَ يشرَعُ شرعًا (ف) اٹھانا۔

ترکیب: فی جارہ رفع عرش الشرع مضاف با مضاف الیہ مجرور ہوکر متعلق مقدم ہوا يشرع کا، يشرع فعل اپنے فاعل اور متعلق سے مل کر خبر، مِثْلُكَ مبتدا کی، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

شعر مذکور میں ''عرشٌ'' اور ''شرعٌ'' کے وزن کے اتحاد نیز ''عرش،

شرع ''اور''یشرع'' کے حروف کی یکسانیت کی وجہ سے تنافر پیدا ہوا ہے اور یہی الفاظ عرشٌ، شرعٌ، یشرعُ محل استشہاد ہیں، یہ مثال عسر نطق کی ہے۔

تنافر کی دوسری مثال ع لیس قرب قبر حرب قبر

لغات: قرُبَ یقرُبُ قربًا (ک) قریب ہونا، قبرٌ (جمع) قبورٌ قبر، حرب ایک شخص کا نام ہے۔

ترکیب: لیس فعل ناقص، قرب قبر حرب، مضاف با مضاف الیہ خبر مقدم ''قبر''اسم موخر۔

مصرع مذکور میں ''قرب، قبر، حرب'' یہ سب کلمات علاحدہ فصیح ہیں، مگر حروف میں مکمل یا قریب قریب اتحاد کی وجہ سے تنافر آ گیا ہے، یہ مثال ثقل شدید کی ہے۔

مثال مذکور شعر کا ایک مصرع ہے اور یہ شعر کسی جن کا ہے، حرب ابن امیہ نے ایک جن کو جو سانپ کی شکل میں تھا پیر سے روند کر مار ڈالا تو ایک جن نے اس پر زور دار چیخ لگائی جس سے حرب ابن امیہ مر گیا اس کے بعد اس جن نے یہ شعر پڑھا، پورا شعر اس طرح ہے۔

قبر حرب بمكان قفر ولیس قرب قبر حرب قبر

حرب کی قبر بے آب وگیاہ میدان میں ہے اور حرب کی قبر کے پاس کوئی قبر نہیں ہے۔ تیسری مثال ابوتمام کا یہ شعر ہے۔

کریمٌ متی امدحه امدحه والوریٰ معي وإذا مالمته لمته وحدي

لغات: کریمٌ (جمع) کِرامٌ و کرماء شریف النفس، سخی۔ مدحَ یمدحُ مدحًا (ف) تعریف کرنا، الوریٰ مخلوق، لام یلُومُ لومًا وملامةً (ن) ملامت کرنا۔

ترکیب: کریمٌ خبر مبتدا محذوف ہے أي هو کریمٌ متیٰ شرطیہ

امدحهٗ فعل فاعل اور مفعول سے مل کر شرط، أمدحُ فعل ضمیر أنا، ذو الحال، ہٗ مفعول بہ، واو حالیہ، الوریٰ مبتدا، معي محذوف کے متعلق ہوکر خبر، مبتدا با خبر حال، ذو الحال با حال فاعل، فعل با فاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر جزا، شرط با جزا جملہ شرطیہ جزائیہ ہوا، إذا مالمته شرط لمته وحدي جزا، وحدي متوحداً کے معنی میں ہوکر ضمیر فاعل سے حال ہے۔

شعر مذکور میں محل استشہاد لفظ ''امدحه'' کا تکرار ہے اسی تکرار کی وجہ سے تنافر پیدا ہوا ہے، لہٰذا اس میں ثقل تو ہے مگر شدید نہیں بل کہ خفیف ہی۔ اردو میں جیسے ؎

چچا چار کچرے کچے چچا چار کچرے پکے
پکے کچرے کچے چچا کچے کچرے پکے

اسی طرح میر کے اس شعر کے دوسرے مصرع میں بھی تنافر ہے:

تربت قیس پہ ٹکرائے یہ آہو کہ تمام
گئے شاخوں کی دھڑ ادھڑ سے یہ جھڑ جھڑ پتھر

وضُعفُ التأليفِ كونُ الكلامِ غيرَ جارٍ علَى القَانُونِ النَّحْوِيِّ المَشهُورِ كالإضمَارِ قبلَ الذِّكرِ لفظًا ورُتبةً في قولِه ؎

جَزَىٰ بنُوهُ أبَا الغَيلانَ عنْ كِبَرٍ
وحُسْنِ فِعْلٍ كَمَا جُوزِيَ سِنِمَّارُ

ترجمہ: اور ضعف تالیف کلام کا مشہور نحوی ضابطے کے مطابق جاری نہ ہونا ہے جیسے کہ کسی لفظ کو ذکر کرنے سے پہلے ہی ضمیر لے آنا لفظ اور رتبے دونوں اعتبار سے شاعر کے شعر ''جزیٰ بنوه الخ'' میں ؎

اس کے بیٹوں نے ابو الغیلان کو بڑھاپے اور حسن سلوک کے باوجود ایسا بدلہ دیا جیسا کہ سنمار (نامی معمار) کو دیا گیا تھا۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفین نے ضعف تالیف کی تعریف کی ہے اور مثال سے اسے واضح کیا ہے چناں چہ فرمایا کہ ضعف تالیف نام ہے ترکیب کلام کا مشہور نحوی قاعدے کے خلاف مستعمل ہونے کا، مثلاً نحو کا قاعدہ ہے کہ ضمیر کے مرجع کو لفظاً اور رتبۃً دونوں اعتبار سے مؤخر کرنا جائز نہیں اور شاعر نے مندرجہ ذیل شعر میں اسی قاعدے کی خلاف ورزی کی ہے ؎

جزى بنوه أبا الغيلان عن كبر　　　حسن فعل كما جوزي سنمار

لغات: جزیٰ، **يجزي جزاء** (ض) بدلہ دینا، بنوئ، ابن کی جمع ہے، نون اضافت کی وجہ سے ساقط ہوگیا ہے، ابو الغیلان ایک شخص کا نام ہے، کَبُرَ یَکْبُرُ کِبرًا (ک) بڑا ہونا، بوڑھا ہونا، سنمار ایک شخص کا نام ہے۔

ترکیب: جزیٰ فعل، بنوہ، فاعل، أبا الغیلان مفعول بہ، عن حرف جار، کبرٍ معطوف علیہ، واو عاطفہ حسن فعل، مضاف با مضاف الیہ معطوف، معطوف علیہ با معطوف مجرور، جار با مجرور متعلق ہوا جزیٰ فعل کے۔ کاف جارہ بمعنی مثل مضاف، **ما** مصدریہ، **جوزي** فعل، **سنمار** نائب فاعل، فعل با فاعل صلہ، ما مصدریہ با صلہ بہ تاویل مصدر شدہ مجرور، جار با مجرور مضاف الیہ شدہ صفت واقع ہے، مصدر محذوف **جزاءً أي جزاءً مثل جزاء سنّمار**۔

شعر مذکور کا پس منظر

سنمار ایک شخص کا نام ہے، یہ روم کا باشندہ تھا، معماری کا کام کرتا تھا اس نے حیرہ کے بادشاہ نعمان کے لیے کوفہ میں خورنق نامی ایک عمدہ محل تعمیر کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ جب محل تیار ہوگیا تو بادشاہ کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر یہ زندہ رہا تو کسی اور بادشاہ کے لیے بھی اس جیسا محل تیار کردے گا پھر میرے اس محل کی کوئی خصوصیت نہ رہ جائے گی، اس خطرے کے پیش نظر اس کو اوپر سے گرا کر ہلاک

کردیا، پھر یہ سوئے مکافات میں ضرب المثل بن گیا۔

شعر مذکور میں ابوالغیلان جو کہ اسم ہے اس کو ذکر کرنے سے پہلے ہی "بنوہ" میں اس کی ضمیر لے آئے ہیں جو ضابطہ مذکور کے خلاف ہے۔

رہا یہ کہ اضمار قبل الذکر لفظاً اور رتبتاً دونوں اعتبار سے کیسے لازم آیا تو یہ بایں طور کہ لفظی اعتبار سے تو ہم ضمیر کو اسم (ابوالغیلان) سے پہلے دیکھ ہی رہے ہیں اور رتبی اعتبار سے اس طریقہ سے کہ اس ضمیر کا مرجع ابوالغیلان ہے جو مفعول بہ واقع ہے اور مفعول کا مرتبہ فاعل کے بعد ہوتا ہے اس لیے گویا ابوالغیلان رتبے کے اعتبار سے بھی بعد میں ہے جب کہ اس کی ضمیر کو پہلے ذکر کردیا گیا ہے لہٰذا معنوی اعتبار سے بھی اضمار قبل الذکر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ضابطے کی عدم رعایت کی بنا پر ضعف تالیف پالیا گیا تو اب اس کلام کو کلام فصیح نہیں کہا جاسکتا ہے۔

والتَّعقِيدُ أن يكُونَ الكلامُ خفِيَّ الدَّلالةِ علَى المعنى المُرادِ. وَالخِفاءُ إمّا مِنْ جِهةِ اللَّفظِ بِسَببِ تقدِيمٍ أو تأخِيرٍ أو فصْلٍ ويُسمّى تعقِيدًا لفظِيًّا، كقَولِ المُتنبي ؎

جَفَخَتْ وهُم لا يجفَخُونَ بِها بِهِمْ
شِيَمٌ علَى الحَسَبِ الأغرِّ دلَائلُ

فإنَّ تقديرَهُ "جَفَخَتْ بِهِمْ شِيَمٌ دلائلُ علَى الحسَبِ الأغرِّ وهم لايجفَخُونَ بِها".

ترجمہ: اور تعقید یہ ہے کہ کلام معنی مقصود پر صاف دلالت نہ کرتا ہو اور یہ خفا یا تو لفظ کی جہت سے ہوگا کسی لفظ کو مقدم یا مؤخر یا درمیان میں فصل آجانے کی وجہ سے اور اس خفا کو تعقید لفظی کہا جاتا ہے، جیسا کہ متنبّی کا شعر جفخت الخ ؎ (ممدوح کے اخلاق نے ان پر) فخر کیا ہے جو کہ اس کے اعلیٰ حسب ونسب

پر دلیل ہیں، حالاں کہ وہ لوگ خود اپنے ان اخلاق پر فخر نہیں کرتے ہیں۔

کیوں کہ اس شعر کی تقدیری عبارت ''جَفَخَتْ بِهِمْ شِيَمٌ دلائِلُ على الحسب الأغرّ وهُمْ لايَجْفَخُونَ بِها'' ہے۔

تشریح: یہاں سے حضرات مصنفینؒ تعقید اور اس کی دونوں قسموں کی وضاحت فرما رہے ہیں، کہ اگر مکمل وضاحت کے ساتھ معنیٰ مقصود پر کلام کی دلالت نہ ہو تو گویا کلام میں تعقید پائی جا رہی ہے، پھر فرمایا کہ اگر لفظ کی جہت سے ہو تو اس کا نام تعقید لفظی ہے اور تعقید لفظی کا مطلب یہ ہے کہ نظم کلام میں لفظی خلل پیدا ہو (یعنی کلمات کے اپنی اصلی جگہوں سے مقدم یا موخر یا حذف یا فصل وغیرہ) ہونے کی وجہ سے کلام کا مطلب ظاہر نہ ہو، مثلاً متنبی کا شعر۔

جَفَخَتْ وَهُمْ لايَجْفَخُونَ بِهَا بِهِمْ
شِيَمٌ على الحَسَبِ الأغرِّ دلائِلُ

لغات: جفَخَ يجفَخُ جفْخًا (ف) فخر کرنا، شِيَمٌ (واحد) شيمةٌ عادت خصلت، الأغر غرَّ يغرُّ غررًا (س) سفید ہونا خوبصورت ہونا، دلائِلُ (واحد) دلالۃٌ ہر وہ چیز جس سے رہنمائی حاصل کی جائے، علامت۔

ترکیب: جَفَخَتْ فعل شِيَمٌ موصوف، دلائل علَى الحسبِ الأغر صفت، بهم جفخت سے متعلق ہے اور وهم لايجفخون بها فاعل سے حال واقع ہے۔

شعر مذکور میں کلمات کی تقدیم وتاخیر کی وجہ سے معنیٰ مقصود کی مکمل وضاحت نہیں ہو پا رہی ہے، اس لیے کہ اس شعر میں تعقید لفظی ہے، تقدیم وتاخیر تقدیری عبارت سے واضح ہے کہ شاعر نے جَفَخَت فعل اور اس کے فاعل شِيَمٌ کے درمیان وهُمْ لايَجفَخُون بِها بِهِمْ سے فصل کیا ہے، اور ''شِيَم'' موصوف اور اس کی صفت ''دلائل'' کے درمیان ''على الحسب الأغرّ'' سے فصل کیا ہے،

اسی طرح "بھم" "جفخت" سے متعلق ہے مگر شاعر نے اسے "لایجفخون" کے بعد ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ بھم ، لایجفخون کے متعلق ہے حالاں کہ ایسا نہیں۔

دوسری مثال "ماقرأ إلا واحدًا محمدٌ مع كتابًا أخيه" ہے، یہاں بھی "واحدًا" صفت اپنے موصوف "كتابًا" پر مقدم ہے اور حرف استثناء و مستثنیٰ اور مضاف و مضاف الیہ کے درمیان فصل ہے اصل عبارت "ماقرأ محمدٌ مع أخيه إلا كتابًا واحدًا" ہے۔ نہیں پڑھا محمد نے اپنے بھائی کے ساتھ مگر ایک کتاب اردو میں جیسے سودا کا شعر ؎

توڑ کر بت خانے کو مسجد بنائی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

اصل کلام یہ تھا "برہمن کے دل کی تعمیر کا بھی کچھ فکر ہے" یہاں "تعمیر" مضاف اور "دل" مضاف الیہ کے درمیان فصل اجنبی ہے۔

وَإمَّا مِنْ جِهَةِ المَعنٰى بِسبَبِ استِعمالِ مَجازاتٍ وَكِناياتٍ لايُفهَمُ المرادُ بِها ، ويُسمّٰى تعقِيدًا معنوِيًّا ، نَحْوُ قولِكَ : "نشرَ المَلِكُ أَلْسِنَتَهُ في المدِيْنَةِ" مُرِيْدًا جَواسِيسَهُ والصَّوابُ نشرَ عيُونَهُ، وقَولِهٖ ؎

ساطْلُبُ بُعْدَ الدَّارِ عنكُم لتقرُبُوا
وتسْكُبُ عِيْنايَ الدُّمُوعَ لتَجْمُدا

حيثُ كنٰى بِالجُمُودِ عَنِ السُّرُورِ معَ أنَّ الجُمُودَ يُكنٰى بِهٖ عَنِ البُخْلِ بِالدُّمُوعِ وقتَ البُكاءِ .

ترجمہ: اور (خفا) یا تو معنی کی جہت سے ہوگا ایسے مجازات وکنایات کے استعمال کرنے کے وجہ سے جن کی مراد کو نہ سمجھا جاسکے اور اس کا نام تعقید معنوی ہے، جیسا کہ تمہارا قول نشرَ المَلِكُ السِنَتَهُ (بادشاہ نے اپنی زبانوں کو شہر میں

پھیلا دیا) اس حال میں کہ تم بادشاہ کے جاسوس مراد لے رہے ہو، حالاں کہ صحیح "نشر عیونہ" ہے اور جیسے شاعر کا شعر سأطلب الخ۔

میں تم سے مکان کی دوری چاہتا ہوں تا کہ تم قریب ہو جاؤ اور میری آنکھیں آنسو بہائیں گی تا کہ وہ جم جائیں۔

چناں چہ جمود کا سرور سے کنایہ کیا ہے باوجودے کہ جمود کا روتے وقت بخل سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

تشریح: یہاں سے مصنفینؒ تعقید کی دوسری قسم کو بیان فرمارہے ہیں کہ اگر خفا از روئے معنی ہو تو اس کا نام تعقید معنوی ہے یعنی تعقید معنوی کہتے ہیں کلام کا مطلب اس وجہ سے ظاہر نہ ہونا کہ متکلم کے مقصد تک لوازم بعیدہ اور وسائط کثیرہ کے بغیر رسائی نہ ہو سکے، اس وجہ سے کہ متکلم نے کلام میں ایسے مجازات و کنایات کا استعمال کر دیا ہے جن کی وجہ سے کلام کا مقصد بغیر لوازم بعیدہ کے سمجھنا دشوار ہے جیسے نَشَرَ المَلِكُ أَلْسِنَتَهُ الخ

مثال مذکور میں "ألسنته" کی جگہ درحقیقت "عیونہ" ہونا چاہئے اس لیے کہ اس سے مراد جاسوس ہیں اور جاسوس کے لیے "عین" کا استعمال کیا جاتا ہے "لسان" کا نہیں، اور جاسوس کو عین اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی آنکھ تمام اعضاء میں خصوصیت رکھتی ہے، کیوں کہ آنکھ ہی کے ذریعہ جاسوس تمام حالات معلوم کرتا ہے اور اپنے فرائض درحقیقت آنکھ ہی سے انجام دیتا ہے، اس لیے مجازاً جاسوس کو عربی میں "عین" کہتے ہیں، اور عین کے ذریعے جاسوس کا کنایہ کنایۂ قریبہ ہے، گویا کہ عین سے جاسوس کا معنیٰ مذکور لوازم اور وسائط کے بعد سمجھ میں آیا ہے، اس لیے اس میں تعقید معنوی ہے۔

اور جاسوس ولسان کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ جاسوس ترجمان ہوتا ہے اور ترجمانی چوں کہ زبان سے ہوتی ہے اس لیے لسان کو بھی مجازاً جاسوس کہہ دیا

جاتا ہے۔ مگر لسان سے جاسوس کا کنایہ کنایۂ بعیدہ ہے۔

دوسری مثال عباس بن احنف کا یہ شعر

سأطْلُبُ بُعْدَ الدَّارِ عنكُمْ لِتقْرُبُوا
وتَسْكُبُ عَيْنايَ الدُّمُوعَ لِتجْمُدَا

لغات: طَلَبَ يَطْلُبُ طلبًا (ن) طلب کرنا، مانگنا۔ قَرُبَ يقْرُبُ قربًا (ک) قریب ہونا۔ سَكَبَ يسكُبُ سَكْبًا (ن) پانی بہانا، دَمُوعٌ (واحد) دَمْعٌ آنسو، جَمَدَ يجْمُدُ جُمُودًا (ن) جم جانا۔

ترکیب: اطلبُ فعل بافاعل، بعد الدار مفعول بہ، عنکم متعلق بہ اطلب، لام جارہ بمعنی ''کی'' بعدہ ''ان'' مقدر، ''تقربوا'' فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ بتاویل مفرد ہوکر مجرور، جار مجرور اطلب سے متعلق ہوکر معطوف علیہ، واو عاطفہ تسکب عيناي الدموع فعل فاعل مفعول، لتجمدا، لتقربوا کی طرح بہ تاویل مفرد ہوکر متعلق ہوا تسکب کے، فعل بافاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف، معطوف علیہ با معطوف جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں شاعر نے دو کنایہ استعمال کیا ہے ایک تو آنسو کے جاری ہونے کو حزن وغم سے کنایہ کیا ہے اس میں کوئی خلل اور کوئی تعقید نہیں، دوسرے جمود عین کے ذریعہ (آنکھوں کا خشک ہوجانا) فرح وسرور سے کنایہ ہے، اسی میں تعقید معنوی ہے، اس وجہ سے کہ اس میں متعدد وسائط کی طرف ذہن کے انتقال کے بعد شاعر کی مراد ذہن میں آئے گی، شاعر کی مراد یہ ہے کہ اب میں تم سے بُعدِ مکانی اختیار کرکے اپنے نفس کو فراق پر راضی کروں گا اور اس کو حزن وغم کے برداشت کرنے کا خوگر بناؤں گا اور خوب روؤں گا جس کے نتیجے میں مجھ کو قرب ووصال نصیب ہوگا اور رنج وغم دور ہوکر فرح وسرور حاصل ہوگا، تو آنسو خشک ہوکر آنکھیں جم جائیں گی۔

اس مثال میں بھی مطلب کو سمجھنے کے لیے وسائط کثیرہ اور لوازم بعیدہ کی ضرورت پڑتی ہے، اردو میں جیسے

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

مطلب یہ ہے کہ شہد کی مکھیوں کو باغ میں مت جانے دو، کیوں کہ اگر وہ باغ میں جائیں گی تو پھلوں اور پھولوں کا رس چوس کر شہد کا چھتہ بنائیں گی، چھتے سے موم نکلے گا، اس سے موم بتیاں بنائی جائیں گی اور لوگ جب موم بتیاں جلائیں گے تو بیچارے پروانے آ کر مریں گے اور ان کا ناحق خون ہوگا، اتنے وسائل کی طرف ذہن کو منتقل کرنے کے بعد شاعر کا مقصد سمجھ میں آیا ہے۔

۳ . ﴿وفَصَاحَةُ المُتَكَلِّمِ﴾ مَلَكَةٌ يَقْتَدِرُبِها علَى التَّعبِيرِ عنِ المَقْصُودِ بِكلامٍ فصِيحٍ فِي أيِّ غرضٍ كانَ .

ترجمہ: فصاحت متکلم ایک ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعہ مقصود کو بیان کرنے پر متکلم فصیح زبان میں قادر ہوتا ہے جس غرض میں بھی (کلام) ہو۔

تشریح: عبارت بالا میں فصاحت متکلم کی تعریف کرتے ہوئے مصنفین نے یہ بیان کیا ہے کہ متکلم فصیح کوئی انسان اسی وقت کہلائے گا جب کہ اس کے اندر ایسا ملکہ ہو جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصد کو فصیح الفاظ میں بیان کرنے پر قادر ہو، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی انسان میں ایسا ملکہ اور ایسی قوت نہیں ہے کہ وہ تمام مقاصد میں کلام فصیح میں گفتگو کر سکے، بل کہ اتفاق سے بعض بعض مضامین میں فصیح جملے استعمال کر لیتا ہے تو ایسا انسان متکلم فصیح نہیں کہلائے گا پھر یہ کہ بالفعل ادا کرنا کوئی ضروری نہیں بل کہ اس کی قوت اور استعداد موجود ہو کہ جب بھی ضرورت پڑے فصیح کلام میں گفتگو کر سکے۔

﴿ وَالبَلاغَةُ ﴾ في اللُّغةِ الوُصُولُ والانتِهاءُ ، يُقالُ: "بَلَغَ فُلانٌ مرادَهُ" إذَا وصَلَ إليهِ "وبَلَغَ الرَّكبُ المدِينةَ" إذا انتهَى إلَيْها ، وتَسَعُ في

الاصطِلاحِ وصفًا لِلْكلامِ والمُتكلّمِ .

١. ﴿ فبَلاغَةُ الكَلامِ ﴾ مُطابَقَتُهُ لمُقْتَضَى الحَالِ مَعَ فَصَاحتِهِ . الحَالُ ويُسمّٰى بِالمَقامِ هُوَ الأمرُ الحَامِلُ للمُتكلّم علٰى أن يُورِدَ عِبارَتَهُ علٰى صُــورةٍ مخْصُوصَةٍ ، والمُقتضٰى ويُسمّٰى الاعتبارَ المُناسِبَ هُوَ الصُّورةُ المَخْصُوصةُ الّتِي تُورَدُ علَيهاْ العِبارةُ ، مثلاً : المدْحُ حالٌ يَدعُو لِإيرادِ العِبارةِ علٰى صُورةِ الإطْنـابِ ، وذَكاءُ المُخَاطبِ حالٌ يـدعُـو لِإيرَادِها علٰى صُورَةِ الإيْجازِ ؛ فَكُلٌّ مِنَ المَدْحِ والذَّكاءِ حالٌ ، وكُلٌّ مِنَ الإطْنابِ والإيجازِ مُقتَضًى ، وإيرادُ الكَلامِ علٰى صُورَةِ الإطنابِ والإيجازِ مُطابقةٌ للمُقتضٰى .

ترجمہ: بلاغت لغت میں پہنچنے اور رک جانے کا نام ہے کہا جاتا ہے، "بَلَغَ فُلانٌ مُرادَهُ" جب مقصد تک پہنچ جائے، و"بَلَغَ الرَّكبُ المَدِينَةَ" جب قافلہ شہر تک پہنچ جائے۔ اور اصطلاح میں بلاغت، کلام اور متکلم کی صفت واقع ہوتا ہے۔

بلاغتِ کلام، کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا ہے کلام کے فصیح ہونے کے ساتھ ساتھ، اور حال جسے مقام بھی کہا جاتا ہے وہ ایک ایسا امر ہے جو متکلم کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنی عبارت کو مخصوص صورت میں پیش کرے اور مقتضائے حال کو اعتبار مناسب بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی مخصوص صورت ہے جس کے مطابق عبارت کو لایا جائے، مثلاً مدح ایک حالت ہے جو عبارت کو اطناب کی صورت میں لانے کا تقاضہ کرتی ہے اور مخاطب کی ذکاوت بھی ایک حالت ہے، جو عبارت کو اختصار کی صورت میں لانے کا تقاضہ کرتی ہے، تو مدح اور ذکاوت میں سے ہر ایک حال ہے اور اطناب وایجاز میں سے ہر ایک مقتضائے حال ہے اور کلام کو ایجاز واطناب کی صورت میں پیش کرنا مقتضائے حال کی مطابقت ہے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفؒ نے بلاغت کی لغوی توضیح کی ہے کہ بلاغت کے لغوی معنی وصول اور انتہاء (پہنچنے) کے ہیں، پھر اسی معنی کو محاورے اور مثال سے واضح کیا ہے محاورے سے بایں طور کہ "بَلَغَ فُلانٌ مُرَادَہٗ" اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص مقصد تک پہنچ جائے، اسی طرح بَلَغَ الرَّکبُ المَدینۃَ اس وقت بولتے ہیں جب قافلہ شہر میں پہنچ جائے۔

اور اصطلاح میں یہ لفظ کلام اور متکلم کی صفت واقع ہوتا ہے، تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ علم بلاغت اس علم کا نام ہے جس کے قواعد ملحوظ رکھنے سے مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنے میں خطا واقع نہ ہو۔

فبلاغۃُ الکلام: یہاں سے مصنفین کلام بلیغ کی تعریف بیان فرمارہے ہیں کہ کلام بلیغ وہ فصیح کلام ہے جو مقتضائے حال کے مطابق ہو یعنی جیسا موقع ہو اسی کے مطابق گفتگو کی جائے، مثلاً اگر سامع خبر کے صدق وکذب سے خالی الذہن ہو تو ایسی جگہ مقتضائے حال کے مطابق وہ کلام ہوگا جس میں تاکید نہ ہو، اور اگر سامع خبر میں متردد ہو تو وہاں تاکید مناسب ہوگی اور اگر سامع خبر کا منکر ہے تو اس کے انکار ہی کے مطابق تاکید کا لانا مقتضائے حال کے مطابق ہوگا، مثلاً جو شخص زید کے آنے اور نہ آنے سے خالی الذہن ہو تو اس سے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ "جاء زیدٌ" زید آیا، اور اگر وہ متردد ہے تو مناسب ہے کہ کہے "قد جاء زیدٌ" بے شک زید آیا، اور اگر منکر ہو تو کہنا چاہئے، "واللّٰہ جاء زیدٌ" خدا کی قسم زید آیا۔

مذکورہ طریقے سے اگر کلام کیا جائے تو کلام بلیغ ہوگا ورنہ نہیں۔

وَالحالُ یسمّٰی بالمقام الخ: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ حال کا دوسرا نام مقام بھی ہے، بعد ازاں حال کی تعریف کی ہے کہ حال ایسا امر ہے جو متکلم کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنی عبارت کو ایک خاص انداز میں بیان کرے، پھر فرمایا کہ مقتضائے حال کا دوسرا نام اعتبار مناسب بھی ہے، پھر مقتضائے حال کی تعریف

کی ہے کہ ''مقتضائے حال وہ خاص ڈھانچہ اور مخصوص قالب ہے جس پر عبارت ڈھالی جائے'' اس کے بعد مثلاً المَدْحُ سے حال اور مقتضائے حال کی انتہائی لطیف پیرائے میں وضاحت کی ہے، جس سے مبتدی طالب علم بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ مثلاً ''مدح'' یعنی کسی کی تعریف کرنا ایک ایسی حالت ہے جو اس بات کو چاہتی ہے کہ عبارت ''اطناب'' کے سانچے میں ڈھالی جائے، یعنی کلام کو طویل کیا جائے اور ''ذکاوت'' بھی ایک حالت ہے جو تقاضہ کرتی ہے کہ کلام کو مختصر انداز میں پیش کیا جائے، تو معلوم ہوا کہ ''مدح'' ایک حال ہے جو اطناب کو چاہتا ہے اور اطناب مقتضائے حال ہے ایسے ہی ذکاوت ایک حال ہے اور ''ایجاز'' مقتضائے حال ہے اور کلام کا ''اطناب و ایجاز'' کے سانچے میں ڈھالنا ''مقتضائے حال'' کی مطابقت ہے۔

۲. ﴿ وَبلاَغةُ المُتكَلِّمِ ﴾ مَلَكَةٌ يَقْتَدِرُبها علَى التَّعبيرِ عِنِ المَقصُودِ بِكلامٍ بَليغٍ في أيِّ غرضٍ كان .

ويُعرفُ التَّنافُرُ بِالذَّوقِ ، ومُخالَفةُ القِياسِ بِالصَّرفِ ، وضُعفُ التَّأليفِ والتَّعقِيدُ اللَّفظِيُّ بالنَّحوِ ، والغَرابَةُ بِكَثرةِ الاطِّلاعِ علَى كلامِ العربِ ، والتَّعقيدُ المعنَوِيُّ بالبَيان ، والأحوالُ ومُقْتَضَياتُها بِالمَعانِي فَوَجَبَ عَلىٰ طَالِبِ البَلاَغةِ مَعْرِفَةُ اللُّغةِ وَالصَّرفِ والنَّحوِ وَالمَعانِي والبَيانِ مَعَ كونِهِ سَلِيمَ الذَّوقِ كثيرَ الاطِّلاعِ علىٰ كلامِ العربِ .

ترجمہ: بلاغت متکلم ایک ایسا ملکہ ہے جس کی وجہ سے متکلم کلام بلیغ میں مقصد کے بیان کرنے پر قادر ہو، جس غرض میں بھی وہ کلام ہو۔

تنافر حروف ذوق سلیم کے ذریعے، مخالفت قیاس علم صرف کے ذریعے، ضعف تالیف اور تعقید لفظی علم نحو کے ذریعے اور غرابت کلام عرب پر کافی معلومات کے ذریعہ، تعقید معنوی کو علم بیان کے ذریعے اور احوال اور مقتضیات احوال کو علم

معانی کے ذریعے جانا جاتا ہے، لہٰذا علم بلاغت کے طالب پر علم لغت، علم صرف، علم نحو و معانی اور علم بیان کا جاننا ضروری ہے، اس کے ساتھ کہ وہ خود ذوقِ سلیم کا حامل اور کلام عرب پر کافی واقفیت رکھتا ہو۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفینؒ نے سب سے پہلے متکلم بلیغ کی تعریف کی ہے کہ متکلم بلیغ ایسے شخص کو کہیں گے جس کے اندر ایسا ملکہ ہو جس کے ذریعہ اپنے مقصود کو کلام بلیغ میں ادا کر سکے، مطلب یہ ہے کہ انواع معانی میں سے جس نوع میں بھی متکلم چاہے کلام بلیغ میں اپنا مقصد بیان کرنے میں مکمل قادر ہو، معلوم ہوا کہ اگر صرف کسی خاص نوع میں ملکہ حاصل ہے تو پھر متکلم بلیغ نہیں کہلائے گا۔

اس کے بعد حضرات مصنفینؒ نے فصاحت و بلاغت میں لگے ہوئی قیودات کے بارے میں یہ بیان کیا ہے کہ انہیں کس طریقے سے جانا جا سکتا ہے؟ تو فرمایا کہ تنافر کو تو ذوق سلیم ہی کے ذریعے جانا جاتا ہے اس کے لیے کسی علم کی ضرورت نہیں اور مخالفت قیاس لغوی کو علم صرف سے جانا جاتا ہے، جب کہ ضعف تالیف اور تعقید لفظی کا پتہ علم نحو سے چلتا ہے اور غرابت کا علم، کلام عرب پر کثرت واقفیت سے ہوتا ہے اور تعقید معنوی کو علم بیان اور احوال اور مقتضیات احوال کو علم معانی کے ذریعہ جانا جاتا ہے، اسی لیے حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص علم بلاغت حاصل کرنا چاہے اسے مذکورہ علوم سے واقف ہونا ازحد ضروری ہے، نیز یہ کہ وہ ذوق سلیم کا بھی حامل ہو اور کلام عرب پر بھی اسے کافی واقفیت ہونی چاہئے۔

علم المعاني

هُوَ عِلمٌ يُعرَفُ بهِ أحوالُ اللَّفظِ العربِيِّ التي بِها يُطابِقُ مُقْتضَى الحالِ ؛ فتَخْتَلِفُ صُوَرُ الكَلامِ لاخْتِلافِ الأحوالِ ، مثَالُ ذٰلك قَولُهٗ تعالٰى : "وَاَنَّا لانَدْرِيْ اَشَرٌّ اُرِيدَ بِمَنْ فِي الأَرضِ أم أرادَ بِهِمْ ربُّهُمْ رَشَدًا" فإنَّ ماقَبْل "أمْ" صُورَةٌ مِنَ الكَلامِ تُخَالِفُ صُورةَ مَا بَعدَهَا ؛ لِأن الأولٰى فِيهَا فِعْلُ الإرادةِ مبْنِيٌّ لِلْمَجْهُولِ ، والثَّانية فِيهَا فِعلُ الإرادةمبنِيٌّ للمَعلُومِ ، والْحَالُ الدَّاعِيْ لِذٰلكَ نِسبَةُ الخَيرِ إليهِ سُبحانَهٗ وتعَالٰى فِي الثَّانيةِ ومنعُ نِسبةِ الشَّرِّ إليهِ في الأولٰى .

وَيَنْحصِرُ الكلامُ علٰى هٰذا العِلمِ في ثمانِيَةِ أبوابِ وخاتِمةِ

ترجمہ: علم معانی وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ لفظِ عربی کے ان احوال کو جانا جائے جن کے ذریعہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہوتا ہے، پس کلام کی صورتیں احوال کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوجاتی ہیں، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان "وأنا لاندري أشرٌّ اريد بمن الخ" ہے، اور ہم نہیں جانتے کہ آیا ان کے ساتھ زمین میں شر کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے پروردگار نے ان کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے، کیوں کہ "ام" کے ماقبل کلام کی صورت "أم" کے مابعد کلام کی صورت کے مخالف ہے، اس وجہ سے کہ پہلی صورت میں فعل ارادۃ مبنی للمجہول (فعل مجہول) ہے اور دوسری صورت میں فعل ارادۃ مبنی للمعروف (فعل معروف) ہے، اور وہ حالت جو اس اختلاف کی داعی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف خیر کی نسبت کرنا ہے دوسری صورت میں، اور پہلی صورت میں اس کی طرف شر کی نسبت

نہ کرنا ہے اور اس علم معانی میں کلام آٹھ ابواب اور ایک خاتمے میں منحصر ہے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفینؒ نے علم معانی کی تعریف اور اس کی تشریح کی ہے کہ علم معانی وہ علم ہے جس کے ذریعہ لفظ کے ان احوال کو جانا جائے جن کے ذریعہ کلام کو مقتضائے حال کے مطابق لایا جاتا ہے، لہٰذا جس جس طریقے سے احوال میں اختلاف پایا جائے گا اسی طرح کلام کی صورتوں میں بھی تبدیلی ہوتی رہے گی، مثلاً باری تعالیٰ کا قول و أنا لا ندري الخ اس آیت میں ''أم'' کے ماقبل کلام کی صورت میں ''أم'' کے مابعد کلام کی صورت سے مختلف ہے، بایں طور کہ پہلی صورت میں فعل مجہول کا استعمال کیا گیا ہے جب کہ دوسری صورت میں فعل معروف مستعمل ہے اور یہ اختلاف، احوال ہی کے اختلاف کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ پہلی صورت میں لفظ ''شر'' ہے جس کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف مناسب نہیں، تو گویا کہ پہلی صورت کی حالت کا تقاضہ یہ ہوا کہ فعل مجہول کا استعمال کیا جائے ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت لازم آئے گی جو مناسب نہیں ہے اور دوسری صورت میں لفظ ''رَشَدً'' ہے جس کے معنی ''خیر'' کے ہیں اور خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مناسب ہے، اس لیے وہاں فعل معروف استعمال کیا گیا، یہی مقتضائے حال کی مطابقت ہے، اس علم معانی میں کلام آٹھ ابواب اور ایک خاتمے پر منحصر ہے۔

البَابُ الأوّلُ في الخَبرِ والإنْشاءِ

كُلُّ كلامٍ فَهُوَ إمَّا خبَرٌ أو إنشاءٌ ، وَالخَبَرُ مايصِحُّ أن يُقالَ لِقائِلِه: إنَّهُ صادِقٌ فِيه أو كاذِبٌ كـ"سَافَرَ مُحَمَّدٌ" و "عَلِيٌّ مُقِيمٌ" والإنشاءُ ما لايصِحُّ أن يُقالَ لِقائِلِه ذٰلك كـ"سَافِرْ يَا مُحَمَّدُ" و "أَقِمْ يَا عَلِيُّ" وَالمُرادُ بِصِدقِ الخبَرِ مُطابَقَتُهُ للوَاقِعِ ، وبِكِذْبِه عدمُ مُطابقَتِه لهُ ، فَجُملَةُ "عليٌّ مُقيمٌ" إنْ كانَتِ النِّسْبَةُ المَفْهُومةُ مِنها مُطَابِقَةً لِمَا في الخَارِجِ فَصِدقٌ وإلّا فكِذْبٌ .

باب اول
خبر اور انشا کے بیان میں

ہر کلام یا تو خبر ہوگا یا انشا، خبر وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ وہ اس خبر میں صادق ہے یا کاذب، جیسے "سَافَرَ مُحَمَّدٌ" محمد نے سفر کیا ــ عَلِيٌّ مُقِيمٌ" علی مقیم ہے ــ انشاء وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کے بارے میں یہ نہ کہا جاسکے (اس کی خبر میں صدق وکذب کا احتمال نہ ہو) جیسے سَافِرْ یَا مُحَمَّدُ ــ اے محمد سفر کرو ــ "اَقِمْ یَا عَلِيُّ" اے علی تو مقیم رہ ــ اور صدقِ خبر سے مراد خبر کا واقع کے مطابق ہونا ہے، اور کذب خبر سے مراد خبر کا واقع کے مطابق نہ ہونا ہے، چناں چہ "علي مقيم" کا جملہ اگر اس سے سمجھی جانے والی نسبت خارج کے مطابق ہے تو صدق ہے ورنہ کذب۔

تشریح: ما قبل میں مصنفینؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ علم معانی میں آٹھ ابواب بیان کیے جائیں گے، یہاں سے پہلے باب کا آغاز کر رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ کلام کی دو قسمیں ہیں، خبر اور انشا، خبر کی تعریف حضرات مصنفینؒ نے یہ کی ہے کہ خبر وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کو یہ کہنا صحیح ہو کہ وہ اپنی خبر میں صادق ہے یا کاذب، مثلاً ''سافر محمدٌ وعليٌّ مقيمٌ'' محمد نے سفر کیا اور علی مقیم ہے۔یہ ایسی خبر ہے جس کے کہنے والے کو سچا یا جھوٹا کہا جا سکتا ہے۔

انشا وہ کلام ہے جس کے کہنے والے کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہ ہو کہ وہ اپنی خبر میں صادق ہے یا کاذب، مثلاً ''سافِرْ یامُحمَّد وأَقِمْ یاعليٌّ'' اے محمد سفر کر اور اور اے علی تو مقیم رہ۔یہ ایسی خبر ہے کہ جس کے کہنے والے کو سچا یا جھوٹا نہیں کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس خبر کا وقوع اور وجود ابھی ہوا ہی نہیں ہے، بل کہ مستقبل میں ہوگا اس لیے اس میں صدق و کذب کا احتمال ہی نہیں ہے۔

فجملة علي مقيم الخ: یہاں سے حضرات مصنفینؒ صدق و کذب کی مثال سے توضیح فرما رہے ہیں کہ صدق و کذب کا پتہ بایں طور چلے گا کہ ''علي مقيمٌ'' سے علی کے مقیم ہونے کی جو خبر دی جا رہی ہے اگر خارج کے مطابق ہو یعنی واقعتاً زید مقیم ہو تو صدق ہے، ورنہ یعنی اگر واقعتاً زید مقیم نہیں تو کذب ہے۔

وَلِكُلِّ جُملةٍ رُكنانِ: مَحكُومٌ علَيهِ ومَحكُومٌ بهٖ، ويُسمّٰى الأوّلُ مُسْنَدًا إليهِ كَالفَاعِلِ ونائِبِهٖ والمُبتدأ الّذِيْ لهٗ خبرٌ ويُسمّٰى الثّاني مُسندًا كَالفعلِ وَالمُبتدأ المُكتفٰى بمَرْفُوعِهٖ.

ترجمہ: اور ہر جملے کے دو رکن ہوتے ہیں محکوم علیہ اور محکوم بہ، پہلے (محکوم علیہ) کا نام مسند الیہ ہے، جیسے فاعل، نائب فاعل اور وہ مبتدا جس کی خبر ہو اور دوسرے (محکوم بہ) کا نام مسند ہے، جیسے فعل اور وہ مبتدا جو اپنے مرفوع پر اکتفا کیے ہوئے ہو۔

تشریح: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ ہر جملے میں دو رکن ہوتے ہیں ایک محکوم علیہ دوسرے محکوم بہ، محکوم علیہ کا دوسرا نام مسند الیہ ہے اس کے تحت فاعل نائب فاعل اور مبتدا کی قسم اول آتی ہے، یعنی وہ مبتدا جس کے لیے خبر ہو، جیسے "زیدٌ قائمٌ" اور دوسرے رکن یعنی مسند کا نام محکوم بہ ہے اس کے تحت فعل اور مبتدا کی قسم ثانی آتی ہے یعنی وہ صیغۂ صفت جو حرف نفی یا استفہام کے بعد واقع ہو اور اسم ظاہر کو رفع دے جیسے "ما قائم الزیدان و أقائم الزیدان" ان دونوں مثالوں میں صیغۂ صفت اپنے مابعد "الزیدان" کی طرف مسند ہے اور وہی صفت کا فاعل اور خبر کا قائم مقام ہے۔

مبتدا کی قسم ثانی کے لیے خبر تو نہیں ہوتی مگر جس طرح خبر مرفوع ہوتی ہے اسی طرح اس کے ساتھ ایک اسم ظاہر مرفوع ہوتا ہے، جو اس کو خبر سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

الكلامُ علَى الخبَرِ

الخَبَرُ إمَّا أن يكُونَ جُملةً فِعليَّةً أو اِسمِيَّةً ، فالأولى موضُوعَةٌ لإفَادةِ الحُدُوثِ في زَمَنٍ مخصُوصٍ مَعَ الاختِصارِ ، وقَد تُفيدُ الإستِمرَارَ التَّجدُّدِيَّ ، بِالقَرائِنِ إذا كان الفِعلُ مُضارِعًا كقَولِ طرِيف ؎

أوَ كُلَّمَا وردَتْ عُكاظَ قَبيلَةٌ
بَعَثُوا إلَيَّ عرِيفَهُمْ يَتَوَسَّمُ

جملہ خبریہ کا بیان

خبر یا تو جملہ فعلیہ ہوگا یا جملہ اسمیہ، پس جملہ فعلیہ تو اختصار کے ساتھ زمانۂ مخصوص میں حدوثِ فعل کا فائدہ پہنچانے کے لیے وضع کیا گیا ہے اور کبھی کبھی قرائن کے ذریعے استمرار تجددی کا بھی فائدہ دیتا ہے جب کہ خبر فعل مضارع ہو، جیسے کہ شاعر طریف کا قول أو کلما الخ۔

کیا جب جب بازار عکاظ میں کوئی قبیلہ اترتا ہے تو وہ اپنے نمائندے کو میرے پاس بھیجتے ہیں، جو مجھے بار بار دیکھتا ہے اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

تشریح: جملہ خبریہ کی تعریف کے بعد اس کے اقسام بیان کرتے ہیں کہ جملہ خبریہ کی دو قسمیں ہیں، (۱) جملہ فعلیہ (۲) جملہ اسمیہ، پھر جملہ فعلیہ کے لانے کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جملہ فعلیہ لانے کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ خبر کو اختصار کے ساتھ تینوں زمانوں میں سے کسی ایک زمانے کے ساتھ مقید کر دیا جائے، اختصار کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کو بتلانے کے لیے اس

میں کوئی قرینہ نہ ہو، مثلاً ”زید قائم الآن أو أمس أو غدًا“ اس مثال میں بھی زمانہ مخصوص پر دلالت ہو رہی ہے مگر وہ دلالت ہیئت کے ساتھ نہیں بل کہ ”الآن، أمس، غدا“ کے قرینے کی وجہ سے ہے، برخلاف فعل کے کہ وہ اپنی ہیئت مخصوصہ کے ذریعہ ہی ان تینوں زمانوں میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے کسی قرینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اور اگر خبر جملہ فعلیہ میں سے فعل مضارع ہو تو استمرار تجددی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، استمرار تجددی کا مطلب ہے بار بار کسی فعل کا واقع ہونا، مگر اس کے لیے قرینے کی ضرورت ہے مثلاً شاعر طریف کا قول ؎

أو كُلَّمَا وردتْ عكاظَ قَبيلةٌ
بعثُوا إليّ عريفَهُمْ يتوسّم

لغات: وَرَدَ يَرِدُ وُرُوْدًا (ض) آنا، پہنچنا، عکاظ، نخلہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جہاں عربوں کا سالانہ بڑا میلہ لگتا تھا، عرب شعراء اور مقررین جمع ہوتے، اشعار پڑھے جاتے، تقریریں ہوتیں، مفاخر بیان کیے جاتے، پرانے جھگڑوں کا فیصلہ ہوتا تھا، (علم اور تانیث معنوی کی وجہ سے غیر منصرف ہے) قبیلةٌ (جمع) قبائل، قبیلہ بَعَثَ يَبْعَثُ بَعْثًا (ف) بھیجنا، عريفٌ (جمع) عرفاء، قوم کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے والا، توسّمَ يتوسّمُ توسُّمًا (تفعل) فراست سے پہچان لینا۔

ترکیب: ہمزہ برائے استفہام، واو کے بارے میں دو قول ہے، ایک یہ کہ واو عاطفہ ہے اور ہمزہ سے پہلے ہے مگر استفہام چوں کہ صدارت کلام چاہتا ہے اس لیے اسے مقدم کر دیا، دوسرا قول یہ ہے کہ واو عاطفہ ہی ہے مگر معطوف علیہ ہمزہ سے پہلے نہیں بل کہ بعد ہی میں ہے، (پہلا قول جمہور کا ہے اور دوسرا جار اللہ زمخشری کا) کلّما شرط، وردت فعل، عکاظ مفعول فیہ مقدم، قبیلةٌ فاعل، جملہ فعلیہ شرط

بعثوا فعل بافاعل، الیٰ متعلق بعثوا کے، عریفھُم مفعول بہ، یتوسّم عریف سے حال واقع ہے۔

شعر مذکور میں لفظ یتوسّم ہی محل استشہاد ہے جو کہ جملہ فعلیہ ہے، خبر واقع ہے، فعل مضارع ہے، زمانے اور تجدد یعنی فعل کے بار بار ہونے پر استمراری طور سے دلالت کر رہا ہے جیسا کہ ترجمے سے ظاہر ہے اور قرینہ کلّما ہے۔

وَالثَّانيةُ مَوضُوعَةٌ لمُجرَّدِ ثُبُوتِ المُسنَدِ للمُسندِ إليهِ نحوُ "الشَّمسُ مُضِيئةٌ" وقَدْ تُفِيدُ الإستِمْرَارَ بِالقَرائِنِ إذا لَمْ يكُنْ في خبرِهَا فِعْلٌ ، نحوُ "العِلمُ نافِعٌ" والأصل في الخبَرِ أن يُلقٰى لإفادةِ المُخَاطَبِ الحُكمَ الَّذِي تضَمَّنَتْهُ الجُملةُ كَمَا في قَولِنا "حضَرَ الأميْرُ" أو لإفادةِ أنَّ المَتكلِّمَ عالمٌ بهِ ، نحو "أنتَ حضَرْتَ أمسِ" ويسمّٰى الحُكمُ فائدَةَ الخَبَرِ وكَونُ المتكلِّمِ عالمًا بهٖ لازِمَ فائدةِ الخبَرِ .

ترجمہ: اور دوسری قسم (جملہ اسمیہ) کو محض مسند الیہ کے لیے مسند کے ثابت ہونے کو بتانے کے لیے وضع کیا گیا ہے، جیسے "الشمس مضیئةٌ" (سورج روشن ہے) اور کبھی قرائن کے ذریعے استمرار کا فائدہ دیتا ہے بشرطے کہ اس کی خبر میں فعل نہ ہو، جیسے "العلم نافع" علم نفع بخش ہے۔ اور خبر میں اصل یہ ہے کہ مخاطب کو اس حکم کا فائدہ پہنچایا جائے جس کو جملہ شامل ہے، جیسا کہ ہمارے قول "حضر الأمیر" (حاکم آ گئے) میں، یا یہ بتلانے کے لیے کہ متکلم بھی اس حکم کو جاننے والا ہے، جیسے "أنت حضرت أمس" (تم کل آ گئے) اور حکم کا نام فائدۂ خبر اور متکلم کے اس حکم کو جاننے کا نام لازم فائدۂ خبر ہے۔

تشریح: مصنفینؒ یہاں سے جملے کے دوسری قسم کی وضاحت فرما رہے ہیں کہ جملہ اسمیہ کو کن مقاصد کے تحت لایا جاتا ہے، (۱) محض یہ بتلانے کے لیے کہ مسند مسند الیہ کے لیے ثابت ہے، جیسے الشمس مضیئة سورج روشن ہے۔

مثال مذکور میں محض یہ بتلانا مقصود ہے کہ روشنی سورج کے لیے ثابت ہے
(۲) کبھی کبھی استمرار خبر کو بتلانے کے لیے جملہ اسمیہ لاتے ہیں بشرطے کہ کوئی قرینہ ہو اور اس کی خبر میں فعل نہ ہو، جیسے ''العلم نافع'' علم نافع ہے۔ مثال مذکور میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ علم ہمیشہ نافع ہے یعنی استمراری طور سے خبر ثابت ہے اور قرینہ اسم فاعل کا مطلق ہونا ہے یعنی ''الآن، أمس، غدًا'' وغیرہ کی قید سے خالی ہونا، اس لیے کہ اگر اسم فاعل مذکورہ الفاظ میں سے کسی کے ساتھ بھی مقید ہو جائے تو ایک زمانے کے ساتھ مخصوص ہو جائے گا اور مطلق ہونے کی صورت تمام زمانوں کو عام رہتا ہے، اور خبر میں فعل کی شرط نہ لگانا اس وجہ سے ہے کہ اگر جملہ اسمیہ کی خبر میں فعل ہوگا تو چوں کہ فعل حدوث اور تجدد پر دلالت کرتا ہے اس لیے ثبوت علیٰ وجہ الاستمرار کا فائدہ نہیں حاصل ہوگا۔

والأصل في الخبر: خبر کو اصل دو مقصد کے تحت لایا جاتا ہے (۱) مخاطب کو جملے کا حکم بتلانے کے لیے، جیسے ''حضر الأمیر'' اس خبر کے ذریعہ مخاطب کو امیر کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور نہ آنے کے بارے میں مخاطب کی جہالت کو دور کیا گیا ہے، (۲) یہ بتلانے کے لیے کہ متکلم کو بھی وہ حکم معلوم ہے، جیسے ''أنت حضرت أمس'' تم تو کل ہی آ گئے، مخاطب کے آنے کی اطلاع دینا مقصود نہیں اس لیے کہ مخاطب کو تو اپنے آنے کا علم ہے ہی، بل کہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ مجھے بھی تمہاری آمد کی اطلاع ہے، پہلے کا نام ''فائدۂ خبر'' اور دوسرے کا نام ''لازمِ فائدۂ خبر'' ہے۔

وَقَدْ يُلقى الخَبَرُ لأغراض أخرىٰ .

١ ـ كالاستِرْحامِ فِي قَولِ مُوسىٰ علَيهِ السَّلام ''ربِّ إنِّيْ لِمَا أنزلتَ إليَّ مِنْ خيْرٍ فقِيرٌ''

٢ ـ وإظهَار الضُّعفِ فِي قَولِ زَكَرِيَّا علَيهِ السَّلامُ ''ربِّ إنِّي وهَنَ العَظْمُ

مِنّي واشْتَعَلَ الرَّأسُ شيبًا"
٣ـ وإظْهَار التَّحسُّرِ في قَوْلِ امْرَأةِ عِمْرانَ "رَبِّ إنِّي وضَعْتُهَا أُنْثٰى"
٤ ـ وإظْهارِ الفَرَحِ بِمُقْبِلٍ والشَّماتَةِ بِمُدْبِرٍ في قَوْلِكَ "جَاءَ الحقُّ وزَهَقَ البَاطِلُ"
٥ ـ وإظْهارِ السُّرُورِ في قَولِكَ "أَخَذْتُ جَائزَةَ التقدُّمِ" لِمَنْ يَعلَمُ ذٰلكَ .
٦ ـ والتَّوبيخِ في قولِكَ للعاثِرِ "الشَّمسُ طالِعةٌ"

ترجمہ: اور کبھی خبر دوسرے مقاصد کے لیے لائی جاتی ہے۔

(۱) جیسے طلب رحمت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول رَبِّ إنِّی وَهَنَ الْعَظْمُ الخ میں، اے میرے پروردگار میں اس بھلائی کا محتاج ہوں جو تو مجھ پر نازل فرمائے۔

(۲) ناتوانی اور ضعف کے اظہار کے لیے حضرت زکریا علیہ السلام کے قول "ربِّ إنِّی الخ" میں، اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔

(۳) حسرت وافسوس کے اظہار کے لیے حضرت عمران کی بیوی کے قول "ربِّ إنِّی وضعتهَا الخ" میں، اے میرے پروردگار میں نے اسے لڑکی جنی۔

(۴) مسرت کے اظہار کے لیے آنے والی چیز سے اور کسی ناپسندیدہ چیز کے جانے پر خوشی کے اظہار کے لیے تمہارے قول جاء الحق وزهق الباطل میں (حق آ گیا اور باطل مٹ گیا)

(۵) مسرت کے اظہار کے لیے تمہارے قول اخذت جائزة التقدم میں (میں نے ترقی کا انعام حاصل کرلیا) اس شخص سے کہنا جسے یہ معلوم ہو۔

(۶) زجر وتوبیخ کے لیے تمہارے قول ٹھوکر کھانے والے سے "الشمس طالعة" میں (سورج نکلا ہوا ہے)

تشریح: ماقبل میں حضرات مصنفینؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ خبر کو اصلاً دو ہی مقصد کے لیے لاتے ہیں، مگر کبھی ان دو کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی لے آتے ہیں، انہیں دیگر مقاصد کو عبارت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے، من جملہ انہیں مقاصد میں۔

پہلا مقصد: استرحام یعنی رحمت طلب کرنا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول "ربِّ إنِّی لما أنزلت إلیّ من خیرٍ فقیرٌ" میں، اس قول سے نہ تو فائدۂ خبر مراد لے سکتے ہیں کیوں کہ اس قول کا مخاطب باری تعالیٰ ہے جو ظاہر و باطن دونوں کو جانتا ہے اس لیے اسے کوئی خبر دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی لازم فائدۂ خبر مراد لے سکتے ہیں، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ بھی مقصد نہیں ہے کہ میں بھی خبر کو جانتا ہوں کیوں کہ اس صورت میں ایک لایعنی اور عبث کام ہو جائے گا، بل کہ یہ کلام رحم و کرم طلب کے لیے لایا گیا ہے جیسا کہ ترجمے سے ظاہر ہے۔

دوسرا مقصد: اظہار ضعف ہے ناتوانی اور کمزوری ظاہر کرنا، مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام کا قول کہ "اے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں" یہ بھی اصلی دونوں معنوں پر محمول نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اللہ رب العزت جب ساری باتوں کو جانتا ہے تو اسے خبر دینے کا کوئی سوال ہی نہیں اور نہ ہی لازم فائدۂ خبر مراد لے سکتے ہیں کہ اس خبر کو میں بھی جانتا ہوں بل کہ اس میں عاجزی اور کمزوری کا بیان ہے۔

تیسرا مقصد: حزن وغم کا اظہار ہے یعنی حسرت وافسوس ظاہر کرنے کے لیے لایا جاتا ہے، مثلاً امرۃ عمران کا قول "ربِّ إنِّی وضعتُها انثیٰ" اس قول میں اپنی نذر کے پوری نہ ہونے پر حزن وغم کا اظہار کیا ہے، کیوں کہ انہوں نے بیٹا پیدا ہونے کی نذر مانی تھی مگر بیٹی پیدا ہوئی۔ (یعنی حضرت مریم علیہا السلام)

چوتھا مقصد: کسی آنے والی چیز پر خوشی کا اظہار کرنا ہے، یعنی جب کوئی اچھی بات پیش آئے تو خوشی ہو اور کسی چیز کے مٹ جانے اور ختم ہو جانے پر مسرت کا اظہار کرنا ہے جب وہ چیز چلی جائے، مثلاً جاء الحق و زهق الباطل میں اسلام کی آمد پر مسرت اور شرک کے مٹنے اور ختم ہونے پر خوشی کا اظہار ہے۔

پانچواں مقصد: اپنی خوشی کے اظہار کے لیے خبر دینا، مثلاً وہ شخص جس کو تمہارے بارے میں انعام حاصل کرنے کا علم ہو اس سے کہنا "أخذت جائزة التّقدم" میں نے ترقی کا انعام حاصل کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلام کا مقصد محض اپنی خوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

چھٹا مقصد: زجر و توبیخ کے لیے خبر لانا، مثلاً کسی ٹھوکر کھانے والے سے کہا جائے "الشمس طالعة" (سورج نکلا ہوا ہے) تو اس قول سے نہ تو خبر دینا مقصود ہے اور نہ ہی اپنے بارے میں طلوع شمس کے متعلق بتلانا مقصود ہے، بل کہ ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ مقصود ہے، کہ سورج کی روشنی ہوتے ہوئے بھی ٹھوکر کھا رہے ہو۔

أضربُ الخبَر

حَيْثُ كانَ قصْدُ المُخبرِ بخَبَرِهٖ إفادَةَ المُخَاطَبِ يَنبَغِي اَنْ يَقْتَصِرَ مِنَ الكَلامِ علٰى قَدْرِ الحَاجةِ حذَرًا مِنَ اللَّغوِ ، فإن كانَ المُخاطبُ خَالِيَ الذِّهنِ مِنَ الحُكمِ أُلقِيَ إلَيهِ الخبَرُ مجرَّداً عنِ التَّاكيدِ نحوُ "أخُوكَ قادمٌ" وإنْ كانَ مُترَدِّداً فِيه طالبًا لِمَعرفَتِهٖ حَسُنَ تَأكِيدُهُ، نَحْوُ "إنَّ أخاكَ قادِمٌ" وإنْ كانَ مُنكِرًا وَجَبَ توكِيدُهُ بِمُؤكِّدٍ أو بِمُؤكِّدينَ أو أكثرَ حسَبَ درجَةِ الإنكارِ، نحوُ "إنَّ أخاكَ قادِمٌ" أو "إنَّهُ لَقَادِمٌ" أو "وَاللّٰهِ إنَّهُ لَقَادِمٌ" فَالخَبَرُ بِالنِّسبَةِ لِخُلُوِّهٖ مِنَ التَّوكيدِ واشْتِمالِهٖ عَلَيهِ ثلاثَةُ أضرُبٍ كما

رأيتَ ، وَيُسَمَّى الضَّربُ الأوَّلُ ابتِدائِيًا وَالثَّانِي طَلَبِيًا وَالثَّالِثُ إنكَارِيًّا . ويكونُ التَّوكيدُ بإنَّ أوأنَّ أولامِ الإبتِداءِ أوأحرُفِ التَّنبيهِ أوالقَسَمِ أونُونَي التَّوكِيْدِ أوالحُرُوفِ الزَّائِدةِ أوالتَّكريرِ وقد أوإمَّا الشَّرطيةُ .

خبر کے اقسام

جہاں مخبر کا مقصد اپنی خبر کے ذریعے مخاطب کو فائدہ پہنچانا ہو تو مناسب ہے کہ کلام کو ضرورت کے مطابق مختصر کیا جائے لغو سے بچنے کے لیے، لہٰذا اگر مخاطب حکم سے بالکل خالی الذہن ہو تو اس کے سامنے خبر کو تاکید سے خالی پیش کیا جائے گا، جیسے أخوكَ قادمٌ (تیرا بھائی آیا ہے) اور اگر خبر میں تردد کرنے والا ہو، اس کی معرفت کا طالب ہو تو اس کی تاکید بہتر ہے، جیسے "إنّ أخاك قادمٌ" اور اگر مخاطب خبر کا منکر ہو تو خبر کی تاکید لانا واجب ہے ایک موکد سے یا دو یا اس سے زیادہ کے ذریعہ درجۂ انکار کے مطابق، جیسے إنَّ أخاكَ قادمٌ (بے شک تیرا بھائی آیا ہے) یا "إنّه لقادمٌ" (بے شک وہ ضرور آیا ہے) یا "واللّٰه إنّه لقادمٌ" (بخدا بے شک وہ ضرور آیا ہے) پس خبر کی تاکید سے خالی ہونے اور اس پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں (جیسا کہ تم نے گزشتہ مثالوں میں دیکھا) پہلی قسم کا نام ابتدائی ہے دوسری کا طلبی اور تیسری قسم کا نام انکاری ہے اور تاکید اِنّ، اَنّ، لام ابتداء، حروف تنبیہ، قسم، تاکید کے دونوں نون (ثقیلہ، خفیفہ) حروف زائدہ، تکرار، قد، اور امّا شرطیہ کے ذریعے ہوتی ہے۔

تشریح: ماقبل میں یہ بیان گزر چکا ہے کہ خبر کے لانے کی اصلاً دو غرضیں ہوتی ہیں (۱) فائدۂ خبر (۲) لازمِ فائدہ خبر، عبارت بالا میں مصنفینؒ نے قسم اول (فائدۂ خبر) کی تین قسمیں بیان کی ہیں اور ان اقسام کو بیان کرنے سے پہلے ایک ضابطہ بیان کیا ہے کہ مخبر کو چاہئے کہ اپنے کلام میں بقدر ضرورت ہی الفاظ استعمال

کرے، کیوں کہ اگر ضرورت سے زیادہ کلام ہوگا تو لغو اور عبث ہو جائے گا، رہا یہ کہ ضرورت کا اندازہ کیسے ہو تو اس کے لیے مخاطب کے حال پر نظر کیا جائے گا لہٰذا اگر مخاطب حکم سے خالی الذہن ہو یعنی وہ خبر سے ناواقف ہو اور اس کو اس میں کچھ تردد نہ ہو تو اس صورت میں کلام میں کسی طرح کا کوئی تاکیدی لفظ نہیں لایا جائے گا، مثلاً کوئی شخص اپنے بھائی کے آنے نہ آنے سے خالی الذہن اور ناواقف ہے تو اس سے صرف اتنا کہا جائے گا "أخوك قادمٌ" ۔ تمہارا بھائی آیا ہے۔ اس کلام کا نام ابتدائی ہے، مخاطب کی دوسری حالت یہ ہے کہ اسے حکم میں تردد اور شک ہو تو اس صورت میں حکم کو تاکید سے موکد کرنا مستحسن ہے، جیسے کسی شخص کو اپنے بھائی کے آنے کے بارے میں شک ہے تو اس سے کہا جائے گا "إنّ أخاك قادمٌ" "یقیناً تمہارا بھائی آیا ہے" ایسے کلام کا نام طلبی ہے۔

مخاطب کی تیسری حالت یہ ہے کہ وہ حکم کا منکر ہو تو اس صورت میں حکم کو منکر کے انکار کے مطابق مزید تاکید کے ساتھ مؤکد کرنا واجب ہے، لہٰذا اگر کم درجے کا انکار ہے تو ایک تاکید لائی جائے گی اور یوں کہا جائے گا "إنّ أخاك قادمٌ" ۔ بلاشبہ تمہارا بھائی آیا ہے۔ اس مثال میں صرف "إنّ" تاکید کے لیے ہے اور اگر انکار زیادہ درجے کا ہے تو دو تاکید لاکر کہا جائے گا "إنّهٗ لقادمٌ" اس مثال میں "إنّ" اور "ل" دو تاکید ہے، اور اگر انکار اس سے بھی بڑھ کر ہے تو پھر تین تاکید لائی جائے گی، اور کہا جائے گا "واللّٰه إنّه لقادمٌ" اس تیسری مثال میں "واللّٰه" بڑھا کر ایک اور تاکید پیدا کر دی، مذکورہ مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ اگر انکار کم ہے تو ایک تاکید صرف إنّ کے ذریعے لائی گئی اور دوسری صورت میں إنّ کے ساتھ دوسری تاکید "لام تاکید" کو بھی لایا گیا اور انکار اس سے زیادہ بڑھنے کی صورت میں مذکورہ دونوں تاکید کے ساتھ واللّٰه قسم کا بھی اضافہ کیا گیا، اس تیسری قسم کا نام انکاری ہے، گویا کہ اب مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ:

کلام ابتدائی یہ ہے کہ حکم میں مخاطب کے خالی الذہن ہونے کی وجہ سے کلام میں کوئی تاکید نہ ہو۔

کلام طلبی یہ ہے کہ مخاطب حکم میں متردد ہو اس وجہ سے کلام میں بطور استحسان تاکید لائی جائے۔

کلام انکاری یہ ہے کہ مخاطب حکم سے انکار کرے اس وجہ سے کلام میں بطور وجوب تاکید لائی جائے، جیسا زوردار یا کمزور درجے کا انکار ہو ویسی ہی تاکید بھی ہو۔

ویکون التوکید: سے مصنفینؒ نے یہ بتلایا ہے کہ تاکید کن الفاظ سے ہوتی ہے۔

الكلامُ علَى الإنشاءِ

الإنْشَاءُ إمّا طَلَبِيٌّ أو غير طلبيٍّ ، فَالطَّلَبِيُّ مَا يسْتدْعِي مَطْلُوبًا غيْرَ حَاصِلٍ وقْتَ الطَّلبِ ، وغَيرُ الطَّلَبِيِّ مَاليسَ كذٰلكَ

وَالأوَّلُ يَكونُ بِخَمْسَةِ أشياءَ (١)الأمرِ (٢)والنَّهيِ (٣)والِاستفهامِ (٤)والتَّمنِّيْ (٥)والنِّداءِ .

١ . ﴿أمّا الأمرُ﴾ فَهُوَ طلَبُ الفِعْلِ على وَجْهِ الإستعْلاءِ، ولهُ أربَعُ صِيَغٍ : فِعْلُ الامرِ، نحوُ "خُذِ الكِتابَ بِقُوَّةٍ" والمُضارِعُ المقرُونُ بِاللّامِ، نحوُ "لِيُنْفِقْ ذُوْ سعةٍ مِنْ سعَتِهٖ" واسْمُ فِعْلِ الأمرِ ،نحوُ "حيَّ على الفَلاحِ" والمصْدرُ النَّائبُ عَنْ فِعْلِ الأمرِ، نحوُ "سعيًا في الخَيرِ" وقَدْ تَخْرُجُ صِيَغُ الأمرِ عنْ معنَاهَا الأصلِيِّ إلىٰ مَعَانٍ أخَرَ تُفهَمُ مِن سِياقِ الكلامِ وقَرائنِ الأحوالِ .

☆☆☆

کلام انشائی کی بحث

انشاء یا تو طلبی ہوگی یا غیر طلبی (انشاء کی یہی دو قسمیں ہیں) تو انشاء طلبی وہ کلام ہے جو ایسے مطلوب کا تقاضہ کرے جو طلب کے وقت حاصل نہ ہو اور انشاء غیر طلبی وہ کلام ہے جو اس طرح نہ ہو۔

انشاء طلبی پانچ چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، امر، نہی، استفہام، تمنی، ندا۔

بہر حال امر تو وہ فعل کا طلب کرنا ہے بڑائی کے طور پر، اور اس کے چار صیغے ہیں، فعل امر جیسے خذ الکتاب بقوّةٍ (کتاب مضبوطی سے پکڑ لے) اور وہ فعل مضارع جس میں لام لگا ہوا ہو، جیسے لیُنفق ذو سعة من سعته (وسعت والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے) اور اسم فعل بمعنی امر جیسے "حيّ على الفلاح" (آؤ کامیابی کی طرف) اور وہ مصدر جو فعل امر کے قائم مقام ہو، جیسے "سعيًا في الخير" (بھلائی کے کام میں کوشش کرو) اور کبھی امر کے صیغے اپنے اصلی معنی کو چھوڑ کر دوسرے معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن کو سیاق کلام اور قرائن احوال سے سمجھا جاتا ہے۔

تشریح: خبر کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد یہاں سے حضرات مصنفینؒ انشاء کا بیان فرما رہے ہیں، کہ انشاء کی دو قسمیں ہیں، انشاء طلبی انشاء غیر طلبی

انشاء طلبی وہ کلام ہے جس کے ذریعہ متکلم ایسے مطلوب کو چاہے جو طلب کرنے کے وقت حاصل نہ ہو۔

انشاء غیر طلبی وہ کلام ہے جس میں کسی ایسے مطلوب کو نہ چاہا جائے جو بوقت طلب حاصل نہ ہو، انشاء طلبی کی پانچ قسمیں ہیں: امر، نہی، استفہام، تمنی اور ندا۔

امر، فعل کے علی وجہ الاستعلاء طلب کرنے کو کہتے ہیں، استعلاء کا مطلب یہ ہے کہ متکلم اپنے آپ کو مخاطب سے عالی رتبہ اور بڑا سمجھے خواہ وہ حقیقۃً عالی رتبہ ہو یا

نہ ہو، امر کے صیغے چار قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) فعل امر جیسے "خذ الكتاب بقوة" کتاب مضبوطی سے پکڑ لے۔

(۲) وہ فعل مضارع جس میں لام امر لگا ہوا ہو، جیسے "لينفق ذو سعة من سعته" چاہئے کہ صاحب وسعت اپنی وسعت کے بقدر خرچ کرے۔

(۳) اسم فعل بمعنی امر جیسے حيَّ علَى الفلاح کامیابی کی طرف آؤ۔ اس میں حيَّ اسم فعل ہے امر کے معنی میں۔

(۴) وہ مصدر جو فعل امر کا قائم مقام ہو، جیسے "سعيًا في الخير" بھلائی کے کام میں کوشش کرو، اصل عبارت "اسعَوْا سعيًا في الخيرِ" ہے، فعل امر کو حذف کر کے مصدر کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔

وقد تخرج صيغ الأمر: امر کا اصلی معنی تو وہی ہے یعنی مخاطب سے کوئی فعل طلب کرنا اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے، مگر کبھی امر کے صیغے اپنا اصلی معنی چھوڑ کر دوسرے معانی میں استعمال ہوتے ہیں، جن کا پتہ سیاق کلام اور قرائن احوال سے چلتا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

١ ـ كالدُّعاءِ نحوُ "ربِّ أوزِعْنِي أن أشْكُرَ نِعْمتَكَ"

٢ ـ والالتِماسِ كقَولِكَ لِمَنْ يُساوِيْكَ "أعْطِنِي الكِتابَ"

٣ ـ والتَّمنِّي نحوُ ـ

أَلا أيُّها اللَّيلُ الطَّويْلُ ألا انْجلِيْ
بِصُبْحٍ ومَا الإصْباحُ مِنْكَ بأمثَلِ

٤ ـ والإرشادِ نحوُ "إذا تدايَنْتُم بِدَينٍ الى اَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ولْيَكْتُبْ بينَكُمْ كاتِبٌ بِالعَدلِ"

٥ ـ والتَّهدِيدِ نحوُ "اعْمَلُوْا مَاشِئتُمْ"

٦ ـ والتَّعجِيزِ نحوُ ـ

يا لَبَكرٍ أنشِرُوْا لِيْ كُلَيبًا
يا لَبَكرٍ أيْنَ أيْنَ الفِرارُ

۷۔ والإهانَةِ نحوُ "كُونُوا حِجَارَةً أوْ حَدِيدًا"
۸۔ والإباحةِ نحوُ "كُلُوْا واشْرَبُوْا"
۹۔ والامْتِنَان نحوُ "كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ"
۱۰۔ والتَّخْيِيْرِ نحوُ "خُذْ هٰذا أو ذاكَ"
۱۱۔ والتَّسْوِيَةِ نحوُ "اصْبِرُوْا أو لاتَصْبِرُوْا"
۱۲۔ والإكرامِ نحوُ "اُدْخُلُوهَا بِسَلامٍ آمِنِينَ"

ترجمہ: (۱) جیسے دعا کے لیے استعمال ہونا، مثلاً "ربِّ أوزِعْنِيْ أن أشْكُرَ نِعْمَتَكَ" (اے میرے پروردگار مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری نعمت کا شکر ادا کروں)

(۲) التماس کے لیے، جیسے تمہارا اپنے برابر والے آدمی سے کہنا "أعْطِنِي الكتَابَ" (مجھے کتاب دے)

(۳) تمنی کے معنی میں جیسے "ألا أيُّهَا اللَّيلُ" الخ ۔
اے ہجر کی شب دراز! تو صبح بن کر روشن ہوجا، (یعنی اے کاش تیری درازی ختم ہوجائے) لیکن افسوس (اے رات) صبح بھی تجھ سے افضل نہیں ہی۔

(۴) بھلائی اور رہنمائی کے لیے جیسے "إذَا تداينْتُمْ" الخ جب تم لین دین کا معاملہ کرو کسی متعین مدت تک، تو تم اس کو لکھ لیا کرو اور چاہئے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے لکھ دے۔

(۵) دھمکانے کے لیے، جیسے "اعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ" جو تمہارا جی چاہے کرو

(۶) تعجیز (عاجز کرنے کے معنی میں) جیسے یَا لبکرٍ انشروا الخ
اے بنو بکر! تم میرے لیے کلیب کو زندہ کرو اے بنو بکر! اب کہاں کہاں

بھاگنا ہے۔

(۷) توہین کے لیے، جیسے "کُونُوْا حِجَارَةً أو حَدِيدًا" پتھر یا لوہا بن جاؤ

(۸) اباحت کے لیے، جیسے "كُلُوْا واشْرَبُوْا" کھاؤ اور پیو (مباح ہے)

(۹) احسان جتانے کے لیے، جیسے "كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ" اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی روزی میں سے کھاؤ۔

(۱۰) اختیار دینے کے لیے، جیسے "خُذْ هذا أو ذَاكَ" اسے لے لو یا اسے۔

(۱۱) برابری اور مساوات کے لیے، جیسے "اصْبِرُوْا أو لاتَصْبِرُوْا" خواہ صبر کرو یا نہ کرو۔

(۱۲) تعظیم کے لیے، جیسے "اُدْخُلُوْهَا بِسَلامٍ آمِنِيْنَ" اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں ان معانی کو بیان کیا گیا ہے جن میں امر اپنے معنیٔ اصلی کو چھوڑ کر استعمال ہوتا ہے، انہیں معانی میں سے ایک معنی دعا ہے، جیسے "رَبِّ أوزِعْنِي الخ" آیت کریمہ میں "أوزِع" صیغۂ امر ہے، مگر اس سے امر کا معنیٔ حقیقی مراد نہیں بل کہ دعا کے معنی میں ہے، اس لیے کہ اس کے قائل حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں اور ایک نبی کبھی بھی اپنے کو خدا کے بالمقابل بڑا نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا طلبِ فعل تو ہے مگر علی وجہ الاستعلا نہیں، آیت کریمہ میں نعمتوں کے شکر کی توفیق مانگی گئی ہے۔

(۲) التماس یعنی ایسے شخص سے کسی بات کی درخواست کرنا جو درجے اور مرتبے میں برابر ہو، جیسے "أعطني الكتاب" مثال مذکور میں "أعط" امر ہے التماس کے معنی میں، حقیقۃً امر کے معنی پر محمول اس لیے نہیں کر سکتے کہ أعطني کا مخاطب متکلم کا ہم عمر ہے اور جب کوئی شخص اپنے ہم عمر سے کوئی کام طلب کرے تو اسے التماس کہتے ہیں۔

(۳) تمنی یعنی کسی چیز کی امید اور آرزو کے لیے امر کا استعمال کرنا، جیسے امرئ القیس کا یہ شعر: ؎

ألا أيها اللّيل الطويل الا انجلي
بصبحٍ وما الإصباحُ منك بأمثلِ

لغات: ليلٌ (جمع) ليالي رات، طَالَ يطُولُ طُولاً (ن) لمبا ہونا، انجلی انجلاءًا (انفعال) روشن ہونا۔ وأمثل، مَثُلَ يمْثُلُ مثالةً (ک) افضل ہونا۔

ترکیب: الا حرف تنبیہ، أيها الليل الطويل، ندا بامنادیٰ جملہ ندائیہ، ألا ثانی برائے تاکید، انجلي فعل بافاعل، بصبح متعلق بہ "انجلي" جملہ انشائیہ شدہ جواب ندا، واو مستانفہ، ما مشابہ بہ لیس، الإصباح اسم، منك "أمثل" سے متعلق اور "أمثل" لیس کی خبر ہے، "انجلي" میں ی برائے اشباع ہے، اور اگر تانیث کے لیے مانیں گے جیسا کہ بعض کی رائے ہے تو پھر دوسرے مصرع میں "منكِ" پڑھیں گے۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "أنجلي" ہے، شاعر شبِ فراق کی درازی سے پریشان ہوکر بے ہوشی کے عالم میں رات (غیر ذی عقل) سے خطاب کر رہا ہے، کہ اے کاش تیری درازی ختم ہو جائے پھر ہوش میں آکر کہتا ہے کہ اے رات! صبح بھی تجھ سے بہتر نہیں کیوں کہ دن میں پھر اسی مصیبت فراقِ یار سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہ واضح رہے کہ تمنی میں جس چیز کو طلب کیا جاتا ہے اس امر مطلوب کو حاصل کرنے پر متمنی کا قادر ہونا ضروری نہیں، کیوں کہ تمنا تو ممتنع الحصول شے کی بھی صحیح ہے جیسے مثالِ مذکور میں رات کو مخاطب بنا کر اس سے روشنی طلب کرنا، صرف اپنے تمنا اور آرزو کا اظہار ہے اس پر متمنی کو قدرت نہیں ہے۔

(۴) ارشاد یعنی بھلائی اور رہنمائی حاصل کرنے کے معنی میں استعمال کرنا، جیسے مثال مذکور "فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ الخ" میں یہ حکم ہے کہ آپسی معاملات کا لکھ لینا باعثِ بھلائی اور بہتر ہے، یہ حکم وجوبی نہیں ہے ورنہ بغیر کتابت واشہاد کے ادھار لین دین کا معاملہ صحیح نہ ہوتا۔

(۵) تہدید یعنی دھمکی دینا، جیسے "اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ" جو چاہو کرو۔ یہ مطلب نہیں کہ اختیار ہے، یا یہ کہ جو بھی طبیعت تقاضہ کرے اس کا کرنا واجب ہے، بل کہ اس میں ناراضگی کے ساتھ زجر وتوبیخ ہے، اور اس کا قرینہ آیت کا اگلا ٹکڑا "اِنَّهٗ بِمَا تعمَلُوْنَ بَصِيْرٌ" اور "لَايَخفون علينَا" ہے۔

(۶) تعجیز، عاجز کر دینا، یعنی جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں کام وہ کر سکتا ہے یا یہ کہ وہ کام اس کے بس میں ہے ایسے شخص کی عاجزی اور مجبوری دکھانا مقصود ہوتا ہے، جیسے "فَاتُوْا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" اس جیسی ایک ہی صورت لے آؤ۔ یعنی تم اتنے عاجز ہو کہ ایک صورت بھی بنا کر نہیں لا سکتے ہو، یا جیسے شاعر کا شعر۔

یَا لبکرٍ أنشرُوا لي كليبًا   یَا لبكرٍ أين أين الفرار

لغات: بکرٌ ایک قبیلے کا نام ہے، نشرَ ینشرُ نشرًا ونُشورًا (ن) پھیلانا، زندہ کرنا، کلیب، قبیلے کا نام ہے، فرَّ یفِرُّ فِرارًا (ض) بھاگنا۔

ترکیب: یالبکر، ندا بامنادیٰ جملہ ندائیہ، انشروا فعل بافاعل، لي جار بامجرور متعلق بہ انشروا، کلیبا مفعول، فعل بافاعل ومفعول جملہ انشائیہ شدہ جواب ندا، أين اول موکد، دوسرا این برائے تاکید، مؤکد با تاکید خبر مقدم، الفرار مبتدا مؤخر، واضح رہے کہ "لبکر" میں لام برائے استغاثہ ہے، اسی لیے "بکر" مجرور ہے۔

شعر مذکور میں محل استشہاد لفظ "أنشروا" ہے، جو تعجیز کا معنی دے رہا ہے، یعنی تم زندہ کر ہی نہیں سکتے امر کا حقیقی معنی مراد نہیں ہو سکتا کیوں کہ شاعر بھی

جانتا ہے کہ بنوکلیب کیا اللہ کے علاوہ پوری دنیا کے لوگ مل کر بھی اگر کسی مردے کوزندہ کرنا چاہیں تونہیں کر سکتے۔

(۷) اہانت یعنی تذلیل وتحقیر کے لیے استعمال کرنا، جیسے مثال مذکور ''کُونُوْا حِجَارَۃً أو حَدِیْدًا'' میں پتھر اور لوہا بن جاؤ۔ یہ کہہ کر تذلیل مقصود ہے، حقیقی معنی مرادنہیں لیا جاسکتا کیوں کہ ارشاد باری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفار حقیقتاً پتھر اور لوہا بن جائیں۔

(۸) اباحت یعنی کسی کام کے کرنے کی اجازت دینا خواہ زبان قال سے ہو یا زبان حال سے، مثلاً ''کُلُوْا واشْرَبُوْا'' کھاؤ پیو، یعنی کھانے پینے کی اجازت ہے۔

(۹) امتنان یعنی کسی پر احسان جتلانا، جیسے ''کُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمْ اللّٰہ'' اللہ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ، آیت کریمہ میں ''کلوا'' اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے، اس لیے کہ ''مما رزقکم اللّٰہ'' کا قرینہ یہ بتلا رہا ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور احسان اور منت کے ہیں

(۱۰) تخییر کسی کام میں اختیار دینا، تخییر اور اباحت میں فرق یہ ہے کہ اختیار میں دی ہوئی دونوں چیزوں کو اکٹھا اور سب ایک ساتھ کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اباحت میں دونوں کو اکٹھا اور ایک ساتھ کرنا جائز ہے، جیسے ''خُذْ هٰذَا أو ذَاكَ'' میں، صرف ایک چیز کا لینا صحیح ہے دونوں کا ایک ساتھ لینا صحیح نہیں ہے، ''خذ'' اپنے حقیقی معنی میں اس لیے نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کلمہ أو لگا ہوا ہے، جو تخییر کے لیے آتا ہے۔

(۱۱) تسویہ، دونوں چیزوں کے درمیان برابری اور مساوات ہونا، جیسے ''إصْبِرُوْا أو لاتَصْبِرُوْا'' مطلب یہ ہے کہ صبر اور عدم صبر دونوں برابر ہے، یہاں ''اصْبِرُوْا'' اپنے حقیقی معنی میں اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بعد ''لاتصبِرُوْا''

ہے جس میں صبر نہ کرنے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں نیز اسی آیت میں ''سواءٌ علیکم'' کا لفظ بھی تسویہ پر دلالت کررہا ہے۔

(۱۲) اکرام یعنی تعظیم کرنا، جیسے ''ادخلوها بسلام آمنين'' میں، سلامتی اور امن وامان کے ساتھ دخول تعظیم واکرام کے لیے ہے، اور ''آمنين'' اس کا قرینہ ہے۔

٢. ﴿ وَأمَّا النَّهيُ ﴾ فهُوَ طلَبُ الكَفِّ عنِ الفِعْلِ علىٰ وجهِ الاستعلاءِ ، ولهُ صِيغَةٌ واحدةٌ ، وهِيَ المُضَارعُ معَ لا النَّاهِيَةِ كَقَوْلِهٖ تعالىٰ ''ولاتُفْسِدُوْا فِيْ الاَرْضِ بعدَ إصْلاحِهَا''

وقَدْ تخرُجَ صِيغَتُهٗ عنْ معناهَا الأصْلِيِّ إلىٰ معانٍ أخَرَ تُفهَمُ مِنَ المَقامِ والسِّياقِ .

١ . كالدُّعاءِ نحوُ ''لاتُشْمِتْ بِيَ الأعدَاءَ''

٢ . والالتماسِ كقَولِكَ لِمَنْ يُساوِيكَ ''لاتبرَحِ المَكانَ حتّٰى ارجِعَ إلَيكَ''

٣ . والتَّمَنّي نحو ''لَا تَطْلُعْ'' في قوله ؎

يَالَيْلُ طُلْ يانومُ زُلْ　　　ياصُبْحُ قِفْ لاتَطْلُعْ

٤ . والتَّهدِيدِ كقَولِكَ لِخَادِمِكَ ''لاتُطِعْ أمْرِيْ''

ترجمہ: بہرحال ''نہی'' تو وہ فعل کے روکنے کو طلب کرنا ہے بڑائی کے طریقے پر اور اس کا صرف ایک صیغہ ہے اور وہ فعل مضارع ہے لاء نہی کے ساتھ، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''لاتُفْسِدُوْا فِي الاَرضِ بعدَ إصْلاحِهَا'' اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو۔ کبھی نہی کا صیغہ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جو مقام اور سیاق کلام سے سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) مثلاً دعا، جیسے ''لاتُشْمِتْ بِیَ الاَعْدَاءَ'' اے اللہ! میری تکلیف پر

دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دے۔

(۲) التماس، جیسے تمہارا اپنے برابر والے سے کہنا "لاتبرحِ المکانَ حتّٰی ارجعَ إلیكَ اس جگہ سے مت ہٹنا جب تک کہ میں تیرے پاس لوٹ کر نہ آؤں

(۳) تمنی، جیسے "لاتطلع" شاعر کے شعر میں ؎

یَالَیلُ طُلْ یانومُ زُلْ   یا صُبحُ قِفْ لاتطلُعْ

اے رات لمبی ہو جا، اے نیند دور ہو جا اے صبح ٹھہر جا، ابھی مت روشن ہو۔

(۴) تہدید جیسے تمہارا اپنے خادم سے کہنا "لاتطع أمري" اچھا میری بات نہ مان۔

تشریح: عبارت بالا میں نہی کی تعریف کی گئی ہے، اس کے اصلی صیغے کو بیان کیا گیا ہے، نیز ان معانی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن میں صیغۂ نہی کو استعمال کیا جاتا ہے۔

نہی، استعلاء کے طور پر ترک فعل کے طلب کرنے کو کہتے ہیں، اس کا صرف ایک صیغہ ہے، مگر یہ صیغے کی حیثیت سے قسم واحد ہے، اگرچہ اس کے تحت اشخاص کثیرہ ہیں، جیسے "لاتفسدُوا في الأرضِ بعدَ إصلاحِهَا" آیت کریمہ میں "لاتفسدوا" فعل نہی ہے جو صیغے کے اعتبار سے نہی کی قسم ہے مگر اس کے مخاطب بہت سے افراد ہیں، برخلاف "لاتُفسِدْ" کے کہ یہ بھی نہی کی ایک قسم ہے مگر اس کے تحت فرد واحد ہے۔

یوں تو فعل نہی کا اصل معنی ترک فعل کا طلب کرنا ہے مگر کبھی کبھی اس اصلی معنی کو چھوڑ کر دیگر معانی میں استعمال ہوتا ہے، جن کا پتہ مقام اور سیاق کلام سے چلتا ہے، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) دعا کے لیے استعمال ہونا، جیسے "لاتُشمِتْ بیَ الأعْداءَ" محل استشہاد "لاتُشمِتْ" صیغہ نہی ہے جو اپنے اصلی معنی "ترک فعل" کے علاوہ

دعا کے معنی میں مستعمل ہے، اس لیے کہ یہ قول "لاتشمت بی الاعداء" حضرت ہارون علیہ السلام کا ہے اور خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے، اور ظاہر ہے کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رتبے میں چھوٹے ہیں، اور چھوٹے کی بات بڑے سے درخواست اور دعا ہی ہوگی کہ آپ اس طرح کا معاملہ کرکے مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مت دیجیے، اس کلام میں چوں کہ استعلاء نہیں پایا گیا اس لیے حقیقی معنی پر محمول نہیں کریں گے۔

(۲) التماس کے معنی میں، جیسے اپنے برابر والے شخص سے کہنا "لاتَبرَحِ المَکَان" یہاں "لاتبرح" التماس کے معنی میں مستعمل ہے، کیوں کہ یہ جملہ اپنے برابر شخص سے کہا جارہا ہے اور برابر والے شخص کو حکم نہیں دیا جاتا ہے بل کہ اس سے التماس کی جاتی ہے۔

(۳) تمنی کے معنی میں، جیسے شاعر کا شعر ؎

یَا لیلُ طُلْ یَانَوْمُ زُلْ
یَا صُبْحُ قِفْ لَا تَطْلُعْ

لغات: طُلْ صیغہ امر ہے، طَالَ یطُولُ طُولاً (ن) لمبا ہونا، نامَ ینامُ نومًا (س) سونا، وقَفَ یقِفُ وقُوفًا (ض) ٹھہرنا رکنا، طَلَعَ یطْلُعُ طُلُوعًا (ن) نمودار ہونا، ظاہر ہونا۔

ترکیب: یا حرف ندا قائم مقام "أدعوا" فعل کے "لیلُ" منادی مفعول بہ، "طُلْ" جواب ندا، ندا با جواب ندا جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا، یہی ترکیب "یا نوم زل" اور "یا صبح قف" کی بھی ہے "لاتطلع" فعل نہی جملہ انشائیہ ہے۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "لاتطلع" ہے جو اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں، اس لیے کہ صیغۂ مذکور سے خطاب صبح کو ہے اور صبح غیر ذی عقل ہے اس میں قبولیت خطاب کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور صبح کا روشن نہ ہونا ہی شاعر کی شئ محبوب ہے

جسکے حصول کی امید نہیں اس لیے صیغۂ نہی یہاں صرف تمنا اور آرزو کے لیے ہے۔

(۴) تہدید یعنی دھمکانے کے معنی میں، جیسے اپنے خادم سے کہنا "لاتطع أمري" میری بات نہ مان، مطلب یہ ہے کہ اس کا انجام تمہیں بھگتنا پڑے گا، گویا خادم کو یہ کہہ کر دھمکی دے رہا ہے۔

۳. ﴿ وَأمَّا الاستِفْهَامُ ﴾ فهُوَ طلبُ العِلمِ بِشَيءٍ، وأدوَاتُهُ: الهَمْزَةُ، وهَلْ، ومَا، ومَنْ، ومتٰى، وأيَّانَ، وكَيفَ، وأينَ، وأنّٰى، وكَمْ، وأيُّ

١. فَالهَمْزَةُ: لِطَلَبِ التَّصوُّرِ أو التَّصديقِ، فالتَّصوُّرُ هُوَ إدراكُ المُفْرَدِ كقَولِكَ "أعَلِيٌّ مُسافِرٌ أم خالدٌ" تعتَقدُ أنَّ السَّفرَ حصَلَ مِنْ أحَدِهِمَا ولكن تطلُبُ تعيِينَهُ ولِذَا يُجابُ بِالتَّعيينِ، فيُقالُ: عليٌّ، مثلاً، وَالتَّصديقُ هُوَ إدراكُ النِّسبَةِ نحوُ "أسَافَرَ عَلِيٌّ" تَستَفْهِمُ عنْ حُصُولِ السَّفرِ وعَدَمِهِ ولِذَا يُجابُ بِنعَمْ أو لاَ.

والمسئُولُ عنهُ في التَّصوُّرِ مايلِيَ الهمزَةَ ويكونُ لهُ معادِلٌ يذْكرُ بعدَ أم وتُسمّٰى مُتَّصِلةً؛ فتَقُولُ في الإستفهامِ عنِ المُسنَدِ إلَيهِ، "أ أنْتَ فعَلْتَ هذا أم يُوسُفُ؟" وعنِ المُسنَدِ "أراغِبٌ أنتَ عنِ الأمرِ أم راغِبٌ فيه؟".

ترجمہ: بہرحال استفہام تو وہ کسی شے کا علم طلب کرنا ہے اور اس کے ادوات (حروف) همزه، هل، ما، من، متى، كيف، اين، أنّى، كم اور أيّ ہیں۔

(۱) تو ہمزہ تصور یا تصدیق کے طلب کرنے کے لیے آتا ہے، تصور وہ مفرد کو حاصل کرنا ہے جیسا کہ تمہارا قول "أعَليّ مسافرٌ أم خالدٌ" کیا علی سفر پر گیا ہے یا خالد؟ تمہیں یقین ہے کہ سفر ان دونوں میں سے کسی ایک نے کیا ہے، لیکن اس کی تعیین چاہتے ہو، اسی وجہ سے تعیین کے ساتھ جواب دیا جائے گا، پس

کہا جائے گا "عليٌ" مثال کے طور پر۔

اور تصدیق تو وہ نسبت کا معلوم کرنا ہے، جیسے "أسافر علي" کیا علی سفر پر گیا ہے؟ تم حصولِ سفر اور عدمِ حصولِ سفر کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہو، اسی وجہ سے "نعم" یا "لا" کے ساتھ جواب دیا جائے گا اور مسئول عنہ (جس کے متعلق دریافت کیا جائے) تصور میں وہ لفظ ہوتا ہے جو ہمزہ سے متصل ہو اور اس کا کوئی معادل بھی ہوتا ہے جس کو "أم" کے بعد ذکر کیا جاتا ہے اور اس "أم" کو متصلہ کہتے ہیں، لہٰذا تم مسند الیہ کے متعلق استفہام میں کہو گے "أ أنت فعلت أم يوسف" کیا تم نے یہ کیا ہے یا یوسف نے؟ اور مسند کے متعلق دریافت کرنے کے وقت کہو گے "أراغبٌ أنتَ عنِ الأمرِ أم راغبٌ فيه؟" کیا تمہیں اس امر سے اعراض ہے یا اس میں دلچسپی ہے؟

تشریح: عبارتِ مذکورہ میں استفہام کی تعریف بیان کرنے کے بعد ادوات استفہام کو بیان کیا گیا ہے، نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حروف استفہام میں سے ہمزہ کن کن معانی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا کیا طریقہ ہے؟ چناں چہ فرمایا کہ استفہام کسی نامعلوم شے کا علم، طلب کرنے کو کہتے ہیں اور حروف استفہام: همزة، هل، ما، من، متی، ایّان، کیف، این، کم اور أيٍّ ہیں۔

فالهمزة: ہمزہ کبھی تصور کے طلب کے لیے آتا ہے اور کبھی تصدیق کی طلب کے لیے، تصور مفرد کے جاننے کو کہتے ہیں، جیسے "أعَلِيٌّ مسافِرٌ أم خالدٌ" کیا علی مسافر ہے یا خالد۔ یہ سوال اس وقت کیا جائے گا جب یہ یقینی طور سے معلوم ہو کہ سفر کا وجود ہوا ہے ان دونوں میں سے کسی ایک سے، البتہ متعین طریقے سے یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے، اسی لیے اس صورت میں جواب صرف ایک کو متعین کر کے دیا جائے گا، مثلاً "علی" کہہ دیا جائے، تاکہ تعیین ہو جائے۔

اس جواب سے آپ کو "علي" کی شکل میں ایک مفرد کا حصول ہوا اور

ادراکِ مفرد ہی کا نام تصور ہے، اور تصدیق جملہ خبریہ کی نسبت کے جاننے کا نام ہے جیسے "أسَافَرَ علِيٌّ" اس مثال میں سفر کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں سوال کیا جارہا ہے، اسی بنیاد پر یہاں جواب "نعم" یا "لا" کے ذریعے دیا جائے گا، تاکہ نسبت معلوم ہوجائے خواہ بحیثیت ایجاب کے یا سلب کے۔

والمسئول عنه مايلي الهمزة : یہاں سے ایک ضابطہ بیان کیا جارہا ہے، کہ "تصور" میں جو لفظ ہمزہ سے متصل ہوگا وہی مسئول عنہ واقع ہوگا اور وہیں ام متصلہ کے بعد اس کا ایک معادل بھی ذکر کیا جاتا ہے، اس ضابطے کے بعد اب یہ سمجھیں کہ اگر مسند الیہ کے متعلق سوال کرنا ہو تو کہا جائے گا "أ أنت فعلتَ هذا أم يوسف" یعنی ہمزہ کے بعد متصلاً مسند الیہ کو ذکر کیا جائے گا، اور اگر مسند کے متعلق سوال کرنا ہو تو یوں کہا جائے گا "أراغب أنت عن الأمر أم راغب فيه" یعنی اس صورت میں ہمزہ کے بعد فوراً مسند کو ذکر کیا جائے گا، چناں چہ پہلی مثال "أنت" مسند الیہ ہے اور دوسری مثال میں "راغبٌ" مسند ہے اور دونوں ہمزہ سے متصل ہیں۔

وعنِ المفعُول "إيَّايَ تقصِد أم خالدًا" وعنِ الحَالِ "أراكباً جئتَ أم ماشياً" وعنِ الظَّرفِ "أيومَ الخميسِ قدمتَ أم يومَ الجُمُعةِ" وهٰكذا .

وقَد لايُذكَرُ المُعادلُ نحوُ "أ أنتَ فعلتَ هٰذا" أراغِبٌ أنتَ عنِ الأمرِ" ، "أ إيَّايَ تقصِدُ" ، "أراكبًا جئتَ" أيومَ الخَميسِ قدِمتَ"

والمسئُولُ عنهُ في التَّصدِيقِ النِّسبةُ وَلايَكُونُ لَها مُعادِلٌ ، فإنْ جاءَتْ "أم" بعدَها قُدِّرتْ مُنقَطِعةً وتكونُ بمعنٰى "بَل" .

ترجمہ: اور (ہمزۂ استفہام کے ذریعہ) مفعول کے متعلق سوال کرنے کے وقت کہو گے "إيَّايَ تقصِدُ ام خالِدًا" کیا میرے پاس تمہارا آنے کا ارادہ ہے یا خالد کے پاس؟ اور حال کے متعلق کہو گے "أراكبا جِئتَ أم

ماشیًا'' کیا تم سوار ہوکر آئے یا پیادہ پا، اور ظرف کے متعلق سوال کرتے وقت کہو گے ''أیومَ الخمیسِ قدِمتَ أم یومَ الجُمُعةِ'' کیا تم جمعرات کو آئے یا جمعہ کو؟ اور اسی طریقے سے اور کبھی کبھی معادل کا تذکرہ نہیں کیا جاتا ہے، جیسے ''أنتَ فعلتَ هٰذا'' کیا یہ کام تم نے کیا ہے؟ ''أراغبٌ أنتَ عنِ الأمرِ'' کیا تمہیں اس امر سے دلچسپی نہیں؟ ''أ إيَّايَ تقصِدُ'' کیا تمہارا میرے پاس آنے کا ارادہ ہے؟ ''أراكبًا جِئتَ'' کیا تم سوار ہوکر آئے؟ ''أ یومَ الخَمیسِ قدِمتَ'' کیا پنج شنبہ کو تم آئے

اور مسئول عنہ تصدیق میں نسبت ہوا کرتی ہے اور اس کا کوئی معادل نہیں ہوا کرتا ہے، لہٰذا اگر اس کے بعد ''أم'' آئے تو اسے منقطعہ مانا جائے گا اور وہ بل کے معنی میں ہوگا۔

تشریح: جس طریقے سے ہمزۂ استفہام سے مسندالیہ اور مسند کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، اسی طریقے سے مفعول، حال اور ظرف کے متعلق بھی سوال کیا جاتا ہے، ترجمہ میں ہر ایک مثال مع ترجمے کے مذکور ہے، مثلاً ''أ إيَّايَ تقصد أم خالدًا'' یہ سوال اس وقت کیا جائے گا جب تمہیں یہ معلوم ہو کہ تمہارے اور خالد میں سے کسی ایک کے پاس میرے آنے کا ارادہ ہے، لیکن متعین طور پر یہ معلوم نہیں کہ تم دونوں میں سے کون ہے، لہٰذا یہاں یہ سوال مفعول کی تعیین کے لیے ہوگا، اسی طرح حال میں ''أراكبًا جِئتَ أم ماشِیاً'' یہ سوال اس وقت ہوگا جب کہ شک آنے کی حالت اور کیفیت میں ہو کہ آنا سواری پر ہوا ہے یا پیدل البتہ اتنی بات تو یقینی ہے کہ فعل (آنے) کا وقوع ہوا ہے تو گویا اس سوال سے مقصد صرف تعیین حال ہے، اسی طرح ظرف کے متعلق سوال ''أ یومَ الخمِیس قدِمتَ أم یومَ الجُمُعةِ'' میں بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ آنے کا وقوع ہوا ہے مگر یہ متعین طریقے سے معلوم نہیں کہ وہ کون سا دن ہے تو گویا یہاں سوال کا مقصد دن یعنی ظرف کی

تعیین ہے۔

وقد لا یذکر المعادل: ماقبل میں بتلایا تھا کہ تصور میں ہمزہ سے متصل والا لفظ مسئول عنہ ہوگا اور اس کا ایک معادل بھی ذکر کیا جائے گا، یہاں فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی معادل کا تذکرہ نہیں کیا جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بالکلیہ اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا، بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملے میں لفظاً مذکور نہیں ہوتا، لیکن تقدیراً اس کا اعتبار ہوتا ہے، پس مسند الیہ کے متعلق سوال میں معادل کے حذف کے ساتھ کہا جائے گا "أأنت فعلتَ هٰذا" یہاں پر "أنت فعلتَ" کا معادل "أم غيرُكَ" محذوف ہے، وقس علٰی هٰذا البواقي.

والمسئول عنه في التصديق النسبة: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ جس طریقے سے تصور میں مسئول عنہ مفرد ہوتا ہے، اسی طریقے سے تصدیق میں مسئول عنہ نسبت ہوتی ہے اور تصدیق میں کوئی معادل نہیں ہوا کرتا ہے، لہٰذا اگر اس نسبت کے بعد "أم" واقع بھی ہو تو وہ ام متصلہ نہیں بل کہ منقطعہ ہوگا جو "بل" کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی اس وقت یہ ام معادلہ کے معنی کے بجائے کلام سابق سے اعراض کے معنی میں ہوگا۔

(٢) وهَل: لِطلَبِ التَّصديقِ فقطْ نحوُ "هل جاءَ صديقُكَ" والجوابُ نعمْ أو لاَ. ولِذا يمتنِعُ معها ذِكرُ المُعادلِ فلايُقالُ "هل جاءَ صديقُكَ أم عدُوُّكَ" وهل تُسمَّى بسيطةً إن استُفهِمَ بها عن وُجودِ شيئٍ فِي نفسِه نحوُ "هلِ العَنقَاءُ موجُودةٌ" ومُركَّبةٌ إن استُفهِمَ بِها عن وُجُودِ شيئٍ لشيئٍ نحوُ "هل تبِيضُ العَنقَاءُ أو تفْرَخُ"

ترجمہ: اور هل صرف تصدیق کے طلب کرنے کے لیے آتا ہے، جیسے "هل جاء صديقك" (کیا تیرا دوست آیا) اور جواب "نعم" یا "لا" کی صورت میں آئے گا، اسی لیے اس کے ساتھ معادل کا ذکر کرنا ممنوع ہے، لہٰذا نہیں

کہا جائے گا "هل جاء صديقك أم عدوك" (کیا تمہارا دوست آیا ہے یا تمہارا دشمن) اور اس "هل" کو بسیطہ کہیں گے، اگر اس کے ذریعے فی نفسہ کسی چیز کے وجود کا سوال کیا جائے جیسے "هلِ العَنقاءُ مَوجُودةٌ" (کیا عنقاء موجود ہے؟) اور مرکبہ کہیں گے اگر اس کے ذریعے کسی شے کے لیے کسی شے کے وجود کا سوال کیا جائے، جیسے "هل تبيض العنقاء أوتفرخ؟" (کیا عنقاء انڈے دیتا ہے یا بچے جنتا ہے؟)

تشریح: یہاں سے مصنفینؒ هل کے معنی کی تفصیل بتا رہے ہیں کہ "هل" صرف تصدیق کے طلب کرنے کے لیے آتا ہے، تصور میں اس کا استعمال نہیں ہوتا، اسی بنیاد پر اس کے ساتھ کسی معادل کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مثلاً "هل جاء صديقك" (کیا تمہارا دوست آ گیا) یہاں دیکھیے "هل" کے ذریعہ تصدیق کو طلب کیا جا رہا ہے، اور "هل جاء صديقك أم عدوك" کہنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں ام کے بعد "عدوك" ذکر کر دیا گیا ہے، جو کہ مفرد ہے اور یہ دلیل ہے اس بات پر کہ "أم" متصلہ ہے، جب کہ ام متصلہ کا تذکرہ تصدیق میں ممنوع ہے۔ آگے مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ "هل" کی دو قسمیں ہیں: هل بسیطہ، هل مرکبہ۔

"هل بسيطه" وہ هل ہے جس کے ذریعے کسی چیز کے وجود کو طلب کیا جائے، جیسے "هل العنقاء موجودة" (کیا عنقاء موجود ہے؟) مثال مذکور میں صرف عنقاء کے وجود کو دریافت کیا گیا ہے۔

"هل مركبه" وہ هل ہے جس کے ذریعے ایک چیز کے وجود کا سوال کیا جائے دوسری چیز کے لیے، جیسے "هل تبيض العنقاء أو تفرخ" کیا عنقاء انڈے یا بچے دیتا ہے؟ اس مثال میں "انڈے" اور "بچے" کے وجود کے بارے میں سائل سوال کر کے تناسل کے دو طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ کو متعین کرنا

چاہتا ہے کہ وہ کون سا طریقہ ہے۔

معلوم ہوا کہ "هل مركبه" میں دوسری چیز کا بھی لحاظ ہوتا ہے جب کہ "هل بسيطه" میں دوسری چیز کا اعتبار ملحوظ نہیں ہوتا ہے۔

(٣) ومَا : يُطلَبُ بِها شَرْحُ الاسْمِ نحوُ "ماالعسْجدُ" أو اللُّجينُ؟" أو حَقِيْقَةُ المُسَمّٰى نَحْوُ "مَا الإنْسَانُ" أو حالُ المذكورِ معَها كقولِكَ لِقادِمٍ عَلَيْكَ "ما أنت"

(٤) ومَنْ: يُطلَبُ بها تعيينُ العُقَلاءِ كقَولِكَ "مَنْ فتحَ مصرَ".

(٥) ومتٰى: يُطْلَبُ بِهَا تَعْيِيْنُ الزَّمَانِ ماضِيًا كانَ أو مُسْتَقبِلًا نحوُ "متٰى جِئتَ ومتٰى تذهبُ".

(٦) وأيَّان: يُطلبُ بها تَعْيِيْنُ الزَّمانِ المُستقبَلِ خاصَّةً وتكُونُ فِي مَوْضِعِ التَّهويلِ كقَولِه تعالٰى "يسألُ أيَّانَ يومُ القِيامة"

(٧) وَكَيْفَ: يُطلبُ بها تَعْيِيْنُ الحالِ نَحْوُ "كيفَ أنتَ"

(٨) وأينَ: يُطْلَبُ بِهَا تَعْيِيْنُ المَكَانِ نَحْوُ "أين تذهبُ"

(٩) وأنّٰى: تَكُونُ بِمَعْنٰى كَيْفَ نَحْوُ "أنّٰى يُحيِيْ هٰذهِ اللّٰهُ بعدَ موتِها"

ترجمہ: اور "ما" اس کے ذریعہ اسم کی وضاحت مطلوب ہوتی ہے، جیسے "مَا العَسجدُ؟" (عسجد کیا چیز ہے؟) یا "ما اللُّجينُ؟" (لجین کیا چیز ہے؟) یا مسمّٰی کی حقیقت مطلوب ہوتی ہے، جیسے "ماالإنسان؟" (انسان کی حقیقت کیا ہے؟) یا ما کے ذریعے اس کے ساتھ ذکر کی جانے والی چیز کا حال دریافت کیا جاتا ہے، جیسے تمہارے پاس آنے والے شخص سے تمہارا کہنا "ما أنت" (تمہارا کیا حال ہے؟)

"مَنْ" کے ذریعہ عقلاء کی تعیین مطلوب ہوتی، جیسے "مَنْ فتحَ مِصرَ؟"

(مصر کس نے فتح کیا؟) متی کے ذریعہ زمانے کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، خواہ ماضی ہو یا مستقبل جیسے "متیٰ جِئتَ؟" (تم کب آئے؟) "متیٰ تذهَبُ؟" (تم کب جاؤ گے؟)

"أيَّانَ" کے ذریعہ خاص طور سے زمانۂ مستقبل کی تعیین مطلوب ہوتی ہے اور یہ خوفناک مقام میں ہوتا ہے، جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد "یسأل أيّان یوم القیامة" (وہ پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟)

"کیفَ" کے ذریعے حال کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، جیسے "کیفَ أنتَ" (تم کس حالت میں ہو؟)

"أینَ" سے جگہ کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، جیسے "أین تذهب" (تم کہاں جا رہے ہو؟)

"أنّیٰ" کیف کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے "أنّیٰ یُحیِي هٰذِهِ اللّٰهُ بعدَ مَوتِها" (اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے زندہ کریں گے)

تشریح: عبارت مذکورہ میں "ما" اور دیگر حروف استفہام کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کون کس معنی میں مستعمل ہوتا ہے، چناں چہ فرماتے ہیں کہ "ما" کے ذریعے کسی اسم کی وضاحت طلب کی جاتی ہے، مثلاً ایک شخص کو "عسجد" اور "لجین" کے معنی نہیں معلوم ہیں تو لفظ "ما" سے ان کے معنی کی تشریح اور مفہوم معلوم کرے گا، کہ لغت اور اصطلاح میں کس معنی اور مفہوم کے لیے ان کو وضع کیا گیا ہے، لہٰذا جواب میں ایسا لفظ ذکر کیا جائے گا جو اس سے زیادہ مشہور ہو، مثلاً کہا جائے گا: "العسجدُ هُوَ الذَّهبُ" (عسجد سونے کو کہتے ہیں) "واللّجینُ هُوَ الفِضَّةُ" (لجین چاندی کو کہتے ہیں) یا "ما" کے ذریعے مسمّیٰ کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، جیسے "ما الإنسانُ" (انسان کی حقیقت کیا ہے؟) لہٰذا اس کے جواب میں "حیوانٌ ناطقٌ" کہا جائے گا، کیوں کہ یہی انسان کی حقیقت ہے،

یا ما کے ساتھ ذکر کی جانے والی چیز کی کیفیت وحالت معلوم کی جاتی ہے، جیسے کہ تمہارے پاس آنے والے شخص سے تمہارا یہ پوچھنا "ما أنت" (تم کیسے ہو؟) یہ ما کیف کے معنی میں ہے۔

ومَنْ يُطلَبُ بها لفظ "منْ" کے ذریعہ ذوی العقول کی تعیین مقصود ہوتی ہے یعنی اس کا استعمال صرف ذوی العقول ہی میں ہوگا، غیر ذوی العقول کی تعیین میں اس کا استعمال صحیح نہیں ہے، جیسے "مَنْ فتح مصر" (مصر کس نے فتح کیا؟) تو جواب میں ذوی العقول ہی میں سے کسی فرد کو ذکر کیا جائے گا، مثلاً "عمرو بن عاص" کہا جائے گا۔

ومَتٰى يُطلبُ بِها الخ: لفظ "متٰی" کے ذریعے زمانے کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، خواہ ماضی ہو یا مستقبل، یعنی لفظ متی کا استعمال فعل ماضی اور مضارع دونوں میں ہوتا ہے، جیسے "متٰی جئتَ" (تم کب آئے؟) یہ فعل ماضی کی مثال ہے "متٰی تذهب" (تم کب جاؤ گے؟) یہ فعل مستقبل کی مثال ہے۔

وأيَّانَ يُطلبُ الخ: لفظ أیّانَ کے ذریعہ صرف زمانہ مستقبل کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، یعنی اس کا استعمال فعل مستقبل ھی کے ساتھ خاص ہے، ایک دوسری خصوصیت اس کے اندر یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ کسی معمولی چیز کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا ہے بل کہ اس کا استعمال کسی عظیم اور ہولناک مقام میں ہوتا ہے، جیسے "**يسئل أيّان يوم القيٰمة**" (وہ پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی)

یہاں قیامت چوں کہ ایک ہولناک چیز ہے، اسی لیے "ایان" لایا گیا ہے۔

كيفَ يُطلبُ الخ: لفظ کیف کے ذریعے حالت دریافت کی جاتی ہے، مثلاً "كيف أنت" آپ کیسے ہیں؟ اسی لیے جواب میں حالت بتلائی جائے گی، مثلاً "أنا طيب، أنا مريضٌ" وغیرہ۔

وأين يطلب بها الخ: لفظ أين کے ذریعے جگہ کی تعیین کے متعلق سوال

کیا جاتا ہے، جیسے "این تذهب" (تم کہاں جارہے ہو) اسی لیے اس کے جواب میں جگہ کی وضاحت کی جائے گی، مثلاً "إلى المدينة، إلى المسجد" وغیرہ۔

وأنّٰى تكونُ :أنّٰى کیف کے معنی میں بھی ہوتا ہے، یعنی اس کے ذریعہ بھی کیفیت ہی دریافت کی جاتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ أنّٰى کے بعد کوئی فعل آئے، برخلاف کیف کے کہ اس کے ساتھ فعل کا لانا کوئی ضروری نہیں ہے، جیسے "أنّٰى يحيى هذه الله بعد موتها" اس بستی کو اللہ تعالیٰ اس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے زندہ کرے گا؟ یہاں زندہ کرنے کی کیفیت کے متعلق سوال کیا جارہا ہے۔

وبمعنٰى من أينَ نحوُ "يٰمريَمُ أنّٰى لكِ هٰذا" و بمعنٰى متٰى نحوُ "زُرْ أنّٰى شِئتَ".

(١٠) وكَمْ : يُطلبُ بها تعيينُ عدَدٍ مبْهمٍ نحو "كم لبثْتُمْ"

(١١) وأيٌّ: يُطلبُ بها تمييزُ أحَد المتشاركينِ في أمرٍ يعمُّهما نحو "أيُّ الفريقين خيرٌ مقامًا" ويُسألُ بها عنِ الزَّمانِ والمكانِ والحَالِ والعَدَدِ والعاقِلِ وغَيْرِهِ حَسَبَ ماتُضافُ إليه

وقد تَخرُجُ ألفَاظُ الاستفهامِ عن معناها الأصليّ لمعانٍ أُخَرَ تُفهَمُ من سِياقِ الكَلامِ .

١ . كالتَّسويةِ نحوُ "سواءٌ عليهِمْ أ أنذرتَهُمْ أم لم تُنذرْهُمْ"

٢ . والنَّفي نحوُ "هَلْ جزاءُ الإحسانِ إلَّا الإحسانُ"

٣ . والإنكارِ نحوُ "أغيرَ اللّٰهِ تدعُونَ" و "أ ليسَ اللّٰهُ بكافٍ عَبدَهٗ"

ترجمہ: اور "أنّٰى" من أين کے معنی میں بھی ہوتا ہے، جیسے "يا مريم أنّٰى لكِ هٰذا" (اے مریم یہ بے موسم پھل تمہارے پاس کہاں سے آیا)

اور ”متیٰ“ کے معنی میں بھی ہوتا ہے، جیسے ”زر أنّٰی شئت“ (جب چاہو آؤ) اور ”کم“ اس کے ذریعہ عدد مبہم کی تعیین مطلوب ہوتی ہے، جیسے ”کم لَبِثْتُمْ“ (تم کتنی مدت ٹھہرے؟) اور أيّ اس کے ذریعے دو شریکوں میں سے ایک کی جدائی مطلوب ہوتی ہے، کسی ایسی چیز میں جو ان دونوں کو شامل ہو، جیسے ”أيّ الفريقين خيرٌ مَقامًا“ (دونوں فریقوں میں سے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے کون بہتر ہے) اور ”أيّ“ کے ذریعے زمان، مکان، حال، عدد، عاقل اور غیر عاقل ان سب کے متعلق حسب اضافت سوال کیا جاتا ہے۔

اور کبھی کبھی استفہام کے الفاظ اپنے اصلی معنی ”استفہام“ سے ہٹ کر دوسرے معانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جن کا پتہ سیاق کلام سے چلتا ہے، جیسے

(۱) تسویہ مثلاً ”سواء عليهم أ أنذرتهم أم لم تنذرهم“ (ان پر برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں)

(۲) نفی مثلاً ”هل جزاء الإحسان إلا الإحسان“ (بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے)

(۳) انکار مثلاً ”أغير الله تدعون“ و ”أ ليس الله بكاف عبده“ (کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے) اور (کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے)

تشریح: جس طریقے سے ”أنّٰی“ کیف کے معنی میں ہوتا ہے، اسی طریقے سے ”من این“ اور ”متی“ کے معنی میں ہوتا ہے، البتہ جس وقت ”من این“ کے معنی میں ہوگا اس صورت میں اسم اور ظرف دونوں کے معنی کو متضمن ہوگا اور اس حالت میں ”أنّٰی“ کے بعد فعل کا آنا ضروری نہیں ہوگا، چناں چہ مثال ”یا مریم أنّٰی لك هذا“ میں ”أنّٰی“ کے بعد فعل نہیں ہے، اور جس وقت ”متی“ کے معنی میں ہوگا اس وقت ”أنّٰی“ کے بعد فعل آئے گا، جیسا کہ مثال مذکور ”زر أنّٰی

شئت" میں ہے۔

وکم یطلب بها لفظ "کم" کے ذریعہ عددِ مبہم کی تعیین کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، جیسے "کم لبثتم" یہاں کم کا ممیز محذوف ہے، اصل میں "کم یومًا" یا "کم سنةً" یا "کم ساعةً لبثتم" ہے، ممیّز مذکور کی مثال "کم درهمًا لك" ہے۔

وأيّ یطلبُ بها لفظ "أي" کے ذریعہ متشارکین میں سے ایک کی تمیز کی متعلق سوال کیا جاتا ہے، ایسی چیز میں جس کا تعلق دونوں سے ہو، جیسے "أيّ الفريقين خيرٌ مقاماً" (دونوں فریقوں میں سے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے کون بہتر ہے) مثال مذکور میں فریقین تو متشارکین ہیں، اور مقام و مرتبہ کا تعلق دونوں سے ہے اور "أيّ" کے ذریعہ سوال کر کے یہ تعیین مقصود ہے کہ کس کا مقام و مرتبہ زیادہ اچھا ہے، اور "أيٌّ" کے ذریعے زمان، مکان، حال، عدد، عاقل اور غیر عاقل کے متعلق بھی سوال کیا جاتا ہے اُنٰی کے مضاف الیہ کے اعتبار سے۔

زمان کی مثال، جیسے "أي يومٍ تسافر" (تم کس دن سفر کرو گے)) مکان کی مثال، جیسے "بأي مكان أقمت" (کس جگہ تم نے قیام کیا) حال، جیسے "في أي حالٍ جئت" (کس حال میں تم آئے) عدد، جیسے "أي الرجال بنى هذا المسجد" (کتنے لوگوں نے اس مسجد کی تعمیر کی) عاقل، جیسے "أيكم يذهب إلى دهلي" (تم میں سے کون دہلی جائے گا) غیر عاقل کی مثال، جیسے "فبأي حديث بعدهٗ يؤمنونَ" (تو اب کس بات پہ اس کے بعد یقین لائیں گے)

وقد تخرج ألفاظ الاستفهام الخ : کبھی کبھی استفہام کے الفاظ اپنے معنیٔ اصلی (استفہام) کی جگہ دوسرے معانی میں مستعمل ہوتے ہیں جن کو سیاق کلام سے سمجھ لیا جاتا ہے، یعنی طرز کلام سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ عبارت میں

استفہام کے الفاظ سے مراد سوال نہیں ہے، بل کہ حسب موقع دوسرے معانی مراد ہوتے ہیں، جس کی نمبر وار تشریح کی گئی ہے، لیکن چوں کہ اپنے اصلی معنی سے مناسبت رکھتے ہیں، اس بنا پر دوسرے معانی میں استعمال مجازاً سمجھا جائے گا۔

(۱) كالتسوية: الفاظ استفہام جن دیگر معانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک تسویہ ہے یعنی استفہام کی جگہ برابری مراد ہوتی ہے، جیسے "سواء عليهِمْ أ أنذَرتَهُمْ أم لَمْ تُنذِرْهُمْ" (ان پر برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں) یہاں ہمزۂ استفہام سے تسویہ مراد لیا گیا ہے، بایں طور کہ انذار اور عدم انذار دونوں برابر ہیں ان لوگوں کے حق میں جن کے لیے ایمان لانا مقدر ہی نہیں ہے۔

(۲) والنفي: نفی کا معنی دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "هَلْ جزاءُ الإحسان إلَّا الإحسان (کیا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے اور بھی کچھ ہوسکتا ہے؟) یعنی نہیں ہوسکتا، یہاں نفی مراد لیا گیا ہے۔

(۳) والإنكار: انکار کا معنی دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "أ غيرَ الله تدعُونَ ، أليسَ اللهُ بكافٍ عبدهُ" (کیا خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے، کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں) یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں پکارنا چاہئے اور اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی ہے، یہاں انکار مراد ہے۔

٤. والأمر نحو "فهل أنتم مُنتَهُون" و "أ أسلَمْتُمْ" بمعنى اِنتَهُوا وأسلِمُوا

٥. والنَّهي نحوُ "أ تخشَونَهم فاللهُ احقُّ أن تخشَوهُ"

٦. والتَّشويقِ نحوُ "هل أدُلُّكُم على تِجارَةٍ تُنجيكُمْ مِنْ عذابٍ أليمٍ"

٧. والتَّعظِيمِ نحوُ "مَنْ ذَا الَّذِي يشفَعُ عِندهُ إلَّا بإذنه"

٨. والتَّحقِيرِ نحوُ "أهٰذا الَّذِي مدَحتهُ كثيرًا"

٩. والتَّهكُّمِ نحوُ "أ عقلُكَ يُسوِّغُ لكَ أن تفعَلَ كذا"

۱۰. والتَّعجُبِ نحوُ "ما لِهٰذا الرَّسُولِ يأكلُ الطَّعَامَ ويمشِي في الأسواقِ"

۱۱. والتنبيهِ عَلَى الضَّلالِ نحوُ "فأينَ تذهبون"

۱۲. وَالوَعيدِ نحوُ "أتفعَلُ كذا وقد أحْسَنتُ إليكَ"

ترجمہ: (۴) امر مثلاً فَهَلْ أنتُمْ مُنتَهُون (سواب بھی باز آجاؤ) اور جیسے "أأسلَمْتُمْ" (کیا تم بھی مانتے ہو) بمعنی رک جاؤ اور مان لو۔

(۵) نہی جیسے "أ تخشونهم فاللّٰه احقُّ أن تخشَوهُ" (کیا تم ان لوگوں سے ڈرتے ہو حالاں کہ اللہ تعالیٰ زیادہ سزاوار ہے کہ تم اس سے ڈرو)

(۶) تشویق (شوق دلانے کے لیے) جیسے "هَلْ أدُلُّكُم على تِجارةٍ تُنجِيكُمْ مِّنْ عذابٍ أليمٍ" (کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے دے)

(۷) تعظیم جیسے "مَنْ ذَا الَّذى يشْفعُ عِندَهُ إلَّا باذنِه" (کون ایسا شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کرے بدون اس کی اجازت کے)

(۸) تحقیر جیسے "أ هذا الَّذى مدحْتَهُ كثيرًا" (یہی وہ ہے جس کی تم نے بہت تعریف کی تھی)

(۹) تہکم (مذاق اڑانے کے لیے) جیسے "أ عقلُكَ يسوِّغُ لك أن تفعَلَ كذَا" (کیا تمہاری عقل کو یہ بھاتی ہے کہ تم ایسا کرو)

(۱۰) تعجب جیسے "مالِهٰذا الرَّسولِ يأكلُ الطَّعام ويمْشِى فى الاسواق" (اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے)

(۱۱) گمراہی پر تنبیہ کرنا جیسے "فأين تذهَبُون" (تم لوگ کدھر چلے جارہے ہو)

(۱۲) وعید (دھمکی دینا) جیسے "أ تفعلُ كذا وقد احْسَنتُ إليك"

(کیاتم ایسا کرر ہے ہو جب کہ میں نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے)

تشریح: (۴) والأمر، استفہام کوامر کے معنی دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "فھَلْ انتم مُنتھُو نَ" (سو اب بھی باز آجاؤ) یہاں استفہام "انتھوا" امر کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور جیسے "أ اسلمتُمْ" کیاتم اسلام نہیں لاؤ گے، یعنی اسلام لے آؤ، یہاں بھی "أ اسلمتم" "اسلِمُوا" امر کے معنی میں ہے۔

(۵) والنھی نہی کا معنی دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے أ تخشونھم فاللہ أحقُّ أن تخشوہُ (کیاتم ان لوگوں ڈرتے ہو تو اللہ تعالیٰ زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو، یہاں "أتخشَونَھُمْ" لاتَخشَو ھُمْ" نہی کے معنی میں ہے۔

(۶) والتشویق تشویق یعنی شوق دلانے کے لیے استفہام کو استعمال کیا جاتا ہے جیسے "ھَلْ أدُلُکُم علیٰ تِجارۃٍ تُنجِیکُمْ مِنْ عذابٍ الیمٍ" (کیا میں تمہیں ایسی سوداگری بتلاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دیدے) آیت کریمہ میں جواب استفہام صیغہ امر "دُلَّ" ہے، یعنی (ضرور بتلایئے) تو یہاں استفہام یعنی "ھَلْ ادُلُکُمْ" شوق دلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور قرینہ "تنجیکم من عذاب الیم" ہے کیوں کہ یہ جملہ سن کر ہر ایک کے دل میں عذاب سے نجات پانے کا شوق پیدا ہوگا۔

(۷) والتعظیم: تعظیم کا معنی دینے کے لیے بھی استفہام کو استعمال کیا جاتا ہے، جیسے "مَنْ ذاالَّذیْ یشفَعُ عِندَہٗ إلاَّ باذنہٖ" (کون ایسا شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کرے بدون اس کی اجازت کے) یعنی کوئی ایسا نہیں ہے، یہاں پر استفہام نفی کے لیے ہے، لیکن اس سے مقصود باری تعالیٰ کی تعظیم اور شان کبریائی بیان کرنا ہے۔

(۸) والتحقیر: تحقیر کے لیے استفہام کو لایا جاتا ہے، جیسے ''أ ھٰذا الّذی مدحْتَہٗ کثیرًا'' (یہی وہ ہیں جن کی آپ نے بڑی تعریف کی تھی بنظر حقارت) یعنی تحقیر اور ذلت آمیز انداز میں کہا جائے اور قرینہ کلمہ ''ھٰذا'' ہے جو تحقیر کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔

(۹) والتھکّم: استہزاء اور مذاق کے لیے استفہام کو لایا جاتا ہے، جیسے ''أعقْلُكَ یُسوِّغُ لكَ أن تفعلَ کذا'' (کیا تمہاری عقل کو یہ بھاتی ہے کہ تم ایسا کرو) یہاں پر استفہام سے مقصود سوال کرنا نہیں ہے بل کہ تمسخر اور استہزاء ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے اندر عقل سلیم ہوگی تو تمہیں ضرور برے کاموں سے روکے گی، یہ کہہ کر غلط کار آدمی کا مذاق کرنا مقصود ہوتا ہے۔

(۱۰) والتعجب: تعجب کے معنی کے لیے بھی استفہام کو لایا جاتا ہے، جیسے ''مالِھٰذا الرَّسولِ یأکُلُ الطَّعامَ ویمشِیْ فی الاَسواقِ'' (اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے) اس طرح کی باتیں کفار بطور تعجب کہا کرتے تھے، اس لیے کہ ان کا یہ خیال تھا کہ پیغمبر جو ہوگا وہ ضروریات زندگی سے مستغنی ہوگا، تو یہاں پر استفہام ''ما'' تعجب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

(۱۱) والتنبیه علی الضَّلال: گمراہی پر تنبیہ کرنے کے لیے استفہام کو لاتے ہیں جیسے ''فأین تذھبون'' (کہاں چلے جارہے ہو) مطلب یہ ہے کہ کہاں گمراہیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہو، ہوش میں آؤ، متنبہ ہوجاؤ۔

(۱۲) والوعید: وعید اور دھمکی دینے کے لیے جیسے ''أ تفعلُ کَذا وقَدْ أحسَنْتُ إلیكَ'' (کیا تم ایسا کر رہے ہو جب کہ میں نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے) یعنی دھمکی دے رہا ہے کہ اگر ایسا کروگے تو اس کا انجام کوئی اچھا نہیں ہوگا، استفہام اپنے حقیقی معنی میں اس لیے نہیں ہے کہ متکلم خود کہہ رہا ہے کہ تو یہ کام کر رہا ہے پھر پوچھنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟

(٤) ﴿ وأمّا التَّمنّی ﴾ فهُوَ طَلَبُ شَيْ مَحْبُوبِ لايُرجٰی حصُولُهٗ لِكَونِهٖ مُسْتَحِيلاً أو بعِيدَ الوُقُوعِ كقَولِهٖ ؎

أَلَا ليتَ الشَّبابَ يعُودُ يومًا فأُخبِرَهٗ بِما فعَلَ المَشِيبُ

وقول المعسر "ليت لي ألف دينار"

وَإذَا كانَ الأمرُ مُتوقَّعَ الحُصُولِ فإنْ ترقُّبَهٗ يُسمّٰی ترَجِّيًا ، ويُعَبَّرُ عنهُ بِـ"عسٰی" أو "لعلَّ" نحوُ "لعَلَّ اللّٰهُ يُحدِثُ بعدَ ذٰلكَ مرًا" .

وللتَّمنّي أربَعُ أدَواتٍ ، واحِدَةٌ أصْلِيَّةٌ . وهِيَ ليتَ ، وثَلاثَةٌ غيرُ أصْلِيَّةِ وهِيَ : هَلْ ، نحوُ "فهَلْ لنَا مِنْ شُفعَاءَ فيَشْفعُوا لنَا" ولَوْ، نحوُ "فلَو أنَّ لنَا كرَّةً فنكُونَ مِنَ المُؤمنِينَ" ولعَلَّ نحوُ قولِهٖ ؎

أسِرْبَ القطا هَلْ مَنْ يُعِيرُ جناحَهٗ لعلِّيْ إلٰی مَنْ قدْ هوِيتُ أطِيرَ

وَلاستِعمالِ هٰذِهِ الادَواتِ في التَّمنّي يُنصَبُ المُضارِعُ الوَاقِعُ في جَوابِها .

ترجمہ: بہرحال تمنی تو وہ کسی ایسی پسندیدہ چیز کا طلب کرنا ہے جس کے حصول کی امید نہیں کی جاتی اس کے محال ہونے کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ وہ بعید الوقوع ہے، جیسا کہ شاعر کا شعر ألا ليتَ الخ

اے کاش! کسی دن جوانی لوٹ آتی تو میں اسے بڑھاپے کے کرتوت بتلا دیتا۔

اور جیسے کہ تنگ دست کا قول "ليت لي ألف دينار" کاش کہ میرے پاس ایک ہزار دینار ہوتے۔ اور جب کوئی امر (محبوب) متوقع الحصول ہو تو اگر تمہیں اس کا انتظار ہو تو اس کا نام ترجی ہے اور اس کی تعبیر عسیٰ یا لعل کے ذریعے ہوتی ہے، جیسے لعلَّ اللّٰه يُحدِثُ بعدَ ذٰلكَ أمرًا (ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی نئی بات پیدا کردے)

تمنی کے چار ادوات میں ایک اصلی ہے اور وہ "لیت" ہے اور تین غیر اصلی اور وہ "ھل" ہے، جیسے فَھَلْ لَنَا مِنْ شُفَعَاءَ الخ (کاش کہ ہمارے پاس بھی سفارشی ہوتے تو ہمارے حق میں سفارش کرتے) اور "لو" ہے، جیسے "فَلَوْ أَنَّ الخ" (سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو پھر واپس جانے کو ملتا تو ہم مسلمان ہوجاتے) اور "لعلَّ" ہے، جیسے شاعر کا شعر أسِرْب القَطا الخ

اے قطا نامی پرندوں کی جماعت! کیا کوئی اپنا بازو عاریت پر دے گا، کاش میں اپنے محبوب کے پاس اڑ کر جاؤں۔

اور تمنی میں ان ادوات کے استعمال کی وجہ سے اس فعل مضارع کو نصب دیا جائے گا، جو ان کے جواب میں واقع ہو۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں انشاء طلبی کی چوتھی قسم تمنی کو بیان کیا گیا ہے، تمنی لغت میں آرزو کرنے کو اور اصطلاح میں کسی ایسی محبوب چیز کے طلب کرنے کو کہتے ہیں جس کے حاصل ہونے کی امید دو وجہ سے نہ ہو (۱) یا تو اس وجہ سے کہ اس کا حاصل ہونا محال ہے، (۲) اور یا تو اس وجہ سے کہ اس کا حاصل ہونا ممکن اور متوقع تو ہے، لیکن بعید ہے، جس کی بنا پر اس کے حصول کی امید نہیں کی جاتی، پہلے کی مثال جیسے شاعر کا شعر ؎

ألا لیت الشباب یعود یومًا فاخبرہ بما فعل المشیب

لغات: شبابٌ جوانی، شَبَّ یشبُّ شبابًا (ض) جوان ہونا۔ عادَ یعُودُ عودًا (ن) لوٹنا۔ أخبرَ إخبارًا (افعال) بتلانا أخبِرَ فا کے بعد اَن مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے، مَشِیبٌ، مصدر میمی ہے از شابَ یشیبُ شیباً (ض) بالوں کا سفید ہونا، بوڑھا ہونا۔

ترکیب: ألا حرف تنبیہ، لیت حرف مشبہ بہ فعل، الشباب اسم، یعود، فعل بافاعل یوماً مفعول فیہ، فعل اپنے فاعل و مفعول فیہ سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر

خبر، حرف مشبہ بہ فعل کی، أخبَر ، أن مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے، ہٗ مفعول بہ "ما" اگر مصدر مانیں تو "بفعل المشیب" کے معنی میں ہوگا، اور اگر موصولہ مانیں تو "بالذي فعله المشیب" کے معنی میں ہوگا،

شعر مذکور محال کی مثال ہے کیوں کہ جوانی کبھی لوٹ کر نہیں آسکتی، یہ فطرت خداوندی کی خلاف ہے، شاعر صرف اپنی تمنا کا اظہار کر رہا ہے، اور "لیت لي ألف دینار" بعید الوقوع کی مثال ہے اس لیے کہ فقیر و تنگ دست کو ایک ہزار دینار کا ملنا ناممکن اور محال تو نہیں ہے البتہ بعید ضرور ہے۔

وإذا کان الأمر الخ : جب کسی محبوب شیٔ کا حاصل ہونا محال نہ ہو، بل کہ متوقع ہو تو اس کو ترجی کہتے ہیں، اس کے لیے عسی اور لعلَّ کو لاتے ہیں، اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر متمنی (شیٔ محبوب) کوئی امر ممکن ہو تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بعید الوقوع ہو تب ہی جا کر تمنی کا ثبوت ہوگا، اس لیے کہ اگر متمنی (شیٔ محبوب) ان چیزوں میں سے ہو جس کا وقوع ممکن اور متوقع ہو تو تمنی، ترجی میں بدل جائے گا۔

وللتَّمنِّی أربع أدوات الخ: فرماتے ہیں کہ تمنی کے کل چار حروف ہیں جن میں ایک اصلی اور بقیہ تین غیر اصلی ہیں، حرف اصلی "لیت" ہے، جس کی مثال اوپر گذر چکی، حروف غیر اصلیہ "هل ، لو ، لعلَّ" ہیں، ہل جیسے فهَلْ لنَا مِنْ شُفعَاءَ فَيشْفعُوْا لنَا (کاش ہمارے بھی سفارشی ہوتے جو ہمارے حق میں سفارش کرتے) یہ کہہ کفار تمنا کریں گے، استفہام کے معنی پر "هل" کو اس لیے محمول نہیں کر سکتے کہ کافر کے حق میں کوئی سفارش کر ہی نہیں سکتا، "لو" جیسے "فَلَوْ أنَّ لنَا كرَّةً فنكُون مِنَ الْمُؤمِنينَ" سو کیا اچھا ہوتا کہ ہم کو پھر واپس جانے کو ملتا تو ہم مسلمان ہو جاتے، اس طرح کے جملے کفار اور مشرکین اس وقت کہیں گے جب وہ دوزخ اور عذاب الٰہی کو دیکھیں گے اور یہ کہہ کر تمنا کریں گے

کہ کاش کہ دنیا میں ایک بار پھر جانے کو مل جاتا تو مسلمان ہو جاتے اور نیک اعمال کرتے، یہاں بھی ''لو'' کے معنی حقیقی شرط کو اس لیے نہیں لے سکتے کہ کفار بھی جانتے ہیں کہ ان کے حق میں خلود فی النار کا فیصلہ ہے، لعلّ جیسے ؎

أسرب القطا هل من يعير جناحه　　لعلّي إلى من قد هويتُ اطير

لغات: سِربٌ (ج) أسرابٌ جماعت، ریوڑ۔ قطا ایک پرندہ ہے جو کبوتر کے مشابہ ہوتا ہے؛ أعارَ إعارةً عاریت پر دینا ۔جَنَاحٌ (ج) أجنِحةٌ بازو ۔ هوِي يهوىٰ هوىً (س) خواہش کرنا، محبت کرنا ۔ طَارَ يطير طيرانًا (ض) اڑنا۔

ترکیب: أ حرف ندا، ''سرب القطا'' منادیٰ، ندا با منادیٰ جملہ فعلیہ انشائیہ، هل حرف استفهام، من موصولہ، ''يعير جناحه'' فعل با فاعل و مفعول بہ جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر صلہ، موصول با صلہ جملہ اسمیہ انشائیہ ہوا، لعلّ حرف مشبہ بہ فعل، ي اس کا اسم، إلى حرف جار، منْ موصولہ ''قد هويت'' جملہ فعلیہ خبریہ صلہ، موصول با صلہ مجرور، جار با مجرور متعلق مقدم ''أطير'' کے، أطير فعل با فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر لعلّ۔

شعر مذکور میں شاعر تمنا کر رہا ہے کہ کاش کہ مجھے بازو مل جاتے تو میں اڑ کر جلدی سے اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتا، یہاں شاعر جس چیز کی تمنا کر رہا ہے (اپنے محبوب کی طرف پرواز) ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کے حاصل ہونے کی امید ہو، کیوں کہ یہ بات محال ہے کہ کوئی پرندہ اپنا بازو کسی انسان کو عاریت پر دے دے اور وہ شخص اسے اپنے بدن کا جز بنا کر پرواز کرے، لہٰذا لعلّ یہاں اپنے معنی (ترجی) میں مستعمل نہیں ہے، بل کہ تمنی کے معنی میں ہے جو اس کا معنیٔ غیر اصلی ہے۔

ولاستعمال هذه الأدوات في التّمنّي: اور جب تمنی میں ان ادوات

کو استعمال کیا جائے تو وہ فعل مضارع جو ان کے جواب میں واقع ہوگا، اسے منصوب پڑھا جائے گا، اسی قاعدے کے تحت "فَهَلْ لنا مِنْ شُفعَاءَ فيَشْفعُوْا لنَا میں فيَشْفعُوْا" سے نون اعرابی کو حذف کردیا گیا ہے، اور فنكونَ من المؤمنين میں بھی نكون پرنصب پڑھا گیا ہے۔

﴿ وَأمَّا النِّداءُ ﴾ فهُوَ طلبُ الإقبالِ بحرفٍ نائبٍ منابَ ادْعُوْ ، وَأدواتُهُ ثمانِيةٌ : يَا ، والهمزَةُ ، وأي ، وآ ، وآيْ ، و أيَاَ ، وهَيَا ، ووَا ، فالهَمزَةُ ، وأي للقَرِيبِ وغيرُهُمَا للبَعِيدِ وقَدْ يُنزَلُ البَعيدُ منزِلةَ القَريبِ؛ فيُنادىٰ بِالهَمْزةِ وأيْ ، إشارةً إلىٰ أنَّهُ لشِدَّةِ استِحضارِهٖ في ذِهنِ المتكلِّمِ صارَ كالحاضِرِ معهُ كقَولِ الشَّاعِرِ ؎

أسكانَ نعْمَانِ الإراكِ تيقَّنُوْا بِأنَّكُمْ في ربْعِ قَلبِيْ سُكَّانُ

وقَدْ ينزَلُ القَرِيبُ منزِلةَ البَعيدِ فيُنادىٰ بأحدِ الحُروفِ المَوضوعةِ لَهُ إشارةً إلىٰ أنَّ المُنادىٰ عظيمُ الشَّأنِ رفيعُ المرتبةِ ، حتّٰى كأنَّ بُعدَ دَرجَتِهٖ في العِظَمِ عن درجَةِ المُتكَلِّمِ بُعدٌ في المسافةِ ، كقَولِكَ "أيَا مَولايَ" وأنت معهُ. أو إشارةً إلىٰ انحِطاطِ درجتِهٖ كقَولِكَ "أيا هٰذا" لِمَنْ هُوَ معكَ أو إشارةً إلىٰ أنَّ السَّامِعَ غافِلٌ لنَحْوِ نومٍ أو ذُهُولٍ، كأنَّهُ غيرُ حاضِرٍ في المَجلِسِ ، كقَولِكَ للسَّاهِيْ "أيَا فُلانُ"

ترجمہ: بہرحال ندا تو وہ توجہ کا طلب کرنا ہے ایک ایسے حرف کے ذریعے جو "أدعو" کے قائم مقام ہو اور ندا کے ادوات آٹھ ہیں، (یا ، ھمزہ ، أي ، آ ، آي ، ایا ، ھیا ، وا) پس ھمزہ اور أي ندائے قریب کے لیے ہیں اور ان دونوں کے علاوہ بعید کے لیے، اور کبھی منادیٰ بعید کو منادیٰ قریب کے درجے میں اتار لیا جاتا ہے، تو ہمزہ اور أي کے ذریعے ندا دی جاتی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ متکلم کے ذہن میں زیادہ مستحضر ہونے کی وجہ سے

ایسا ہو گیا جیسے کہ وہ چیز پہلے سے ذہن میں موجود ہے، جیسے شاعر کا شعر أسکان الخ اے وادی نعمان اراک کے باشندو! تم یقین کرلو کہ تم میرے دل کی بستی میں آباد ہو
اور کبھی منادیٰ قریب کو منادیٰ بعید کے درجے میں اتار لیا جاتا ہے تو جو حروف بعید کے لیے موضوع ہیں ان میں سے کسی ایک کے ذریعے ندا دی جاتی ہے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ منادیٰ عظیم الشان اور بلند مرتبت ہے، حتی کہ منادیٰ کے درجے کی دوری بڑائی میں متکلم کے درجے سے (گویا) مسافت میں دوری ہے، جیسا کہ تمہارا اپنے پاس موجود آقا کو "أیا مولاي" کہنا، یا منادیٰ کے درجے کے انحطاط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جیسے کہ تمہارا قول "أیا هذا" اس شخص سے جو تمہارے ساتھ ہو، یا اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ سامع نیند یا ذہول کی وجہ سے گویا مجلس میں موجود ہی نہیں، جیسے تمہارا غافل شخص سے کہنا "أیا فلان"

تشریح: عبارت بالا میں انشاء طلبی کی پانچویں قسم "ندا" کے بارے میں بیان کیا ہے، اولاً ندا کی تعریف کی ہے، پھر اس کے حروف اور ان کے طریقۂ استعمال کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ "ندا" مخاطب کی توجہ کے طلب کرنے کو کہتے ہیں ایسے حرف کے ذریعے جو "أدعوا" کے قائم مقام ہو، مثلاً "یا" وغیرہ، اب یہ قائم مقام لفظ خواہ مذکور ہو یا محذوف، مذکور مثلاً "یازید" محذوف جیسے "یُوسُفُ أعْرِضْ عَنْ هذا" اصل میں "یایُوسُفُ أعْرِضْ" ہے۔

حروف ندا آٹھ ہیں جن میں سے "همزه" اور "أي" ندائے قریب کے لیے ہیں اور بقیہ حروف ندائے بعید کے لیے، مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کی اصل وضع قریب کے لیے ہوئی ہے، اور بقیہ حروف کی اصل وضع بعید کے لیے ہوئی ہے، اگر چہ یہ بقیہ حروف بعض مواقع میں قریب کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔

وقد ینزّل البعید الخ: یہاں سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی خلاف

ضابطہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ منادیٰ بعید کو قریب کے درجے میں اتار کر اس کے لیے "همزه" اور "أي" کا استعمال کرتے ہیں، جس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ منادیٰ مکان اور جگہ کے لحاظ سے اگر چہ بہت دور ہے مگر قلب وذہن کے اعتبار سے اتنا قریب ہے کہ باوجود دوری کے گویا پاس ہی ہے، جیسے ؎

أسكّانَ نعمان الأراك تيقّنُوا بأنكُمْ في ربع قلبي سكّان

لغات: سُكّانٌ (واحد) ساكنٌ، باشندہ ـ نعمان الاراك طائف اور عرفات کے درمیان ایک وادی کا نام ہے ـ تيقّن يتيقّن تيقُّنًا (تفعل) یقین کرنا ـ ربْعٌ (ج) ربُوعٌ مکان، منزل، ٹھہرنے کی جگہ۔

ترکیب: أ حرف ندا، سكان نعمان الاراك، مضاف با مضاف الیہ منادیٰ "تيقّنُوا" فعل با فاعل ب حرف جار أنّ حرف مشبہ بہ فعل، كم اس کا اسم في جارہ، "ربع قلبي" مضاف با مضاف الیہ مجرور، جار مجرور متعلق مقدم ہوا، سُكّانُ کا سُكّانُ خبر، أنّ با اسم وخبر مجرور، جار با مجرور متعلق بہ تيقّنُوا ، تيقّنُوا جواب نداء ندا با جواب ندا جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا۔

اس شعر میں نعمان الاراک کے بسنے والوں کو "ہمزہ" کے ذریعے ندا دی گئی ہے، باوجودے کہ وادی نعمان الاراک اور وہاں کے باشندے دونوں ہی متکلم سے کوسوں دور ہیں، مقصد یہ ہے کہ نعمان الاراک کے باشندے مکان کے اعتبار دور ہونے کے باوجود شاعر کے ذہن سے اتنا قریب ہیں کہ حاضر کے درجے میں ہو گئے ہیں، لہٰذا "ہمزہ" کا استعمال ضابطۂ مذکورہ کی وجہ سے صحیح ہے۔

وقد ينزل القريب الخ: اور کبھی منادیٰ قریب کو بعید کے درجے میں اتار کر اس کے لیے "ہمزہ" اور "أي" کے علاوہ حروف ندا لاتے ہیں اور اس میں نکتہ یہ ہوتا ہے کہ منادیٰ اتنا عالی مرتبت یا اتنا حقیر ہے یا منادیٰ سے ایسی بے تعلقی ہے کہ باوجود قریب ہونے کے بھی گویا وہ دور ہی ہے، یعنی مرتبے کی دوری کو مسافت کی

دوری کے درجے میں اتارلیا جاتا ہے، جیسے أیا مولاي (اومیرے آقا) مثال مذکور میں آقا اس کے قریب اور پاس ہی ہے، ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ندائے قریب کا حرف استعمال کرتا مگر چوں کہ مکانی قرب ومعیت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے؛ بل کہ مرتبے اور عظمت کی دوری پیش نظر ہے اس لیے ''أیا'' ادات بعیدہ کے ذریعہ ندادی گئی اور کبھی اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ منادیٰ میرے مقابلے میں بہت ہی حقیر ہے یعنی میرے اور اس کے درمیانی مرتبے اور عظمت کے لحاظ سے فرقت وبعد ہے جیسے کسی کمتر آدمی سے کہنا ''أیاهذا'' (او بیوقوف) یہاں حسی اعتبار سے اگر چہ قرب ہے مگر عظمت وحقارت کے لحاظ سے دوری ہے۔

اسی طریقے سے کبھی ندائے بعید کے ادات کو اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کہ مخاطب غافل اور لاپرواہ ہو، نیند یا ذہول کی وجہ سے، جیسے کسی بے توجہ کو مخاطب کر کے کہنا ''أیافلان'' (اوفلاں) یہاں بھی اگر چہ مکانی اعتبار سے قرب ہے مگر غافل ہونے کی وجہ ''أیا'' ادات بعید کا استعمال کیا گیا ہے۔

وقَدْ تخرُجُ ألفاظُ النِّداءِ عن معنَاهَا الأصليِّ لِمعانٍ أُخرَ تُفهَمُ مِنَ القَرائِنِ .

١ . كالإغراءِ نحوُ قولِكَ لِمَنْ أقْبلَ يتظَلَّمُ "يا مظْلُومُ" .

٢ . الزَّجرِ نحوُ ۔

أفُوادِيْ متىٰ المتابُ ألَمّا تصحُ والشَّيبُ فوقَ رأسِيْ ألَمَّا

٣ . والتَّحيُّرِ والتَّضجُّرِ ، نحوُ ع "أيا منازِلَ سلمىٰ أينَ سلمَاكِ" ويكْثُرُ هٰذا فِي نِداءِ الأطْلالِ والمَطايا ونحوِهَا .

٤ . والتَّحسُّرِ والتَّوجُّعِ ، كقَولِه ۔

أيا قبرَ معنٍ كَيفَ واريتَ جُودَهٗ وقَدْ كانَ مِنهُ البَرُّ والبَحرُ مُترَعًا

٥ . والتَّذكُّرِ ، نحوُ ۔

أيا منزِلَي سلمىٰ سلامٌ عليكُما هل الأزمُنُ اللاتي مَضين رواجع

ترجمہ: اور کبھی ندا کے الفاظ اپنے معنی اصلی کی جگہ دوسرے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، جو قرائن سے سمجھے جاتے ہیں (۱) جیسے ترغیب دینا مثلاً تمہارا کہنا اس شخص سے جو ظالم کی شکایت کے لیے آئے یامظلوم (اومظلوم)

(۲) زجروتوبیخ جیسے شاعر کا شعر أفؤادي الخ

اے میرے دل تو کب توبہ کرے گا، اب تک تو ہوش میں نہیں آیا، حالاں کہ بڑھاپا میرے سر پر اتر چکا۔

(۳) حیرت و بے قراری، جیسے "أيا منازل سلمىٰ أين سلماك" (اے سلمیٰ کے ٹھکانو! تمہاری سلمیٰ کہاں گئی) اور زیادہ تر یہ معنی ٹیلوں، سواریوں وغیرہ کی ندا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(۴) حسرت وتکلیف جیسے شاعر کا یہ شعر "أيا قبر معن الخ"

اے معن کی قبر تو نے اس کی سخاوت کو کیسے چھپالیا، حالاں کہ اس کی سخاوت سے تو خشک وتر دونوں آباد تھے۔

(۵) تذکر یعنی پرانی یادیں تازہ کرنا، جیسے "أيامنزلي"

اے سلمیٰ کے دو ٹھکانو! تم دونوں کو سلام، کیا وہ زمانے جو (عشق ومحبت کے تیرے ساتھ) گذر گئے لوٹ کر آئیں گے؟

تشریح: عبارت بالا میں بیان کیا گیا ہے کہ کلمات ندا اپنے اصلی معنی "طلب المتكلم إقبال المخاطب"، متکلم کا مخاطب کی توجہ کو طلب کرنا — کی جگہ دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتے ہیں، جن کو قرائن سے سمجھا جاتا ہے بعدازاں ان معانی غیر اصلیہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔

۱ الإغراء: یعنی ابھارنا، ترغیب دینا، کسی کام پر آمادہ کرنا، جیسے "یا مظلوم" کہنا اس شخص سے جو ظلم کی شکایت لے کر آئے، شکایت سننے کے دوران، مثال

مذکور میں ''یا'' اگرچہ ندا کا حرف ہے مگر اس کا مقصد ''طلب الاقبال'' نہیں ہے، اس لیے کہ ظلم کی داستان بیان کرنے والا حاکم کی طرف پوری طرح متوجہ ہے؛ بل کہ مقصد اس کو اپنی مظلومیت کی داستان بیان کرنے پر ابھارنا اور آمادہ کرنا ہے۔

والزجر: زجر و توبیخ کے لیے بھی ندا لاتے ہیں، جیسے شاعر کا شعر: ~

أفؤادي متى المتاب ألمّا تصح والشيب فوق رأسي ألمّا

لغات: فؤاد (ج) أفئدة دل ـ متابٌ مصدر میمی ہے تاب یتوب توبة (ن) سے توبہ کرنا ـ ألمَّ يُلِمُّ إِلمَامًا (افعال) قریب ہونا، صحا یصحُو صحوًا (ن) ہوش میں آنا ألمّ إِلمامًا بالقوم آکر اتر پڑنا۔

ترکیب: أفوادي، ندا منادیٰ جملہ ندائیہ متیٰ خبر مقدم، المتاب، مبتدا موخر ـ أ ہمزہ استفہام، لمّا تصح فعل، ضمیر ذوالحال، واو حالیہ، الشیب مبتدا، فوق راسي، مضاف با مضاف ظرف مقدم، ألمّا فعل با فاعل، جملہ شدہ خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ شدہ حال، ذوالحال با حال فاعل، فعل با فاعل جملہ فعلیہ انشائیہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''أفؤادي'' ہے جو ''طلب الاقبال'' کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے اس لیے کہ متکلم نے اس لفظ سے اپنے ہی کو ندا دی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ خود پہلے ہی سے متوجہ ہے؛ بل کہ اس کا مقصد غافل نفس کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے کہ اب تک جو زندگی نافرمانی خدا اور معصیت میں گذری وہ تو گذری ہی، اب جب کہ بڑھاپا آگیا تو اب تو ہوش میں آکر توبہ کر لینا چاہیے۔

۳ والتحیُّر والتضجُّر یعنی حیرت و بے قراری کے لیے ندا کا استعمال کرتے ہیں، جیسے ''أيا منازل سلمیٰ أين سلماك'' مثال مذکور میں محل استشہاد ''أيا منازل سلمیٰ'' ہے، یہاں پر بھی ندا معنیٔ غیر اصلی ''حیرت و بے قراری'' میں مستعمل ہے اس لیے کہ شاعر نے ''منازل'' سے اپنی محبوبہ کی قیام گاہوں کو

مخاطب بنایا ہے، اور وہ چوں کہ غیر عاقل ہیں، جن میں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے، بل کہ ذہن ودماغ میں پرانی یادیں تازہ کرکے حیرت و بے قراری میں دریافت کررہا ہے، کہ سلمٰی کہاں گئی؟

أطلال ، طلٌ کی جمع ہے، بمعنی ٹیلہ، گری ہوئی عمارتیں، کھنڈر، ویران اور پرانی سراؤں کے نشان، مطایا مطیّۃ کی جمع ہے بمعنی سواری۔

۴ والتحسُّر والتوجع: یعنی حسرت وتکلیف کے لیے بھی کلمات ندا کا استعمال کرتے ہیں، جیسے شاعر کا شعر ؎

أیا قبر معن کیف واریت جوده وقد کان منه البرّ والبحر مترعا

لغات: "معن" سے مراد معن بن زائدہ شیبانی ہے جو نہایت سخی اور دریا دل انسان تھا، واری یواری مواراۃ (مفاعلۃ) چھپانا، أترع یُترع إتراعًا (افعال) بھرنا، بھرپور ہونا۔

ترکیب: أ حرف ندا، قبر معن منادی، ندا با منادی جملہ فعلیہ انشائیہ، کیف استفہامیہ مبتدا، واریت فعل بافاعل، جوده، مضاف با مضاف الیہ ذوالحال، واو حالیہ کان فعل ناقص، منه متعلق مقدم ہے مترعا کا، البر والبحر معطوف علیہ ومعطوف اسم کان، مترعًا خبر، فعل ناقص اپنے اسم وخبر سے مل کر حال، ذوالحال باحال مفعول بہ، فعل بافاعل ومفعول بہ خبر مبتدا، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "أیا قبر معن" ہے، یہاں بھی حرف ندا اپنے معنیٰ اصلی میں مستعمل نہیں ہے، اس لیے کہ شاعر نے قبر کو مخاطب بنایا ہے، جو بے جان ہے جس میں متوجہ ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے؛ بل کہ شاعر معن بن زائدہ جیسے فیاض اور سخی انسان کی موت پر اظہار حسرت وافسوس کررہا ہے۔

والتذکّر: یعنی کسی چیز کو یاد کرنے کے لیے حرف ندا لاتے ہیں اور یہ تذکر بھی ندا کا اصلی معنی نہیں ہے، جیسے شاعر کا شعر ؎

أيا منزلي سلمٰى سلامٌ عليكما   هل الأزمن اللاتي مضين رواجع

لغات: أَزْمُنْ (واحد) زَمانٌ، وقت، زمانہ؛ مضى يمضي مضيًا (ض) گذرنا؛ رواجع (واحد) راجعةٌ، رَجَعَ يرْجِعُ رُجُوعًا (ض) لوٹنا۔

ترکیب: أ حرف ندا، منزلي سلمٰى مضاف بامضاف الیہ منادیٰ، سلامٌ مبتدا، عليكما محذوف کے متعلق ہو کر خبر، هل حرف استفہام؛ الأزمن موصوف، اللاتي اسم موصول، مضين فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلہ، موصول، موصول باصلہ صفت، موصوف باصفت مبتدا، رواجع خبر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

محل استشہاد یہی "أيا منزلي سلمٰى" ہے اور شاعر سلمٰی کے مکانات کو مخاطب کر کے گزرے ہوئے زمانوں کو یاد کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ وہ خوشی ومسرت اور محبت وعشق کے ایام جو گزر گئے اب دوبارہ لوٹ کر نہیں آسکتے۔

یہاں بھی شاعر نے محبوبہ کے مکانات ہی کو مخاطب بنایا ہے اس لیے معنیٰ حقیقی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔

وَغيرُ الطَّلبي يكُونُ بالتَّعجُّبِ والقَسَمِ وصيغ العُقُودِ كبِعْتُ واشْتريتُ ويكونُ بغير ذلك.

وأنواعُ الإنشاء غيرِ الطَّلبيّ ليستْ مِنْ مباحثِ علمِ المَعاني فلِذَا ضَرَبْنا صفْحًا عنها.

اور انشاء غیر طلبی تعجب، قسم اور عقود کے صیغوں مثلاً بعتُ واشتريتُ اور ان کے علاوہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔

اور انشاء غیر طلبی کے اقسام علم معانی کے مباحث میں سے نہیں ہیں، اس لیے ہم نے اس سے اعراض کیا ہے۔

تشریح: ماقبل میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ انشاء کی دو قسمیں ہیں: انشاء طلبی، انشاء غیر طلبی۔ ابھی تک جو کچھ بیان گزرا اس کا تعلق انشاء طلبی سے تھا اور

عبارت بالا میں انشاء غیر طلبی کو بیان کیا گیا ہے۔

انشاء غیر طلبی وہ کلام ہے جو کسی مطلوب کو نہیں چاہتا، اس کی بہت سی قسمیں ہیں: مثلاً تعجب، جیسے "ما أحسن زيدًا" قسم، جیسے "واللہ أنا صادق" اور عقود کے صیغے، جیسے "بعتُ و اشتريتُ"

وأنواع الإنشاء: فرماتے ہیں کہ انشاء غیر طلبی علم معانی کے مباحث میں سے نہیں ہے، اس لیے ہم نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور تفصیل بیان نہیں کی۔

البَابُ الثاني في الذّكرِ والحذفِ

إذا أُرِيدَ إفادةُ السَّامِعِ حكمًا فأيُّ لفظٍ يدُلُّ على معنًى فيهِ فالأصلُ ذِكرُهُ، وأيُّ لفظٍ عُلِمَ مِنَ الكلامِ لِدَلالةِ باقِيهِ عليهِ فالأصلُ حذفُهُ، وإذا تعارَضَ هذانِ الأصلانِ، فلَا يُعدَلُ عنْ مُقتضى أحدِهِمَا إلى مُقتضى الآخرِ إلَّا لِدَاعٍ.

دوسرا باب ذکر اور حذف کے بیان میں

جب سامع کو کسی حکم کا فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو جو لفظ بھی کسی ایسے معنی کو بتلائے جو اس لفظ میں ہو تو اصل اس لفظ کا ذکر کرنا ہے، اور جو لفظ کلام سے سمجھ لیا جائے کلام کے بقیہ حصے کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے تو اصل اس کا حذف کرنا ہے اور جب یہ دونوں اصل ایک دوسرے سے متعارض ہو جائیں تو ان میں سے ایک کے مقتضا سے دوسرے کے مقتضا کی طرف بغیر کسی سبب کے عدول اختیار نہیں کیا جائے گا۔

تشریح: عبارت بالا میں ذکر و حذف کی تمہید کو بیان کیا گیا ہے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ کلام میں مسند و مسند الیہ اور مفعولات و قیودات کا ذکر کرنا یا

حذف کرنا فائدے سے خالی نہیں، البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کس جگہ ذکر مناسب ہے اور کس جگہ حذف، عبارت مذکورہ میں مختصر طریقے سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب متکلم کا مقصد سامع اور مخاطب کو کسی حکم کا فائدہ پہنچانا ہو تو جو لفظ بھی اس معنی کو بتلائے اصل اس کا ذکر کرنا ہے اور جو معنی کلام سے بایں طور معلوم ہو جائے کہ کلام کے بقیہ الفاظ اس پر دلالت کررہے ہیں تو اصل یہ ہے کہ اس لفظ کو محذوف رکھا جائے، یہ دو الگ الگ ضابطے ہیں، اور جب یہ دونوں ضابطے ایک دوسرے کے متعارض ہو جائیں یعنی ایک کا تقاضہ ذکر کا اور دوسرے کا تقاضہ حذف کرنے کا ہو تو ایسی صورت میں ایک فیصلہ کن ضابطہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "لایُعْدَلُ عَنْ مُقْتَضٰی أَحَدِهِمَا إلٰی مُقْتَضٰی الآخر" یعنی یہ کہ ذکر و حذف دونوں میں سے ایک کے مقتضٰی سے دوسرے کے مقتضٰی کی طرف عدول بغیر کسی سبب کے نہیں اختیار کیا جائے گا، اس لیے کہ اگر بغیر کسی سبب کے کسی ایک کے مقتضٰی پر عمل کرلیا جائے اور دوسرے کو ترک کردیا جائے تو ایسی صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آئے گا اور یہ صحیح نہیں ہے۔

﴿ فَمِنْ دَواعِي الذِّكرِ ﴾ ۱. زِيادةُ التَّقْرِيرِ والإِيْضاحِ ، نحوُ "أولٰئك علٰى هُدىً مِن رَّبِّهِمْ وأولئك هُمُ المُفْلِحُون"

۲. وقِلَّةُ الثِّقَةِ بِالقَرِينةِ لِضَعْفِها أو ضَعْفِ فَهْمِ السَّامِعِ نحوُ "زيدٌ نِعْمَ الصَّديقُ" تقُولُ ذلكَ إذا سبَقَ لكَ ذِكْرُ زيدٍ وطَالَ عهدُ السَّامِعِ بِه، أو ذُكِرَ معهُ كلامٌ في شأنِ غيرِه.

۳. والتَّعرِيضُ بِغَباوةِ السَّامِعِ نحوُ "عمْرٌ وقَالَ كَذا" في جوابِ "مَاذا قَالَ عمْرٌو".

٤. والتَّسْجِيلُ علَى السَّامِعِ حتّٰى لايتأتّٰى لهُ الانكارُ كمَا إذا قَالَ الحَاكِمُ لِشاهِدٍ : هَلْ أَقَرَّ زَيْدٌ هٰذا بأنَّ عليهِ كَذا ، **فيَقُولُ الشَّاهِدُ** "نعمْ

زيدٌ هٰذا أقرَّ بأنَّ عليهِ كَذا".

٥. والتَّعجُّبُ إذَا كانَ الحُكمُ غرِيبًا ، نحو "عليٌّ يُقاوِمُ الأسدَ" تقُولُ ذٰلك معَ سبقِ ذِكرِهِ .

٦. والتَّعظِيمُ والإهانةُ إذَا كانَ اللَّفظُ يُفيدُ ذٰلكَ كأنَّ يَسْألَكَ سائِلٌ : هَلْ رَجَعَ القائِدُ؟ فتقُولَ : "رَجَعَ المَنْصُورُ أوِ المَهْزُوْمُ"

ترجمہ: تو ذکر کے اسباب میں سے (۱) زیادتی بیان اور وضاحت ہے (کے لیے لفظ کو ذکر کرتے ہیں) جیسے "أولٰئك على هدىً من ربِّهم وأولٰئك هم المفلحُونَ " یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۲) قرینے پر کم اعتمادی (کی وجہ سے ذکر کرتے ہیں) قرینے کے ضعف یا سامع کے فہم کے ضعف کی وجہ سے، جیسے "زيدٌ نعم الصديق" زید کیا ہی اچھا دوست ہے، تم یہ جملہ اس وقت کہتے ہو جب کہ زید کا ذکر تمہارے سامنے پہلے آچکا ہو اور سامع کا زمانہ اس کے متعلق طویل ہو گیا ہو یا زید کے ساتھ دوسرے کا بھی تذکرہ آگیا ہو۔

(۳) سامع کی کند ذہنی پر تعریض کرنے کے لیے (ذکر کرتے ہیں) جیسے "عمرو قال كذا" عمرو نے یہ کہا ہے "ماذا قال عمرو؟" عمرو نے کیا کہا؟ کے جواب میں۔

(۴) سامع کے لیے بات کو پختہ کرنا تاکہ اس کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہ سکے، جیسے کہ جب حاکم کسی گواہ سے پوچھے "هل أقرّ زيدٌ هٰذا بأن عليه كذا" کیا زید نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمہ اتنا ہے تو گواہ کہے "نعم زيدٌ أقرّ هٰذا بأنّ عليه كذا" ہاں زید نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کے ذمے اتنا ہے۔

(۵) تعجب کے لیے جب کہ حکم نادر ہو جیسے "عليّ يقاوم الأسد" علی شر سے مقابلہ کرلیتا ہے۔ تم یہ جملہ اس وقت کہتے ہو جب کہ علی کا ذکر پہلے آچکا ہو۔

(٦) تعظیم اور توہین کے لیے (ذکر کرتے ہیں) جب کہ لفظ تعظیم اور توہین کا فائدہ دیتا ہو، مثلاً تم سے پوچھنے والا پوچھے "هل رجع القائد" کیا سالار فوج لوٹ آئے؟ تو تم کہو "رجع المنصور أو المهزوم" بامراد لوٹا یا شکست خوردہ لوٹا۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں ذکر کے اسباب کو بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ جب ذکر اور حذف دونوں کے ضابطے متعارض ہو جائیں تو کن بنیادوں پر ذکر کے مقتضی کو ترجیح دی جائے گی، وہ اسباب چھ ہیں۔

۱ زیادتی توضیح کے لیے ذکر کرتے ہیں، یعنی کلام تو پہلے سے واضح ہے مگر مخاطب کے ذہن میں اس بات کو مزید ثابت اور راسخ کرنے کے لیے، مثلاً "أولئك على هدىً من ربِّهم و أولئك هم المفلحون" مثال مذکور میں محل استشهاد دوسرا "اولٰئك" ہے، اس لیے کہ اگر اسے نہ ذکر کیا جاتا اور صرف یہ کہا جاتا "وهم المفلحون" تب بھی مطلب یہی ہوتا کہ جو مؤمنین ہدایت پر ہیں وہی فلاح یافتہ بھی ہیں، مگر مزید وضاحت کے لیے "اولئك" کو لایا گیا ہے، تاکہ سامع کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ جو مؤمنین ہدایت یافتہ ہیں وہی فلاح پانے والے بھی ہیں۔

۲ قرینے پر کم اعتمادی کی بنا پر ذکر کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ قرینہ ضعیف ہے، یا اس وجہ سے ذکر کرتے ہیں کہ سامع کا ذہن کمزور ہے، اگر بغیر ذکر کیے ہوئے بیان کیا جائے تو سامع سمجھ نہیں سکے گا، مثلاً زید کا ذکر آجانے کے کافی دیر بعد کہنا "زيدٌ نعم الصديق" اس مثال میں محل استشهاد "زيدٌ" ہے جس کو لفظوں میں ذکر کیا گیا ہے باوجودے کہ زید کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس لیے قیاس اور ضابطے

کا تقاضہ یہ تھا کہ بجائے اسم ظاہر کے صرف اسم ضمیر لے آتے اور "**هو نعم الصديق**" کہتے، مگر چوں کہ ذکر کا زمانہ طویل ہو چکا ہے یا یہ کہ سامع کا ذہن اتنا کمزور ہے کہ اگر اسم ظاہر نہ لایا جائے تو مخاطب **هو** ضمیر کا مرجع زید کے بجائے کسی اور کو قرار دے دے گا، جس کی وجہ سے سارا مطلب غلط ہو جائے گا اس لیے اسم ظاہر لایا گیا۔

۳۔ سامع کی غباوت اور کند ذہنی پر اشارے اور کنائے سے چوٹ کرنے کے لیے بھی ذکر کرتے ہیں، جیسے "**عمر وقال كذا**" کہنا "**ماذا قال عمرو؟**" کے جواب میں، یہاں محل استشہاد پہلا "**عمرو**" ہے، اس لیے کہ جب سوال "**ماذا قال عمرو؟**" میں لفظ "عمرو" آچکا ہے تو جواب میں پھر "**عمرو**" لانے کی ضرورت نہیں تھی مگر چوں کہ لوگوں کو یہ بتلانا ہے کہ سامع بہت ہی غبی اور کند ذہن ہے، اگر دوبارہ پھر عمرو کو ذکر نہ کیا جائے تو سمجھ نہیں پائے گا، اس لیے پھر عمرو کو ذکر کیا۔

۴۔ سامع کے سامنے کلام کو پختہ کرنے کے لیے ذکر لاتے ہیں تاکہ پھر کبھی اسے انکار کی گنجائش نہ رہ جائے، مثلاً "**هل أقرّ زيد هذا بان عليه كذا**" کے جواب میں گواہ کا قول "**نعم زيد هذا أقرّ بأنّ عليه كذا**" مثال مذکور میں محل استشہاد دوسرا "**زید**" ہے جس کو اسم ظاہر کی شکل میں ذکر کیا گیا ہے، حالاں کہ اس سے پہلے حاکم کے سوال میں لفظ "زید" آچکا ہے گویا حذف کی صورت موجود ہے، اس لیے ضابطے کے تحت ہونا یہ چاہئے تھا کہ "**زید**" کو حذف کر کے صرف "**نعم**" یا "**نعم هو**" کہہ دیتا، مگر اسم ظاہر اس لیے لایا گیا، تاکہ سامع یہ نہ کہہ سکے کہ جواب میں زید کا نام نہیں لیا گیا تھا اس لیے میں نے کسی اور کو سمجھ لیا تھا تو انکار کو ختم کرنے کے لیے اسم ظاہر لایا گیا ہے۔

۵۔ تعجب کے لیے بھی ذکر لاتے ہیں، جیسے "**عَلِيٌّ يُقاوِمُ الأسدَ**" کہنا

جب کہ علی کا ذکر اس سے پہلے سوال "هل عليٌّ يقاوم الأسد؟" میں آچکا ہو، تو مثال مذکور میں جب علی کا ذکر پہلے سوال میں آچکا تھا تو ضابطہ یہ تھا کہ اب اس کو اسم ظاہر کی شکل میں نہ ذکر کیا جائے، مگر چوں کہ شیر سے مقابلہ ایک حکم نادر ہے، جو باعث تعجب ہے، اس لیے تعجب کے اظہار کے لیے اسم ظاہر لایا گیا۔

۶ تعظیم اور اہانت کے لیے ذکر لایا جاتا ہے، مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ لفظ سے تعظیم اور اہانت سمجھ میں آئے، جیسے "هل رجع القائد؟" کے جواب میں "رجع المنصور أو المهزوم" کہا جائے، اس مثال میں محل استشہاد لفظ "رجع المنصور" اور "المهزوم" ہے اس لیے کہ جب سوال میں رجع آگیا تھا تو اگر صرف نعم کہہ دیا جاتا تب بھی کافی تھا، مگر چوں کہ تعظیم اور توہین مقصود ہے، اس لیے ظاہر کیا گیا اور لفظ سے بھی تعظیم اور اہانت سمجھ میں آرہا ہے، چناں چہ لفظ "منصور" کے عنوان سے ذکر، تعظیم کا؛ اور "مہزوم" سے اہانت کا فائدہ دیتا ہے۔

ومِنْ دَواعِي الحَذْفِ ۱. إخْفاءُ الامرِ عَنْ غيرِ المُخاطَبِ نحوُ "أقْبَلَ" تُريدُ عليًا مثلاً.

۲. وتأتِّي الإنكارِ عِندَ الحَاجَةِ نحوُ "لئيمٌ، خسيسٌ" بعدَ ذِكرِ شخْصٍ معَيَّنٍ.

۳. والتَّنبيهُ على تعيِينِ المَحْذُوفِ وَلَوْ ادِّعاءً نحوُ "خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" و "وهَّابُ الألُوفِ".

٤. واخْتِبارُ تنبُّهِ السَّامعِ أو مِقدَارِ تنبُّهِهِ نحوُ "نورُهُ مُستَفَادٌ مِنْ نورِ الشَّمسِ وواسِطَةُ عِقْدِ الكَواكِبِ".

٥. وضِيقُ القامِ إمَّا لِتوَجُّعٍ نحوُ

قَالَ لِيْ كيفَ أنتَ قُلتُ عَلِيلٌ ☆ سَهَرٌ دائِمٌ وحُزْنٌ طَوِيلٌ

وإمَّا لِخوفِ فَواتِ فُرصَةٍ نحوُ قَولِ الصَّيَّادِ "غزال".

٦. والتَّعظِيمُ والتَّحقِيرُ لِصَونِهِ عنْ لِسانكَ أو صَونِ لِسانِكَ عنهُ ، فَالأوَّلُ نحوُ ''نُجُومُ سمَاءٍ'' والثَّاني نحوُ ''قومٌ إذا أكَلُوا أخفَوا حدِيثَهم''

٧. والمُحافَظَةُ علىٰ وزْنٍ أو سجعٍ فَالأوَّلُ نحوُ ؎

نحنُ بِمَا عِندَنَا وَأنتَ بِمَا عِندَكَ راضٍ والرَّأيُ مُختَلِف

والثَّاني نحوُ ''ماودَّعَكَ ربُّكَ ومَا قَلىٰ''

ترجمہ: اور حذف کے اسباب میں سے

۱ مخاطب کے علاوہ دوسروں سے بات کو چھپانا، جیسے ''أقبل''(وہ آگیا) تم مثال کے طور پر ''علی'' کو مراد لے رہے ہو۔

۲ بوقت ضرورت انکار کی گنجائش کے لیے (حذف کرتے ہیں) جیسے ''لئیم ، خسیس'' (کمینہ ہے، نالائق ہے) کسی معین شخص کے ذکر کرنے کے بعد

۳ محذوف کی تعیین پر تنبیہ کرنے کے لیے اگرچہ دعوے کے طور پر ہو، جیسے ''خالِق کلِّ شيءٍ'' (ہر چیز کا پیدا کرنے والا) وھّاب الألوف (ہزاروں کی بخشش کرنے والا)

۴ سامع کی عقل یا عقل کی مقدار جانچنا، جیسے نورہُ مستفادٌ من نور الشمس وواسطةُ عِقدِ الكواكب (اس کی روشنی سورج کی روشنی سے حاصل شدہ ہے اور وہ ستاروں)

۵ وقت کی تنگی کی وجہ سے (حذف کرتے ہیں، یا تو تکلیف کی بنیاد پر جیسے یہ شعر ؎

قال لي كيف أنت قلت عليلٌ سهرٌ دائمٌ وحزنٌ طويلٌ

(اس نے مجھ سے کہا تم کیسے ہو میں نے کہا بیمار ہوں، مسلسل بے خوابی اور دائمی غم کی شکایت ہے)

اور یا موقع کے فوت ہو جانے کے اندیشے سے، جیسے شکاری کا قول ''غزال''

ہرن ہے۔

٦ تعظیم اور تحقیر کے لیے (حذف کرتے ہیں) تعظیم کے وقت محذوف کے ذکر کو اپنی زبان سے یا محذوف کے ذکر سے اپنی زبان کو محفوظ رکھنے کے لیے، تعظیم کی مثال، جیسے "نجوم سماء" (آسمان کے ستارے) اور تحقیر کی مثال جیسے قومٌ إذا أکلوا أخفوا حدیثھم (یہ ایسے لوگ ہیں جب کھاتے ہیں تو باتیں آہستہ کرتے ہیں)

٧ وزن یا سجع کی رعایت کے لیے (حذف کرتے ہیں) پس وزن کی مثال جیسے "نحن بما" ـــ

ہم اپنی رائے سے (خوش ہیں) اور تم اپنی رائے سے خوش ہو اور رائیں مختلف ہیں۔

اور سجع کی مثال، جیسے ما ودَّعَكَ ربُّكَ ومَا قلٰی (نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ ہی دشمنی کی)

تشریح: گزشتہ صفحات میں ذکر کے اسباب کا بیان ہوا اور اب یہاں سے حذف کے اسباب کو بیان کیا جارہا ہے، حذف کے کل اسباب دس ہیں جن میں:

پہلا سبب: مخاطب کے علاوہ سے بات کا چھپانا ہے، یعنی یہ کہ اگر اس اسم کو ظاہر کیا جائے تو تمام سامعین کو اس کا علم ہوجائے گا، جب کہ متکلم کا مقصد یہ ہے کہ مخاطب کے علاوہ کسی اور کو اس کا پتہ نہ چلے، جیسے "أقبل" وہ آگیا، اس مثال میں اسم ظاہر جو کہ فاعل واقع ہے اسے محذوف رکھا گیا ہے، تا کہ اوروں کو معلوم نہ ہوسکے اور مخاطب کو تو قرینے سے اس کا علم ہے ہی، کہ اس کا فاعل "علی" یا کوئی اور ہے جس کو متکلم مراد لے رہا ہو۔

دوسرا سبب: ضرورت کے وقت انکار کی گنجائش کا باقی رکھنا ہے، جیسے "لئیم ، خسیسٌ" کہنا جب کہ اس سے پہلے کسی متعین شخص کا ذکر آچکا ہو، تو مثال

مذکور میں لئیم خسیس کا محکوم علیہ وہ شخص معین مذکور ہے، مگر اسے محذوف رکھا گیا ہے، تا کہ اگر وہ یہ کہنے لگے کہ مجھے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ تو یہ کہا جا سکے کہ کب میں نے تمہارا نام لے کر کہا ہے۔

تیسرا سبب: محذوف کے متعین ہونے پر تنبیہ کرنا ہے، یعنی یہ بتلانے کے لیے حذف کرتے ہیں کہ مخاطب اس قدر متعین ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے، خواہ یہ حقیقتاً ہو کہ متکلم نے جو صفت بیان کی وہ صرف مخاطب محذوف ہی کے لیے ہے اور کوئی دوسرا اس کے لائق ہے ہی نہیں، یا ادّعاءً ہو یعنی کہ متکلم نے جو صفت بیان کی ہے وہ مخاطب محذوف ہی کا حق ہے، تعیین حقیقی کی مثال، جیسے "**خالق کل شئ**" مثال مذکور میں "**الله خالق کل شئ**" نہیں کہا گیا؛ بل کہ صرف "**خالق کل شئ**" کہا گیا، اور محکوم علیہ لفظ "اللہ" کو حذف کر دیا گیا، اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ محذوف متعین ہے اور وہ "اللہ" ہے اس کے علاوہ کوئی اور اس صفتِ خلق کے لائق ہے ہی نہیں اور ادّعائی کی مثال، جیسے "**وهّاب الألوف**" اس مثال میں بھی متکلم نے محکوم علیہ "**السلطان**" کو حذف کر دیا ہے، یہ دعویٰ کرنے کے لیے کہ یہ سلطان ہی کا حق ہے، گویا وہی متعین ہے، گرچہ دوسرا بھی اس صفت سے متصف ہو سکتا ہے۔

چوتھا سبب: سامع کی دانش مندی اور ہوشیاری کا امتحان لینے یا اس کے دانش مندی کی سطح جاننے کے لیے حذف کرنا، مثلاً "**نوره مستفاد من نور الشمس الخ**" مثال مذکور میں محل استشہاد لفظ نورہ ہے اصل میں "**نور القمر مستفاد**" ہے، لیکن **القمر** کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لایا گیا ہے، یہ جاننے کے لیے کہ آیا سامع اپنی دانش مندی سے اس کو سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔

پانچواں سبب: تنگیٔ وقت ہے پھر یہ وقت کی تنگی کبھی تو درد اور تکلیف کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی موقع و محل کے ہاتھ سے چلے جانے کے خطرے سے ہوتی

ہے، دردوتکلیف کی مثال جیسے شاعر کا شعر:

قال لي كيفَ أنتَ قلتُ عليلٌ سهرٌ دائمٌ وحزنٌ طويلٌ

لغات: عليلٌ بیمار۔ علَّ يعلُّ عِلَّةً (ض) بیمار ہونا۔ سَهِر يسهَرُ سهرًا (س) بیدار رہنا۔ دامَ يدُومُ دوامًا (ن) ہمیشہ رہنا۔ حزِنَ يحزَنُ حُزنًا (س) غمگین ہونا۔

ترکیب: قال فعل بافاعل، لي متعلق بہ قال فعل بافاعل ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ قول، كيف استفہامیہ مبتدا، أنت خبر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ شدہ، مقولہ، قول بامقولہ جملہ قولیہ، قلتُ فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ قول، عليلٌ خبر۔ مبتدائے محذوف أي أنا عليلٌ، ''سهرٌ دائمٌ'' موصوف باصفت معطوف علیہ، واو عاطفہ ''حزنٌ طويلٌ'' موصوف باصفت معطوف، معطوف علیہ بامعطوف مبتدا موخر، لي محذوف سے متعلق ہوکر خبر مقدم۔

شعر مذکور میں محل استفہام ''عليلٌ'' ہے، جواصل میں ''أنا عليلٌ'' تھا شاعر نے ''كيف أنت'' کے جواب میں صرف خبر پر اکتفا کیا ہے، اور مبتدا ''أنا'' کو حذف کردیا ہے، اس کا سبب دردوتکلیف ہے جس کی وجہ سے وہ زیادہ کلام نہیں کرنا چاہتا۔ اور موقع ومحل کے فوت ہونے کی مثال، جیسے شکاری کا قول ''غزال'' (ہرن) مثال مذکور میں متکلم نے شکاری سے صرف ''غزال'' کہا ہے یعنی خبر ذکر کی ہے اور مبتدا کو حذف کردیا ہے، اصل میں ''هذا غزال'' تھا، اس کا سبب محض موقع ومحل کی نزاکت کی وجہ سے وقت کا تنگ ہونا ہے اگر اس موقع پر طویل کلام کرتا تو ممکن تھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

چھٹا سبب: تعظیم اور تحقیر کے لیے حذف کرنا، تعظیم کے لیے حذف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محذوف اتنا قابل احترام ہے کہ میری زبان اس قابل نہیں کہ اس مقدس شئ کا ذکر اس پر لایا جائے، جیسے نجوم سماء (آسمان کے ستارے)

اصل میں "هم نجوم سماءٍ" تھا، "هم" مسندالیہ کو حذف کردیا ہے، اور صرف مسند کو ذکر کیا ہے یہ بتلانے کے لیے کہ وہ ایسے مقدس لوگ ہیں جن کا ذکر اپنی گندی زبان پر لانا گویا ان کی بےعزتی کرنا ہے۔

اسی طرح کبھی کسی شئی کی حقارت ورذالت کے لیے حذف کرتے ہیں کہ محذوف اتنا کمینہ اور نالائق ہے کہ اپنی زبان پر اس کا نام لانا گویا زبان کو بھی خراب کرنا ہے، جیسے قومٌ إذا أكلوا أخفوا حديثهم (یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کھاتے ہیں تو باتیں آہستہ کرتے ہیں)۔

مصرع مذکور میں شاعر نے کسی قوم کے بخل کو بیان کیا ہے کہ وہ اتنے بخیل لوگ ہیں کہ جب کھانا کھاتے ہیں تو بہت ہی پست آواز سے بات کرتے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آواز سن کر کھانے کے لیے آجائے ایسے بخیل لوگوں کے تذکرے سے زبان کو بچالے کے لیے شاعر نے مبتدا "هم" کو حذف کردیا ہے، اصل میں هم قوم الخ تھا۔

ساتواں سبب: وزنِ شعر اور سجع کی رعایت کے لیے حذف کرنا ہے، وزن شعر کی مثال، جیسے ؎

نحن بما عندنا وأنت بما عندك راض والرّأيُ مختلف

لغات: رضيَ يرضى رِضىً (س) راضی ہونا، خوش ہونا؛ رأيٌ (ج) آراء، رائے، مشورہ۔

ترکیب: نحن مبتدا، باجارہ، ما موصولہ، عندنا مضاف با مضاف الیہ مفعول فیہ ثبت فعل محذوف کا، فعل بافاعل ومفعول بہ صلہ، موصول با صلہ مجرور ہوکر متعلق ہوا، راضون محذوف کے، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا، یہی ترکیب أنت بما عندك راضٍ کی ہے، واو مستانفہ "الرّأي" مبتدا "مختلف" خبر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور اصل میں "نحن بما عندنا راضون" تھا "راضون" خبر کو حذف کردیا اس لیے کہ اگر خبر کو ذکر کرکے یوں کہتے "نحن بما عندنا راضون وأنت بما عندك راضٍ" تو ایسی صورت میں شعر کا وزن باقی نہ رہتا، ایک مصرع دوسرے کے مقابلے میں طویل ہوجاتا۔

دوسری چیز سجع کو لیے حذف کرنا ہے، سجع مقفّٰی عبارت کو کہتے ہیں، علم بدیع کی اصطلاح میں سجع ایسی عبارت کو کہتے ہیں جن کے جملوں کے آخری کلمات ہم قافیہ ہوں، یا بصورتِ ہم قافیہ ہوں، یہ نثر میں ہوتا ہے، جیسے "ماودّعك ربك وماقلىٰ" جوکہ اصل میں "وماقلاك" تھا، ضمیر مفعول کو رعایتِ سجع سابق ولاحق کی وجہ سے حذف کردیا، سجعِ سابق "والليل إذا سجى" ہے اور سجع لاحق "خير لّك من الأولىٰ" ہے، دونوں آیتوں کا اختتام الف مقصورہ پر ہے، اگر حذف نہ کرتے تو یہ یکسانیت برقرار نہ رہتی۔

٨. والتَّعميمُ بِاختِصارٍ نحوُ "واللّٰهُ يدعُو إلىٰ دارِ السلامِ" أي جميعَ عِبادِهِ، لِأنَّ حذفَ المعمولِ يوذِنُ بِالعُمومِ.

٩. والأدب نحوُ قولِ الشاعر ؎

قَدْ طَلَبْنا فَلَمْ نجِدْ لكَ فِيْ السُّؤ | دَدِ والمجدِ والمَكارِمِ مثلاً

١٠. وتنزيلُ المُتعدِّىْ منزلةَ اللّازمِ لِعدَمِ تعلُّقِ الغَرضِ بِالمعمُولِ نحوُ "هل يستوِىْ الَّذين يعلَمُونَ والَّذين لايعلَمونَ"

ويُعدُّ منَ الحذفِ إسنادُ الفِعلِ إلىٰ نائبِ الفاعِلِ فيُقالُ حُذِفَ الفاعِلُ للخَوفِ منهُ أو عليهِ أو للعِلمِ أو للجهلِ "نحوُ سُرِقَ المتاعُ" و "خُلِقَ الإنسانُ ضعيفًا".

ترجمہ: اور اختصار کے ساتھ عموم پیدا کرنا ہے، جیسے "والله يدعُو إلى دار السلام" (اور اللہ تعالیٰ دارالبقا (جنت) کی طرف بلاتا ہے) یعنی تمام

بندوں کو۔اس لیے کہ معمول کا حذف کرنا عموم کا فائدہ دیتا ہے۔
(۹) ادب کے لیے (حذف کرتے ہیں) جیسے شاعر کا شعر **قد طلبنا الخ**
ہم نے تلاش کیا، تو ہم نے تمہاری طرح کسی کو سرداری، بزرگی اور اخلاق حسنہ میں نہیں پایا۔
(۱۰) متعدی کو لازم کے درجے میں اتارنے کے لیے حذف کرتے ہیں) معمول کے ساتھ غرض کے متعلق نہ ہونے کی وجہ سے، جیسے "**هل يستوى الَّذينَ يعلمُون والّذين لايعلمون**" کیا اہل علم اور ناخواندہ برابر ہوسکتے ہیں اور حذف (کے اسباب) میں سے فعل کا نائب فاعل کی طرف اسناد شمار کیا جاتا ہے، چناں چہ کہا جاتا ہے کہ فاعل کو حذف کیا گیا فاعل سے، یا فاعل پر خوف کی وجہ سے، یا فاعل کو جاننے، یا نہ جاننے کی وجہ سے، جیسے "**سُرِقَ المتاعُ**" سامان کی چوری ہوگئی "**وخُلِقَ الانسانُ ضعيفًا**" انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔
تشریح: ماقبل میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حذف کے اسباب دس ہیں، جن میں سے سات کا بیان تو گزر چکا اور بقیہ تین اسباب کا بیان یہاں سے کیا جارہا ہے، چناں چہ فرماتے ہیں کہ
آٹھواں سبب: یہ ہے کہ فعل اور متعلقات فعل کو عام کرنے کے لیے بھی حذف کرتے ہیں، مثلاً "**واللّٰهُ يدعُوْ الىٰ دارِ السلامِ**" میں "**يدعو**" کا مفعول "**جميعَ عِبادِهٖ**" کو حذف کردیا گیا، تاکہ یدعو کا حکم تمام بندوں کے لیے عام ہوجائے، اگر مفعول کو ذکر کردیا جاتا تو تعمیم کا معنی تو پالیا جاتا مگر اختصار فوت ہوجاتا
نواں سبب: ادب کی وجہ سے حذف کرنا ہے، جیسے ؎

قد طلبنا فلم نجد لك في السّؤ   دَدِ والمجد والمكارم مثلاً

لغات: **سادَ يسودُ سِيادةً** (ن) سردار ہونا، **مجدٌ** (ج) **أمجادٌ**

بزرگی مجَدَ یمجُدُ مجدًا (ک) بزرگ ہونا، مَکارِمُ (واحد) مکرُمۃٌ شریفانہ اخلاق، اچھا وصف۔

ترکیب: قد طلبنا فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر معطوف علیہ، فا عاطفہ، "لم نجد" فعل بافاعل، "لكَ" متعلق اول بہ لم نجد، في جارہ، "السؤدد" معطوف علیہ، واو حرف عطف، "المجد" معطوف علیہ معطوف، واو عاطفہ "المكارم" معطوف، معطوف علیہ اپنے دونوں معطوفات سے مل کر مجرور ہوکر متعلق ثانی لم نجد کا، مثلاً مفعول بہ فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ معطوفہ ہوا، اصل میں "طلبنا مثلاً" تھا، مگر ممدوح کے ادب کے خیال سے مثلا کو حذف کردیا گیا۔

دسواں سبب: فعل متعدی کو اس کے معمول کے ساتھ کوئی خاص غرض وابستہ نہ رہنے کی وجہ سے فعل لازم کے درجے میں اتار کر معمول کو حذف کر دینا ہے، یعنی کسی فعل متعدی کے مخصوص مفعول کی کبھی ضرورت نہیں رہتی ہے، لہٰذا اسے حذف کردیا جاتا ہے اور اسے فعل لازم تصور کرلیا جاتا ہے، جیسے "هل يستوى الذين يعلمون والذين لايعلمون".

آیت کریمہ میں "يعلمون" اور "لايعلمون" دونوں فعل متعدی ہیں جو مفعول کو چاہتے ہیں، مگر یہاں مفعول کو حذف کردیا گیا ہے، اور وہ لفظ "الدين" ہے یعنی علم دین سے واقف اور ناواقف برابر نہیں ہوسکتے بل کہ ہمیشہ علم دین سے واقف شخص دوسرے کے مقابلے میں افضل رہے گا، خواہ وہ علم دین کے علاوہ دیگر تمام علوم کا ماہر ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ دیگر تمام علوم اخروی سعادت کا باعث نہیں بن سکتے، لہٰذا جب علم سے "علم دین" متعین ہوگیا تو اب اس کے ذکر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی اور اسی وجہ سے فعل متعدی کو فعل لازم کے درجے میں اتارلیا گیا، اور آیت مذکورہ "هل يستوى الَّذينَ وُجِدَلهُمْ معنَى العِلمِ

الدِّيني و الَّذينَ لم يُوجَدْ لهُمْ ذٰلك" کے معنی میں ہوگئی۔

ویعدّ من الحذف الخ: یہاں سے مصنفین فرماتے ہیں کہ حذف کے اسباب میں سے یہ بھی شمار کیا جاتا ہے، کہ فعل کی نسبت فاعل کے بجائے نائب فاعل کی طرف کردیا جائے، فاعل سے خوف کی وجہ سے، یا فاعل پر خوف کی وجہ سے، یا فاعل کو جاننے، یا نہ جاننے کی وجہ سے، جیسے "سُرِقَ المتاعُ" سامان کی چوری ہوگئی، مثال مذکور میں فعل کی نسبت نائب فاعل کی طرف کی گئی ہے، یا تو اس وجہ سے کہ فاعل سے خوف ہے کہ اگر فاعل کا ذکر کریں تو اندیشہ ہے کہ کوئی نقصان پہنچادے، یا اس وجہ سے ذکر نہیں کیا کہ اگر ذکر کردیا جائے تو فاعل پر کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، یا اس لیے ذکر نہیں کیا کہ چور ایک ہی شخص ہے اور وہ سبھی کو معلوم ہے، یا چوتھی صورت حذف کی یہ ہے کہ فاعل معلوم ہی نہیں ہے، یہی ایک مثال چاروں شکلوں پر منطبق ہوجائے گی، اور جیسے "خلق الإنسان ضعيفا" یہ مثال صرف تیسری شکل سے متعلق ہے کہ فاعل معلوم ہے اس لیے ذکر نہیں کیا اور وہ اللہ رب العزت ہے، اور متعین اس لیے ہے کہ خالق کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

البابُ الثالِث في التّقديمِ والتّأخِيرِ

مِنَ المَعْلومِ أنَّهُ لايُمكِنُ النُّطقُ بأجزاءِ الكلامِ دفعةً واحِدَةً، ولابُدَّ من تقدِيمِ بعضِ الأجزاءِ وتأخيرِ البَعْضِ، وليسَ شيٌ مِنهَا في نفسِهِ أولٰى بالتَّقدِيمِ منَ الآخرِ لاشْتِراكِ جمِيع الألفاظِ منْ حيثُ هِيَ ألفَاظٌ في دَرَجةِ الاعْتِبارِ، فلابُدَّ مِنْ تقدِيمِ هٰذا على ذاكَ مِنْ داعٍ يُوجِبُهُ.

فمِنَ الدَّواعِي

١ . التَّشوِيقُ إلى المتأخِّرِ إذا كانَ المُتقَدِّمُ مُشعِرًا بغرابَةٍ، نحوــ

والَّذِي حارتِ البَرِيَّةُ فيهِ حيَوانٌ مُسْتَحْدَثٌ مِن جمَادِ

٢. وتعْجِيلُ المسَرَّةِ أو المساءَةِ نحوُ "العفوُ عنكَ صَدَرَ بهِ الأمرُ" أوِ "القِصاصُ حكَمَ بهِ القاضِيْ".

٣. وكونُ المُتقدِّمِ محطَّ الإنكارِ والتَّعجُّبِ، نحوُ "أبَعدَ طُولِ التَّجربَةِ تنخَدِعُ بهٰذِهِ الزَّخارِفِ".

٤. وسُلُوكُ سَبِيلِ التَّرقِّي أي الإتيانُ بِالعامِّ اوَّلاً ثُمَّ الخَاصِّ بعدَهُ، لأنَّ العَامَّ إذا ذُكِرَ بعدَ الخاصِّ لايكونُ له فائدَةٌ نحوُ "هٰذا الكلامُ صحيحٌ فصيحٌ بليغٌ" فإذا قُلتَ: فصيحٌ بليغٌ، لاتحتَاجُ إلىٰ ذِكرِ صحيحٍ وإذا قلتَ: بَليغٌ لاتحتَاجُ إلىٰ ذكرِ صحيحٍ ولافصيحٍ.

تیسرا باب تقدیم وتاخیر کے بیان میں

یہ بات معلوم ہے کہ کلام کے تمام اجزاء کے ساتھ گفتگو ایک ہی دفعہ ممکن نہیں ہے، بل کہ بعض اجزاء کا مقدم کرنا اور بعض کا مؤخر کرنا ضروری ہے اور اجزائے کلام میں سے کوئی بھی جز بذات خود دوسرے سے تقدیم کا مستحق نہیں ہے، تمام الفاظ کے درجۂ اعتبار میں بحیثیت الفاظ مساوی ہونے کی وجہ سے، لہٰذا ضروری ہے۔ اس جز کے اُس جز پر مقدم ہونے کے لیے کسی سبب کا ہونا جو اس (تقدیم) کا سبب بنے، پس تقدیم وتاخیر کے اسباب میں سے:

(۱) بعد میں آنے والے لفظ کے بارے میں شوق دلانا ہے، جب کہ پہلے آنے والا لفظ کسی حیرت انگیز چیز کو بتلانے والا ہو، جیسے والّذي حارت الخ۔

وہ چیز جس میں مخلوق حیران ہوگئی ہے ایک جان دار ہے جو بے جان چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

(۲) خوش کن یا رنج دہ امر کو جلد بیان کرنا، جیسے "العفو عند صدر به الأمر" تیرے حق میں معافی کا فیصلہ صادر ہوا ہے، یا "القصاص حکم به

القاضي" قاضی نے قصاص کا فیصلہ کیا ہے۔

(۳) مقدم کیے جانے والے لفظ کا محل انکار و تعجب ہونا، جیسے "أبعد طول التجربة تنخدع بهٰذه الزخارف" کیا اتنے طویل تجربوں کے بعد بھی تم ان مصنوعی اور بناوٹی چیزوں سے دھوکا کھا جاتے ہو۔

(۴) (تقدیم و تاخیر کے اسباب میں سے ہے) ترقی کے راستے پر چلنا یعنی عام کو پہلے لانا، پھر اس کے بعد خاص کو، کیوں کہ عام جب خاص کے بعد ذکر کیا جائے، تو عام کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، جیسے "هٰذا الكلام صحيحٌ فصيحٌ بليغٌ" یہ کلام صحیح، فصیح، بلیغ ہے، تو جب تم نے "فصيحٌ بليغٌ" کہا تو "صحيحٌ" کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، اور جب تم نے "بليغٌ" کہا تو "صحيحٌ" اور "فصيح" کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

تشریح: اس تیسرے باب میں تقدیم و تاخیر سے متعلق مضامین بیان کیے جارہے ہیں، عبارت بالا میں جو کچھ بیان ہوا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جب بھی کوئی بات کہتا ہے، یا کوئی مضمون بیان کرنا چاہتا ہے تو اس مضمون کے تمام الفاظ کو ایک ساتھ بیان نہیں کرسکتا؛ بل کہ لامحالہ اسے بعض الفاظ کو مقدم اور بعض کو مؤخر کرنا پڑتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کن الفاظ کو مقدم اور کن کو مؤخر کیا جائے، ظاہر ہے کہ الفاظ بحیثیت الفاظ بالکل برابر ہیں، یعنی یہ کہ اگر الفاظ میں ان معانی کو پیش نظر نہ رکھا جائے، جو صدارت کلام کو چاہتے ہیں تو تمام الفاظ درجۂ اعتبار میں یکساں ہیں، اس لیے بعض اجزاء کو دوسرے بعض اجزاء پر مقدم کرنے کے لیے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے، کیوں کہ اگر بغیر سبب کے بعض کو مقدم اور بعض کو مؤخر کیا جائے، تو ایسی صورت میں ترجیح بلا مرجح لازم آئے گا، اور یہ جائز نہیں ہے، عبارت بالا میں تقدیم و تاخیر کے اسباب کو بیان کیا گیا ہے، کل اسباب نو بیان کیے گیے ہیں، جن میں:

پہلا سبب: التشويق إلى المتأخر: بعد میں آنے والے کے بارے

میں شوق دلانا جب کہ امر متقدم کسی ندرت اور حیرت انگیز چیز کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ جس کی وجہ سے سامع کے دل میں بعد میں آنے والے کو سننے کا شوق پیدا ہو جائے اور ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ شوق اور طلب کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ بہت جلد ذہن نشین ہو جاتی ہے بہ نسبت اس چیز کے جو بغیر شوق اور انتظار کے حاصل ہو، جیسے ابو العلاء معری کا قول: ؎

والذي حارت البرية فيه　　　حيوان مستحدث من جماد

لغات: حارَ يَحارُ حيرةً وحيرانًا (س) حیران ہونا؛ بَرِيَّةٌ (ج) بَرَايا مخلوق، استحدث استحداثا پیدا کرنا۔

ترکیب: واو مستانفہ، الذي اسم موصول، حارت فعل، البرية فاعل، فيه جار مجرور سے مل کر حارت سے متعلق ہوا، فعل با فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلہ، موصول باصلہ مبتدا، حيوانٌ موصوف، مستحدثٌ صیغۂ صفت، من جارہ، جماد مجرور جار مجرور متعلق بہ صیغہ صفت ہو کر صفت، موصوف باصفت خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

شعر مذکور میں پہلا مصرع ''والذي حارت البرية فيه'' کو سنتے ہی مخاطب کے دل میں یہ جاننے کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، کہ آخر وہ کون سی چیز ہے جس کے بارے میں پوری مخلوق حیران ہے، اس لیے اس مصرعے کو مقدم اور ''حيوان مستحدث من جماد'' کو مؤخر کیا گیا۔

حیوان مستحدث کی تفسیر بعض حضرات نے حضرت آدم علیہ السلام سے کی ہے اور بعض نے حضرت صالح ﷺ کی اونٹنی سے، جب کہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اژدہا مراد ہے، اور کچھ حضرات کا تو خیال یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جسم ہے جو فنا کے بعد قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا، واللہ اعلم۔

دوسرا سبب: تعجیل المسرة أو المساءة خوشی یا رنج کو جلد بیان کرنے کے لیے مقدم اور مؤخر کرنا، یعنی اگر خوشی کی خبر کو جلد بیان کرنا ہوتو خوشی کے الفاظ کا مقدم کرنا اور اگر رنج دہ خبر کو بیان کرنا ہوتو رنج کے الفاظ کو مقدم کرنا، جیسے ''العفو عنك صدر به الأمر'' تیری معافی کا حکم صادر ہوگیا، مثال مذکور میں چوں کہ خوشی کو جلد بیان کرنا تھا، اس لیے ''العفو عنك'' کو مقدم کیا گیا تا کہ اس شخص کو جلد خوش کیا جائے جو اپنے بارے میں کسی فیصلے کا منتظر ہے، برخلاف اس کے کہ اگر خبر دینے والا شخص مبادیات میں لگتا اور یوں کہتا کہ آج جو آپ کی مقدمے کا فیصلہ ہونا تھا اس کے لیے جج صاحب کمرۂ عدالت میں تشریف لائے، مجمع بے انتہا تھا، ہر ایک کی نظر جج کے فیصلے پر تھی، بالآخر مجمع عام کے درمیان جج نے آپ کی معافی کا فیصلہ سنایا وتو اس صورت میں بھی خوشی ہی کی خبر ہوتی مگر شدید انتظار کے بعد جب کہ مبادیات سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

اسی طرح رنج دہ خبر کے الفاظ کو مقدم کرنا تعجیل مساءۃ میں، جیسے ''القصاص حکم به القاضي'' اس مثال میں لفظ ''القصاص'' کو مقدم کیا گیا ہے، تا کہ اس لفظ کو سنتے ہی مجرم کو تکلیف پہنچے اور یہ صورت عموماً ایسے موقع پر ہوتی ہے جب کہ مخبر مجرم کا بدخواہ ہو، کیوں کہ مخبر اس طرح کے الفاظ کو مقدم کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔

تیسرا سبب: کون المتقدم محط الإنکار: پہلے والے لفظ کا محل انکار وتعجب ہونا یعنی جس لفظ کو پہلے بیان کیا گیا ہے، اس سے انکار اور تعجب ہو، جیسے ''ابعد طول التجربة تنخدع بهٰذه الزخارف'' مثال مذکور میں لفظ ''أبعد طول التجربة'' کو مقدم کر کے اظہار تعجب کیا جارہا ہے، کہ تعجب ہے تمہارے اوپر تم اتنے ہوشیار اور ذہین ہو اور طویل تجربہ بھی رکھتے ہو، پھر کیسے اس ظاہری چمک دمک سے دھوکا کھا گئے۔

چوتھا سبب: سلوك سبيل الترقي: ترقی کے راستے پر چلنا یعنی الفاظ کو اس طرح بیان کرنا کہ پہلے عام لانا پھر خاص لانا، کیوں کہ عام کے بعد جب خاص کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور خاص کے بعد عام کو لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جیسے "هذا الكلام صحيح، فصيح، بليغ" مثال مذکور میں لفظ "صحيح" عام ہے، جو "فصيح وبليغ" دونوں کو شامل ہے، اسی طریقے پر لفظ "فصيح" "بليغ" کے مقابلے میں عام ہے، اور یہاں صحیح کا تقدم اور فصیح و بلیغ کا تاخر ایضاح بعد الابہام کا فائدہ دیتا ہے، لیکن اگر "فصيح" کو مقدم کر دیا جائے تو پھر "صحيح" کے ذکر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، ایسے ہی اگر "بليغ" کو مقدم کر دیا جائے تو پھر "صحيح" اور "فصيح" دونوں کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی اور نہ ہی ان کا کوئی فائدہ ہوگا۔

٥. ومُراعاةُ التَّرتيبِ الوجوديْ نحوُ "لاتأخُذُهٗ سِنةٌ ولانَومٌ"

٦. والنَّصُّ على عُمومِ السَّلبِ أو سلبِ العَمومِ ، فالأولُ يكُونُ بتَقْديمِ أداةِ العُمومِ على أداةِ النَّفْيِ ، نحوُ "كُلُّ ذٰلكَ لَمْ يكُنْ" أيْ لم يقَعْ هٰذا ولاذَاك ، والثَّانيْ يكُونُ بِتقدِيمِ أداةِ النَّفيِ على أداةِ العمُومِ ، نحوُ "لَمْ يكُنْ كلُّ ذٰلكَ" أيْ لم يقَع المَجمُوعُ ؛ فيحْتَمِلُ ثُبُوتَ البَعضِ ويَحْتمِلُ نفْيَ كُلِّ فردٍ .

٧. وَتَقْوِيَةُ الحُكمِ إذَا كَانَ الْخبَرُ فِعْلاً نَحوُ "اَلْهِلَالُ ظَهرَ" وذٰلكَ لِتكْرَارِ الْإِسْنَادِ .

٨. والتَّخصيصُ نحوُ "مَا أنا قُلتُ" و "إيَّاكَ نعبُدُ"

٩. والمُحافَظَةُ علىٰ وزْنٍ أوْ سجَعٍ ، فالاوَّلُ نحوُ

إذا نطَقَ السَّفِيهُ فَلَا تُجِبْهُ فخيرٌ مِنْ إجابَتِهِ السُّكُوتُ

والثَّانِي نحوُ "خُذُوهُ فغُلُّوهُ ثمَّ الجَحِيمَ صلُّوهُ ثمَّ فِي سِلسِلةٍ ذرعُها سبعُونَ ذِراعًا فاسْلُكُوهُ".

ولَمْ يُذْكَرْ لِكُلٍّ مِنَ التَّقدِيمِ والتَّاخِيرِ دوَاعٍ خاصَّةً، لِأنَّهُ إذا تقدَّمَ أحدُ رُكْنَيِ الجُملةِ تأخَّرَ الآخرُ ، فهُمَا مُتلازِمان .

ترجمہ: (۵) ترتیب وجودی کی رعایت کے لیے (تقدیم وتاخیر کرتے ہیں) جیسے "لاتاخُذُهُ سِنَةٌ وَّلانَومٌ" نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

(۶) عموم سلب یا سلب عموم کی صراحت کے لیے، تو اول (عموم سلب) ادات عموم کے ادات نفی پر تقدیم کے ذریعے ہوتی ہے، جیسے "کُلُّ ذٰلِكَ لم يكُنْ" کچھ بھی نہیں ہوا یعنی نہ یہ ہوا اور نہ وہ ہوا، اور دوم (سلب عموم) ادات نفی کے اداۃ عموم پر تقدیم کے ذریعہ ہوتی ہے، جیسے "لم يكن كلّ ذلك" مکمل نہیں ہوا، یعنی مجموع نہیں واقع ہوا، تو یہ بعض کے ثبوت کا بھی احتمال رکھتا ہے اور ہر فرد کے نفی کا بھی۔

(۷) حکم کی تقویت کے لیے (تقدیم وتاخیر کرتے ہیں) جب کہ خبر فعل ہو، جیسے "الھلال ظهر" (چاند نکل آیا) اور یہ اسناد کے تکرار سے حاصل ہوتی ہے۔

(۸) تخصیص کے لیے، جیسے "ما أنا قلت" (میں نے نہیں کیا) "إيّاكَ نعبد" (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں)

(۹) وزن یا سجع کی رعایت کے لیے تو اول، جیسے إذا نطَقَ السَّفيهُ الخ: جب کوئی احمق شخص بات کہے تو اس کا جواب مت دو کیوں کہ اس کو جواب دینے سے بہتر چپ رہنا ہے۔

اور دوسرا جیسے "خُذُوهُ فغُلُّوهُ ثُمَّ الجَحِيمَ صلُّوهُ ثُمَّ فِي سِلسِلَةٍ ذَرعُهَا سبعُونَ ذِراعًا فاسْلُكُوهُ" اسے پکڑو، پھر اس کے گلے میں طوق ڈال دو، پھر اسے دہکتی آگ میں داخل کردو، پھر ایسی زنجیر میں جس کا ناپ ستر ہاتھ ہے

اسے جکڑ دو۔

اور تقدیم وتاخیر میں سے ہر ایک کے لیے خاص اسباب نہیں بیان کیے گئے، کیوں کہ جملے کے دوارکان میں سے جب کوئی ایک مقدم ہوگا تو دوسرا (خودبخود) مؤخر ہوگا، اس لیے کہ یہ دونوں متلازم ہیں۔

تشریح: پانچواں سبب: مراعاة الترتيب الوجودي: ترتیب وجودی کی رعایت کے لیے تقدیم وتاخیر کرنا ہے، یعنی موجود ہونے کی ترتیب کالحاظ کرنا، اس لیے کہ وجود میں جو چیز مقدم ہوتی ہے اسے لفظ میں بھی مقدم کرتے ہیں، تاکہ وجود خارجی اور وجود لفظی میں مطابقت ہوجائے، جیسے "لا تأخذه سنة ولانوم" (نہ تو اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

آیت کریمہ میں ترتیب وجودی ہے، اس طریقے سے کہ "سنةٌ" کو "نومٌ" سے پہلے لایا گیا ہے، کیوں کہ "سنة" یعنی اونگھ اور غنودگی "نوم" پر وجود میں مقدم ہے، اس لیے کہ "سنة" اس حالت کو کہتے ہیں جو نیند سے قبل ہوتی ہے۔

چھٹا سبب: النص على عموم السلب او سلب العموم: عموم سلب یا سلبِ عموم کی صراحت کرنا یعنی جب کسی کلام میں ادات عموم اور ادات نفی جمع ہوجائیں تو اس کا تعیین کرنا کہ اس کلام سے مراد آیا عموم سلب اور شمول نفی ہے یا سلبِ عموم اور نفی شمول، اور یہ اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتا جب تک کہ ادات عموم کو ادات نفی پر یا ادات نفی کو ادات عموم پر مقدم نہ کیا جائے، اب اگر ادات عموم کو ادات نفی پر مقدم کردیا جائے تو عموم سلب کی صراحت ہوجائے گی، جیسے "كل ذلك لم يكن" مثال مذکور میں "كلٌّ" جو کہ ادات عموم میں سے ہے "لم" پر مقدم کیا گیا ہے، جو کہ ادات نفی میں سے ہے، جس کی وجہ سے عموم سلب کا فائدہ حاصل ہوا اور مطلب یہ نکلا ہے "لم يقع هذا و لا ذاك" (نہ یہ ہوا اور نہ وہ) اور اگر ادات نفی کو ادات عموم پر مقدم کردیا جائے تو سلب عموم کی صراحت ہوگی، جیسے

"لم يكن كل ذلك" اس مثال میں "لم يكن" یعنی ادات نفی کو "كل ذلك" یعنی ادات عموم پر مقدم کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے سلب عموم کا فائدہ حاصل ہوا ہے اور مطلب یہ نکلا ہے کہ مجموع نہیں ہوا، لہٰذا نفی ہر فرد سے بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض کا ثبوت ہوا یعنی مجموع نہیں ہوا لیکن بعض ہوا۔

ساتواں سبب: تقوية الحكم حکم کی تقویت یعنی خبر کی تقویت کے لیے تقدیم وتاخیر کرتے ہیں، مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ مبتدا کی خبر فعل ہو، جیسے "الهلال ظهر" اس مثال میں "الهلال" جو کہ مبتدا ہے اس کی خبر فعل ہے، جس کی ضمیر کا مرجع وہی "الهلال" مبتدا ہے، تو "ظهر" فعل کی اسناد پہلے اپنے فاعل (ضمیر ھو) کی طرف ہوئی، پھر اس ضمیر مسند کی اسناد اپنے مسند الیہ "الهلال" کی طرف ہوئی، اس طرح "ظهر" فعل کی اسناد دو مرتبہ ہوئی، ایک مرتبہ اپنے فاعل کی طرف، دوسری مرتبہ اپنے مبتدا کی طرف، اور اسی تکرار اسناد کی وجہ سے حکم میں تقویت آئی ہے۔

آٹھواں سبب: التخصيص: تخصیص اور حصر کرنا، یعنی تقدیم اور تاخیر فعل کو اس کے متعلقات کے ساتھ خاص کرنے اور اس پر قصر کرنے کے لیے بھی کرتے ہیں، منفی کی مثال، جیسے "ما أنا قلت" (میں نے تو نہیں کہا) اس جملے میں مسند الیہ کی تقدیم کی گئی ہے، لہٰذا مسند الیہ یعنی "أنا" مقصور علیہ ہوگا، اور مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تو نہیں کہا، ہاں میرے علاوہ نے کہا ہے، اس جملے سے متکلم نے اپنے سے ایک بات کی نفی کی ہے اور اسی جملے کے مفہوم سے اسی بات کا کسی دوسرے کے لیے اثبات بھی کیا ہے، تو گویا متکلم نے "أنا" کو مقدم کرکے عدم قول کو اپنے ساتھ مخصوص کیا ہے برخلاف اس کے کہ اگر أنا کو مقدم کیے بغیر مسند پر حرف نفی داخل کرکے یوں کہتا "ماقلت" تو کلام تخصیص سے خالی رہتا، مثبت کی مثال، جیسے إيّاك نعبد (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) یعنی عبادت کو

تیرے ساتھ مخصوص کرتے ہیں اور غیر اللہ سے عبادت کی بالکلیہ نفی کرتے ہیں، یہاں تخصیص کا فائدہ ضمیر منصوب متصل کو ضمیر منفصل کر کے مقدم کرنے سے حاصل ہوا ہے، اور اگر جملے کو اپنی حالت پر باقی رکھ کر یوں کہا جائے، نعبدك (ہم تیری عبادت کرتے ہیں) تو اللہ رب العزت کے لیے عبادت کا ثبوت تو ہو جائے گا مگر غیر اللہ سے عبادت کی نفی کا معنی حاصل نہ ہوگا۔

نواں سبب: المحافظة علی وزن او سجع: وزن یا سجع کی رعایت کے لیے تقدیم و تاخیر کرنا، وزن اور سجع دونوں کی تشریح ماقبل میں گزر چکی۔ محافظت علی الوزن کی مثال ؎

إذا نطق السفيه فلا تجبه فخير من إجابته السكوت

لغات: نطَقَ ینطِقُ نطقًا (ض) گفتگو کرنا، بات چیت کرنا، سفِیهٌ (ج) سفهاء بے وقوف، أجابَ یُجیبُ إجابَةٌ (افعال) جواب دینا، سکَتَ یسکُتُ سکُوتًا (ن) خاموش رہنا۔

ترکیب: إذا شرطیہ، ''نطق'' فعل، ''السفیه'' فاعل، فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ شرط، فاجزائیہ، ''لاتجبه'' فعل فاعل ومفعول سے مل کر جملہ فعلیہ انشائیہ شدہ جزا، شرط باجزا جملہ شرطیہ جزائیہ، فاتعلیلیہ خیرٌ صیغۂ صفت، من إجابته جار بامجرور متعلق بہ خیر، خیر اپنے متعلق سے مل کر خبر مقدم، السکوت مبتدا موخر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں خبر ''خیرٌ من إجابته'' کو مبتدا یعنی السکوت پر مقدم کیا گیا ہے جب کہ مبتدا کا حق مقدم ہونا اور خبر کا حق موخر ہونا ہے اور ایسا وزن شعر کی رعایت کے لیے کیا گیا ہے۔

محافظت علی السجع کی مثال، جیسے ''خُذُوهُ فغُلُّوهُ ثمَّ الجَحِيمَ صلُّوهُ ثُمَّ فِي سِلسِلَةٍ ذرْعُهَا سبْعُونَ ذِراعًا فاسْلُكُوهُ'' آیت مذکورہ میں ''الجحیم''

کو "صلوه" پر اور "في سلسلةٍ ذرعها" کو "اسلکوه" پر مقدم کیا گیا ہے، جب کہ نحوی قاعدے کے اعتبار سے یوں ہونا چاہئے "ثم صلوه الجحیم ، ثمّ اسلکوه فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعًا" کیوں کہ جملے میں فعل، فاعل اور مفعول تینوں کے جمع ہونے کی صورت میں پہلے فعل پھر فاعل اور پھر اس کے بعد مفعول بہ اور مفعول فیہ آتا ہے، مگر یہاں آیات کے فواصل کی رعایت کی وجہ سے تقدیم وتاخیر کی گئی ہے، تاکہ یکسانیت برقرار رہے۔

ولم یذکر لکل من التقدیم: فرماتے ہیں کہ تقدیم وتاخیر کے اسباب ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں ہر ایک کے لیے علاحدہ طور پر اسباب نہیں بیان کیے گئے، اس لیے کہ تقدیم وتاخیر میں تلازم کی نسبت ہے جب ایک مقدم ہوگا تو دوسرا خود بخود موخر ہو جائے گا، لہٰذا تقدیم کے اسباب بیان کرنے کے بعد اب مستقل طور سے تاخیر کے اسباب بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔

البابُ الرّابعُ فِيْ التّعريفِ والتّنكيرِ

إذا تعلَّقَ الغرَضُ بِتفْهِيمِ المُخاطَبِ ارتِباطَ الكَلامِ بمُعيَّنٍ فَالمَقامُ للتَّعريفِ ، وإذا لم يتَعلَّقِ الغرضُ بِذٰلكَ فالمَقامُ للتّنكِيرِ، ولِتفصِيلِ هٰذا الإجمالِ نقُولُ : مِنَ المَعلُومِ أنَّ المعَارفَ الضَّمِيرُ والعَلَمُ واسْمُ الإشارةِ واسمُ المَوصولِ والمُحلّٰى بألْ والمُضافُ لواحِدٍ مِمَّا ذُكرَ والمُنادىٰ .

چوتھا باب تعریف وتنکیر کے بیان میں

جب مخاطب کو یہ سمجھانا مقصود ہو کہ کلام کسی معین چیز کے ساتھ مربوط اور جڑا ہوا ہے تو یہ مقام مقام تعریف ہے، اور جب یہ غرض متعلق نہ ہو تو وہ مقام مقام تنکیر

ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ بات معلوم ہے کہ معارف، ضمیر، علم، اسم اشارہ، اسم موصول، معرف باللام ان مذکورہ میں سے کسی ایک طرف مضاف ہونا اور منادی ہے۔

تشریح: اس چوتھے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس جگہ اسم معرفہ استعمال کیا جائے گا، اور کہاں نکرہ لایا جائے گا، عبارت بالا کا مطلب یہ ہے کہ اگر متکلم کا مقصد یہ ہے کہ مخاطب کو کسی مخصوص چیز کے بارے میں بتلائے تو ایسی جگہ معرفہ کا استعمال کیا جائے گا اور اگر متکلم کا مقصد کسی مخصوص چیز کے متعلق خبر دینا نہ ہو بل کہ مطلقاً کوئی بات بیان کرنا ہو تو ایسی جگہ نکرہ لایا جائے، وجہ بالکل ظاہر ہے کہ چوں کہ معرفہ مخصوص اور معین چیز کو بتلاتا ہے اور نکرہ غیر معین کو، اس لیے معین کی جگہ معرفہ اور غیر معین کی جگہ نکرہ لانا ہی ضابطے کے مطابق اور اصول کے موافق ہوگا، اس کے بعد معارف کے اقسام کو بیان کیا گیا ہے کہ معرفہ کی سات قسمیں ہیں: (۱) ضمیر (۲) علم (۳) اسم اشارہ (۴) اسم موصول (۵) معرفہ بالف لام (۶) وہ لفظ جو ان میں سے کسی ایک کی طرف مضاف ہو (۷) منادیٰ۔

أمَّا الضَّميرُ: فيُؤتىٰ بهٖ لِكَونِ المَقامِ للتَّكلُّمِ أو الخِطابِ أو الغَيبَةِ مَعَ الاختِصارِ، نحوُ أنا رجَوتُكَ فِيْ هٰذا الأمرِ، وأنتَ وعَدْتَنِيْ بإنْجازِهٖ، والأصلُ فِيْ الخِطابِ أن يكُونَ لِمُشاهَدٍ مُعَيَّنٍ وقَدْ يُخاطَبُ غيرُ المُشاهدِ إذا كانَ مُستَحْضَرًا فِيْ القَلبِ نحو "إيَّاكَ نعبُدُ" وغيرُ المُعيَّنِ إذَا قُصِدَ تعْمِيمُ الخِطابِ لكلِّ مَنْ يُمْكِنُ خِطابُهٗ، نحوُ "اللَّئيمُ مَنْ إذَا أحْسَنْتَ إليهِ أساءَ إليكَ".

ترجمہ: بہر حال ضمیر تو لائی جاتی ہے اختصار کے ساتھ، مقام کے تکلم یا خطاب یا غیبت ہونے کی وجہ سے، جیسے "أنا رجوتك في هٰذا الامر وأنت وعدتني بإنجازه" میں نے تم سے اس معاملے میں امید کی تھی اور تم نے اس

کے پورا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور خطاب میں اصل یہ ہے کہ ضمیر اس حاضر شخص کے لیے ہو جو متعین او مشخص ہو اور کبھی کبھی غیر مشاہد کو بھی خطاب کیا جاتا ہے جب کہ وہ دل میں متحضر ہو، جیسے "إيَّاكَ نعبد" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور کبھی کبھی غیر معین کو بھی (ضمیر) سے خطاب کیا جاتا ہے جب کہ خطاب کو عام کرنا مقصود ہو ہر اس شخص کے لیے جس سے خطاب کرنا ممکن ہو، جیسے "اللَّئيمُ مَنْ إذا أحسَنْتَ إلَيهِ أساءَ إليك" کمینہ وہ شخص ہے کہ جب تم اس کے ساتھ حسن سلوک کرو تو وہ تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے۔

تشریح: اما الضمير: یہاں سے مصنفینؒ معرفہ کے اقسام کی تفصیل بیان فرما رہے ہیں کہ معرفہ کی سات قسموں میں سے کون سی قسم کو کس مقصد کے لیے لایا جاتا ہے، چناں چہ سب سے پہلے ضمیر کے بارے میں بیان کر رہے ہیں کہ ضمیر کا استعمال مقام تکلم مقام خطاب اور مقام غیبت میں ہوتا ہے اختصار کے ساتھ، یعنی ان مواقع میں ضمیر استعمال کرنے سے بات مختصر ہوتی ہے، جیسے "أنا رجوتك في هٰذا الأمر و أنت وعدتني بإنجازه" میں ایک جگہ ضمیر متکلم کا استعمال کیا گیا ہے اور ایک جگہ ضمیر مخاطب کا استعمال کیا گیا اور ضمیر کے استعمال کی وجہ سے کلام مختصر ہو گیا ہے، کیوں کہ اگر متکلم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر استعمال کرتا تو بات طویل ہو جاتی، یہ بھی واضح رہے کہ ضمیر خواہ متصل ہو یا منفصل دونوں میں اختصار پایا جاتا ہے۔

والأصل في الخطاب: یہاں سے حضرات مصنفینؒ خطاب کے سلسلے میں ایک ضابطہ بیان فرما رہے ہیں کہ خطاب میں اصل یہ ہے کہ مخاطب موجود اور متعین ہو، یعنی ضمیر حاضر کا استعمال حقیقت میں ایسی ہی جگہ ہوگا جب کہ مخاطب سامنے ہو، لیکن کبھی کبھی خلاف ضابطہ غیر مخاطب کے لیے بھی ضمیر حاضر کو استعمال کر لیا جاتا ہے، بشرطے کہ غیر مخاطب قلب میں متحضر ہو، جیسے إيَّاك نعبد یہاں إيَّاك سے باری تعالیٰ کو خطاب کیا گیا ہے، جب کہ اللہ رب العزت سامنے مشاہد نہیں

ہیں، لیکن چوں کہ قلب میں مستحضر ہیں، اس لیے ضمیر حاضر کا استعمال درست ہے۔

مذکورہ دونوں صورتوں کے علاوہ کبھی کبھی ضمیر مخاطب کا استعمال غیر معین کے لیے بھی کرتے ہیں، مگر یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ مقصد خطاب کو عام کرنا ہوتا ہے ہر اس شخص کے لیے جو مخاطب بن سکے، جیسے "اَللَّئیمُ مَنْ إذا أحسنْتَ إلَیهِ أساءَ إلیكَ".

قول مذکور میں محل استشہاد "أحسَنتَ" ہے کہ اس میں ضمیر مخاطب کو استعمال کیا گیا ہے، جب کہ مخاطب کوئی متعین شخص نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں پر خطاب کو عام کرنا ہے، اور اس سے ہر وہ شخص مراد ہے جو تمہارا مخاطب بن سکتا ہو۔

وَاَمَّاالعَلَمُ: فیُؤتیٰ بهٖ لإحْضَارِ معنَاه في ذِهنِ السَّامِعِ بِاسْمِهِ الخَاصِّ نحوُ "وإذْ یرفَعُ إبراھِیمُ القَواعِدَ مِنَ البیتِ وإسماعِیلُ" وقَدْ یُقصَدُ بهٖ معَ ذٰلِكَ أغْراضٌ أخریٰ، کالتَّعظِیمِ في نحوُ "رَکِبَ سیفُ الدَّولةِ" والإهانةِ في نحوِ "ذهَبَ صَخْرٌ" والکِنایةِ عنْ معنیً یصلُحُ اللَّفظُ لهٗ في نحو "تبَّتْ یدَا أبِي لهَبٍ".

ترجمہ: اور بہر حال علم تو اس کو لایا جاتا ہے سامع کے ذہن میں علم کے معنی کو حاضر کرنے کے لیے اس کے خاص نام کے ساتھ، جیسے وَإذْ یرفَعُ إبراھِیمُ القَواعِدَ مِنَ البَیتِ وإسْمٰعیلُ (اور جب کہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل علیہ السلام بھی)

اور کبھی علم کے ذریعہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مقاصد کا بھی قصد کیا جاتا ہے، مثلاً تعظیم جیسے "رکب سیف الدولة" سیف الدولہ سوار ہوئے اور توہین، جیسے "ذھب صخرٌ" صخر گیا، اور جیسے کنایہ کرنا کسی ایسے معنی سے لفظ جس کی صلاحیت رکھے، جیسے "تبّتْ یدا أبي لھب" ہلاک ہوں ابولہب کے دونوں ہاتھ۔

تشریح: وأمّا العلم: یہاں سے حضرات مصنفین معرفہ کی دوسری قسم ''علم'' کے بارے میں تفصیل بیان فرما رہے ہیں کہ علم کو کلام میں لائے جانے کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ سامع اور مخاطب کے ذہن میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات آجائے کہ فلاں کام کا کرنے والا فلاں شخص معین ہے، تاکہ کسی اور کی طرف اس کا ذہن نہ جائے، جیسے ''وَإذْ یرفَعُ إبْراهِیمُ القَواعِدَ مِنَ البَیتِ واسْمٰعِیلُ''

آیت کریمہ میں ابراہیم واسماعیل کی صراحت کردی گئی ہے، اگر یہ صراحت نہ کی جاتی تو بنائے کعبہ کا فاعل کوئی بھی دو غیر متعین مراد ہو سکتے تھے۔

وقد یقصد الخ: یہاں سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ علم کو کلام میں استعمال کرنے کا اصل مقصد تو وہی ہے جو ماقبل میں بیان کیا گیا، لیکن کبھی کبھی اصل مذکور کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی علم کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً تعظیم کے لیے یعنی کسی کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے، جیسے ''رکب سیف الدولة'' سیف الدولہ سوار ہوئے، مثال مذکور میں اگر امیر سیف الدولہ کا نام نہ لیا جاتا اور صرف ''رکب الامیر'' کہہ دیا جاتا تب بھی مخاطب بآسانی سمجھ جاتا، مگر چوں کہ مقصد عظمت کا اظہار ہے، اس لیے نام ذکر کیا گیا کہ اب تو دشمنوں کی خیر نہیں کیوں کہ وہ شخص سوار ہو چکا ہے جو حکومت وسلطنت کے لیے سیف قاطع ہے۔

اسی طریقے سے کبھی کبھی کسی کی توہین کے لیے علم کو استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ''ذهب صخر'' صخر چلا گیا، اس مثال مین صخر کا تذکرہ توہین کی غرض سے کیا گیا ہے، کیوں کہ صخر کے معنی پتھر کے ہیں جس سے حقارت کا معنی مراد لیا جاتا ہے۔

اور کبھی کبھی علم کے ذریعے کسی مخصوص معنی کا کنایہ کیا جاتا ہے، مگر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب لفظ اس معنی کی صلاحیت رکھے، جیسے ''تبت یدا أبي لهب'' اس آیت میں ابولہب سے اس کا مسمی مراد لیا گیا ہے، مگر یہاں ابولہب سے جہنمی

ہونے سے کنایہ کیا گیا ہے، اور لفظ بھی اس معنی کی صلاحیت رکھتا ہے، اس طریقے سے کہ "لهب" کے معنی "شعلہ" کے آتے ہیں، اور "أب" کا استعمال عربی زبان میں ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں کسی چیز کا دوسری چیز سے بہت قریبی تعلق ہو، گویا ابو لہب کے معنی ہو گئے "شعلہ والا" اور جہنم میں جو شخص بھی جائے گا، اس کا بھی واسطہ شعلے اور آگ ہی سے پڑے گا۔

وامَّا اسْمُ الإشارةِ: فيُؤتى به إذَا تعيَّنَ طريقًا لإحضارِ معناهُ كقولِكَ "بِعْنِي هٰذا" مُشِيرًا إلىٰ شيءٍ لاتعرِفُ لهُ اسمًا ولاوصْفًا. أمَّا إذا لم يتعيَّنَ طريقًا لذلكَ فيَكُونُ لأغراضٍ أخرىٰ.

١. كإظْهارِ الاستِغرابِ، نحو ؎

كَمْ عاقِلٍ أعيَتْ مذَاهِبُهُ　　　وجَاهِلٍ جَاهلٍ تلقَاهُ مرْزُوقًا
هٰذا الَّذِىْ تركَ الأوهامَ حائِرةً　　　وصيَّرَ العالِمَ النِحرِيرَ زِندِيقًا

٢. وكمالِ العِنايةِ بهِ، نحوُ

هٰذا الَّذِيْ تعرِفُ البَطْحاءُ وطْأتَهُ　　　والبيتُ يعرِفُهُ والحِلُّ والحرَمُ

٣. وبيان حالِهِ فِيْ القُربِ والبُعدِ نحوُ "هٰذا يوسفُ وذاكَ أخُوهُ وذٰلِكَ غُلامُهُ"

٤. والتَّعظيمِ نحوُ "إنَّ هٰذا القُرآنَ يهدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ أقوَمُ" و "ذٰلِكَ الكِتابُ لاريبَ فيهِ"

٥. والتَّحقِيرِ نحوُ "أهٰذا الَّذِيْ يذكُرُ آلِهَتَكُمْ" فذٰلِكَ الَّذِيْ يدُعُّ اليَتِيم"

ترجمہ: اور بہرحال اسم اشارہ تو اسے اس وقت لایا جاتا ہے جب کہ وہ اپنے معنی کو (شئ مخصوص کو مخاطب کے ذہن میں) حاضر کرنے کے لیے بطور ایک طریقے کے متعین ہو جائے، جیسے کہ تمہارا قول "يعني هٰذا" اس چیز کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے جس کا نہ تو تم نام جانتے ہو اور نہ ہی کوئی وصف، رہا اس صورت میں جب کہ وہ اس کے لیے بطور ایک طریقے کے متعین نہ ہو تو دوسرے مقاصد کے لیے ہوتا ہے، جیسے

١ ندرت کے اظہار کے لیے، مثلاً کم عاقلٍ عاقلٍ ۔

کتنے ہی عقلمندوں کو تھکا دیا ہے ان کے رزق کے راستوں نے اور کتنے جاہل ایسے ہیں جن کو تم خوش حال و دولت مند پاؤ گے۔

یہی وہ چیز ہے جس نے عقلوں کو حیران کر رکھا ہے اور ماہر عالم کو بے دین بنا دیا ہے۔

٢ غایت توجہ کے لیے (اسم اشارہ کو استعمال کرتے ہیں) جیسے هذا الذي تعرف البطحاء ۔

یہ وہ شخصیت ہیں جن کے نشان قدم سے سرزمین بطحا شناسا ہے، بیت اللہ اور حل و حرم بھی (ان سے واقف ہیں)

٣ مشار الیہ کے قرب و بعد کی حال کی وضاحت، جیسے "هٰذا يوسف" یہ یوسف ہے، "و ذاك أخوه" اور وہ اس کے بھائی ہیں و "ذٰلك غلامه" اور وہ اس کا غلام ہے۔

٤ تعظیم (کے لیے اسم اشارہ لاتے ہیں) جیسے "إنّ هٰذا القرآن يهدي للّتي هي أقوم" بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے "و ذٰلك الكتاب لاريب فيه" یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

٥ تحقیر (کے لیے اسم اشارہ لاتے ہیں) جیسے "أهٰذا الّذي يذكر آلهتكم" کیا یہی وہ ہیں جو تمہارے معبودوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں "فذٰلك الّذي يدعُّ اليتيم" سو یہی وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

تشریح: وأمّا إسم الاشارة معرفہ کے اقسام میں سے ضمیر اور علم کی

تفصیل بیان کرنے کے بعد اب حضرات مصنفینؒ اسم اشارہ کی تفصیل بیان کر رہے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ اسم اشارہ کا استعمال ایسے موقع پر کیا جاتا ہے جب کہ مشارٌ الیہ کی مراد کو مخاطب کسی طریقے سے سمجھ جائے اور اس چیز کو مخاطب کے ذہن میں لانے کا ذریعہ صرف اشارۂ حسیہ ہی ہو، جیسے کسی دوکان دار کے سامنے کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنا "بعني هٰذا" یہ چیز مجھے بیچ دو، مثال مذکور میں متکلم "هٰذا" (اسم اشارہ) کا سہارا لینے پر اس وجہ سے مجبور ہوا کہ وہ مشارٌ الیہ کے نام اور اس کے وصف سے ناواقف ہے، اس لیے بائع کے ذہن میں مشارٌ الیہ کا تصور جمانے کے لیے اس کے سامنے صرف یہی ایک ذریعہ اشارۂ حسیہ ہے۔

اسم اشارہ کی اصلی غرض تو یہی ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسم اشارہ بحیثیت ایک طریقے کے متعین نہیں ہوتا کہ اسم اشارہ ہی سے شئ میں تعریف کا معنی پایا جائے بل کہ دوسرے طریقے بھی تعریف کے لیے ممکن و متصور ہو سکتے ہیں، مگر قصداً دوسرے طریقہائے تعریف کو چھوڑ کر اسم اشارہ ہی استعمال کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں اسم اشارہ دوسرے مقاصد کے لیے ہوگا، مثلاً اظہار غرابت وندرت، جیسے ؎

کم عاقلٍ عاقلٍ أعيت مذاهبه و کم جاهلٍ جاهلٍ تلقاه مرزوقا

هٰذا الذِي ترك الأوهام حائرةً وصيّر العالم النحرير زنديقا

لغات: عاقلٌ (ج) عقلاء، عقلمند؛ أعيٰى يُعيِي إعياءً (افعال) عاجز بنا دینا، تھکا دینا؛ مذَاهِبُ (واحد) مذهَبٌ طریقہ، راستہ؛ جاهل (ج) جهلاءُ نادان، جهِلَ يجهَلُ جهَالةً (س) ناواقف ہونا۔ لَقِيَ يَلْقٰى لِقاءً (س) ملاقات کرنا، پانا، مرزوقٌ صیغہ اسم مفعول ہے، رزَقَ يرزُقُ رِزْقًا (ن) روزی دینا، أوهَامٌ (واحد) وهمٌ خیال، حارَ يَحارُ حيرةً (س) حیرت زدہ کرنا، صيَّرَ تصييرًا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل دینا، نِحْرِيْرٌ (ج) نحَارِير

عقلمند، زِندِيقٌ (ج) زنادیق بے دین۔
ترکیب: کم خبریہ ممیز، عاقلٍ موکد عاقلٍ ثانی تاکید، موکد با تاکید تمیز، ممیز با تمیز مفعول بہ مقدم، اعیت فعل، مذاهبه فاعل، فعل با فاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف علیہ، واو عاطفہ کم خبریہ ممیز، جاهل موکد، جاهل ثانی تاکید، موکد با تاکید تمیز، ممیز با تمیز مبتدا، تلقی فعل بافاعل، ہٗ ذوالحال، مرزوقًا حال، ذوالحال با حال مفعول، فعل بافاعل ومفعول بہ جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر، مبتدا باخبر معطوف جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشهاد "هٰذا الَّذِيْ ترك الأوهام" ہے کہ یہاں پر شاعر نے اسم اشارہ کو غرابت کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے، بایں طور کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے، کہ یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ عقل مند تو ذریعۂ معاش کے لیے پریشان رہتا ہے جب کہ ناخواندہ، ان پڑھ اور جاہل کو بآسانی ہر چیز مہیا رہتی ہے، اور اسے کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوتی، اِسی چیز نے لوگوں کو حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

شعر مذکور میں دوسرا طریقۂ تعریف بھی ممکن تھا، مثلاً یوں کہتا "كون العالم محرومًا وكون الجاهل مرزوقًا" مگر چوں کہ مقصد اظہار غرابت ہے اس لیے اسم اشارہ ہی کو استعمال کیا۔

وكمال العناية اور کبھی کبھی اسم اشارہ لانے کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ مشارٌ الیہ پر مخاطب کی پوری توجہ ہو جائے، تاکہ مشارٌ الیہ دوسروں سے بالکل ممتاز ہو جائے، جیسے: ؎

هٰذا الَّذِيْ تعرف البطحاء وطأته والبيت يعرفه والحلُّ والحرم

لغات: وطْأةٌ نشان قدم، بطحاء، مکہ کی پتھریلی زمین، حِلٌّ خارج حرم،
ترکیب: هٰذا اسم اشارہ مبتدا، الذي اسم موصول، تعرف البطحاء

و طاتہ فعل و فاعل و مفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ، صلۂ موصول، موصول با صلہ خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا، البیت معطوف علیہ، الحل معطوف علیہ ومعطوف، واو عاطفہ الحرم معطوف، معطوف علیہ اپنے تمام معطوفات سے مل کر مبتدا، یعرفہ جملہ خبر۔

یہ شعر عرب کے مشہور اسلامی شاعر فرزدق کا ہے، جو اس نے حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کہا تھا اور شاعر نے موصوف کی طرف پوری توجہ مبذول کرانے کے لیے اسم اشارہ کا استعمال کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام زین العابدین دوسروں سے بالکل منفرد اور ممتاز ہیں، وہ ایسی خوبیوں کے مالک ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں، ان کے اوصاف ایسے ہیں جو آنکھوں سے بھی محسوس ہوتے ہیں اور غیر ذوی العقول چیزیں بھی ان کو جانتی ہیں۔ (ان کا تفصیلی واقعہ نفحۃ العرب میں ہے)

وبیان حالہ الخ: حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی اسم اشارہ لانے کا مقصد قرب یا بعد یا توسط میں مشار الیہ کا حال بیان کرنا ہوتا ہے، چناں چہ اگر مشارٌ الیہ کا قرب بیان کرنا ہو تو کہتے ہیں "ھذا یوسف" یہ یوسف ہیں۔ اور توسط بیان کرنا ہو تو کہتے ہیں "ذاك أخوہ" وہ ان کے بھائی ہیں۔ اور اگر مشارٌ الیہ کا بعد بیان کرنا ہو تو کہتے ہیں "ذٰلك غلامہ" وہ ان کا غلام ہے۔

والتَّعظیم: کبھی اسم اشارہ لانے کا مقصد مشارٌ الیہ کی عظمت شان کو بیان کرنا ہوتا ہے، جیسے "إنَّ ھذا القرآن یھدی للّتی ھی اقوم" یہی قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔

آیت مذکورہ میں اسم اشارہ کا استعمال قرآن کریم کی عظمت شان کو بیان کرتا ہے کہ صحیح اور صراط مستقیم کی رہنمائی صرف قرآن کریم ہی سے ہوسکتی ہے یعنی یہی ایک ایسی کتاب ہے جس کے احکام کو مان کر چلنے سے انسان دنیا و آخرت

دونوں کی بھلائی سے بہرہ ور ہوسکتا ہے۔

دوسری مثال ”ذٰلك الكتاب لاريب فيه“ یہی وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، اس آیت میں بھی اسم اشارہ کو تعظیم کے معنی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی عظمت ورفعت شان اتنی زیادہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی ایسی کتاب نہیں جو اس کی مماثل اور بلاغت و بیان میں اتنا اونچا مقام رکھتی ہو۔

پہلی مثال اسم اشارہ قریب کی ہے اور دوسری بعید کی، گویا کہ اسم اشارہ قریب اور بعید دونوں کو تعظیم کا معنی دینے کے لیے لایا جاتا ہے۔

والتحقير الخ: کبھی اسم اشارہ کے ذریعے مسند الیہ کی تذلیل وتحقیر مقصود ہوا کرتی ہے، جیسے کہ مردود وملعون ”ابوجہل“ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ”أهٰذا الَّذِيْ يذكر آلهتكم“ یہی ہے وہ جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، یعنی ان کی الوہیت اور معبودیت کی نفی کرتا ہے، یا جیسے ”فذٰلك الّذى يدعُّ اليتيم“ یہی ہے وہ جو یتیم کو دھکے دیتا ہے، اس آیت میں بھی اسم اشارہ کو تحقیر کے لیے لایا گیا ہے۔

وَامَّا المَوصُولُ: فيُؤتى بهٖ إذا تعيَّنَ طريقًا لإحضارِ معناهُ كقَولِكَ ”الَّذِيْ كانَ معنَا أمسِ مُسافِرٌ“ إذا لم تكُنْ تعرِفُ اسْمَهٗ . أمَّا إذا لم يتَعيَّنَ طريقًا لِذٰلكَ فيَكُونُ لأغْراضِ أُخرىٰ .

١ . كالتَّعلِيْلِ نحوُ ”إنَّ الَّذينَ آمَنُوا وعَمِلُوا الصَّالِحاتِ كانَتْ لهُمْ جنّٰتُ الفِردَوسِ نزُلًا“ .

٢ . وإخْفاءِ الأمرِ عنْ غيرِ المُخَاطَبِ ، نحوُ ؎

وَ أخَذْتُ ما جادَ الأميرُ بهٖ   وقَضَيتُ حاجاتِي كَما أهْوىٰ

٣ . والتَّنبيهِ علىٰ الخطأ ، نحوُ

إنَّ الّذينَ ترونَهُمْ إخوانكُمْ يشفِي غليلَ صُدُورهِمْ أن تُصرَعُوا

٤. وتفخِيمِ شأنِ المَحكُومِ بهِ، نحوُ

إنَّ الّذِي سمَكَ السَّماءَ بنى لنا بيتًا دعائِمُهُ أعزُّ وأطولُ

٥. والتَّهويلِ تعظيماً وتحقِيراً نحوُ "فغشِيَهُمْ مِنَ اليَمِّ مَا غَشِيَهُمْ" وَنحْوَ "مَن لَمْ يَدْرِ حَقِيْقَةَ الْحَالِ قال ما قال"

٦. والتَّهكُّمِ نحوُ "يا ايُّهَا الّذِيْ نُزِّلَ عليهِ الذِّكرُ إنَّكَ لمَجْنُونٌ"

ترجمہ: اور بہر حال اسم موصول تو اس کو لایا جاتا ہے اس وقت جب کہ وہ سامع کے (ذہن میں) معنی کو حاضر کرنے کے لیے بطور ایک طریقہ کے متعین ہوجائے، جیسے کہ تمہارا قول "الّذي كان معنا أمس مسافر" وہ شخص جو کل ہمارے ساتھ تھا مسافر ہے، یہ اس صورت میں ہے جب تم اس کا نام نہ جانتے ہو، لیکن اس وقت جب کہ وہ اس کے لیے بطور ایک طریقے کے متعین نہ ہوتو دوسرے مقاصد کے لیے ہوتا ہے۔

۱ جیسے تعلیل کے لیے مثلاً "إنّ الّذين آمنُو اوعمِلُوا الصّٰلحٰت كانت لهُمْ جنّٰتُ الفِردَوسِ نُزُلًا" بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ان کی مہمانی کے لیے فردوس کے باغات ہوں گے۔

۲ مخاطب کے علاوہ سے بات کو چھپانا، جیسے وأخذت ماجاد الأمير به الخ

میں نے وہ چیز لے لی جس کی امیر نے سخاوت کی اور میں نے حسب منشا اپنی ضرورتوں کو پورا کیا۔

۳ غلطی پر تنبیہ کرنے کے لیے، جیسے إنّ الّذين الخ

بے شک وہ لوگ جن کو تم اپنا بھائی سمجھتے ہو ان کے دلوں کی پیاس اس وقت بجھے گی جب تم ہلاک کردیے جاؤ۔

۴۔ محکوم بہ کی شان کو بلند کرنے کے لیے، جیسے إنّ الّذی الخ ۔
وہ ذات جس نے ہمارے لیے آسمان کو بلند کیا ہے ہمارے لیے ایک ایسا گھر بنایا ہے جس کے ستون بہت مضبوط اور بہت لمبے ہیں۔

۵۔ ہولناکی بتلانا تعظیم اور تحقیر کے طور پر، جیسے "**فغشیهم من الیمّ ماغشیهم**" تو وہ (دریا) ان پر جیسا ملنے کو تھا آملا۔ اور جیسے "**من لم یدر حقیقة الحال قال ماقال**" جس نے حقیقت حال کو نہ جانا وہ ایسی ہی بیہودہ بات کہے گا جو اس نے کہی۔

۶۔ اور مذاق اڑانے کے لیے، جیسے "**یأیّها الّذی نزّل علیه الذّکر إنّك لمجنون**" اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے تم تو مجنون ہو۔

تشریح: **وأما الموصول** یہاں سے حضرات مصنّفینؒ اسم موصول کی تفصیل بیان کررہے ہیں کہ اسم موصول کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ سامع کے ذہن میں اس کے معنی کا تصور جمانے کے لیے ایک طریقے کی حیثیت سے متعین ہوجائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہ ہو، جیسے مثلاً حامد وراشد کی کسی اجنبی شخص سے ملاقات ہوئی تھی اور راشد کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ کس لیے ہم سے ملا؟ اور حامد راشد کو اس کے متعلق یہ بتلانا چاہتا ہے کہ وہ شخص مسافر تھا، حال یہ ہے کہ حامد کو بھی اس کے نام اور سکونت کا پتہ نہیں ہے ایسے موقع پر حامد یوں کہے گا "**الذي کان معنا أمس مسافرٌ**" جو شخص کل ہمارے ساتھ تھا وہ مسافر ہے۔

مثال مذکور میں حامد چوں کہ اس اجنبی شخص کے نام وغیرہ سے ناواقف تھا اس لیے اس کے سامنے تعارف کے لیے صرف یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ اسم موصول کو استعمال کرتے ہوئے **الذي کان معنا** کہے، یہی اسم موصول کی اصلی غرض ہے۔

أمّا إذا لم یکن الخ فرماتے ہیں کہ اسم موصول اگر اس کے لیے متعین نہ ہو، یعنی تعریف کی کوئی اور بھی صورت ہو مگر اس صورت کو ترک کر کے اسم موصول ہی کو استعمال کیا جائے تو اس صورت میں اس موصول دوسرے مقاصد کے لیے ہوگا، مثلاً تعلیل یعنی علت بیان کرنے کے لیے، جیسے ''إنّ الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت کانت لھم جنّٰت الفِردوسِ نُزُلًا'' بے شک جولوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے ان کی مہمان نوازی کے لیے فردوس کے باغات ہیں۔

آیت مذکورہ میں اسم موصول کا استعمال تعلیل کے لیے کیا گیا ہے، بایں طور کہ موصول وصلہ دونوں مل کر مہمان نوازی کے طور پر فردوس کے باغات ملنے کی علت اور وجہ بیان کر رہے ہیں، کہ اس مہمان نوازی کی وجہ ایمان اور عمل صالح ہے۔

و إخفاء الأمر کبھی کبھی اسم موصول کا استعمال اس لیے کرتے ہیں کہ مخاطب کے علاوہ دوسرا آدمی بات کو نہ سمجھ سکے، جیسے

وأخذت ماجاد الأمیر بہٖ وقضیت حاجاتي کما أھوی

لغات: جادَ بشيئٍ یجُودُ جُودًا (ن) سخاوت کرنا، قضٰی یقضي قضاءً ا (ض) پورا کرنا، ھويَ یھویٰ ھویً (س) محبت کرنا۔

ترکیب: واو مستانفہ ''أخذت'' فعل بافاعل، اسم موصول، ''جاد'' فعل، ''الأمیر'' فاعل، بہ متعلق بہ جادَ، فعل بافاعل ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلہ، موصول با صلہ مفعول، فعل بافاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ ہوکر معطوف علیہ، واو عاطفہ ''قضیت'' فعل بافاعل ''حاجاتي'' مفعول بہ، کاف جارہ، ما مصدریہ، ''أھوی'' بتاویل مصدر شدہ مجرور، جار مجرور متعلق بہ قضیت، فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''ما'' اسم موصول ہے، متکلم نے سخاوت کردہ چیز کی مقدار کو بیان نہیں کیا ہے تاکہ مخاطب کے علاوہ دوسرے حضرات اس سے

واقف نہ ہوں اور مخاطب کوتو معلوم ہی تھا کہ امیر اسے کیا چیز عطا والا تھا، اس لیے مخاطب سمجھ جائے گا کہ جو چیز اسے ملنی تھی مل گئی۔

والتنبيه على الخطأ: کبھی کبھی اسم موصول کا استعمال مخاطب کو اس کی غلطی پر تنبیہ کرنے کے لیے کرتے ہیں، جیسے: ؂

إنَّ الّذِينَ ترونهم إخوانكم يشفي غليل صدورهم أن تصرعوا

لغات: شفٰى يشفي شِفاءً (ض) شفا دینا، غليل سخت پیاس، صرَعَ يصرعُ صرعًا (ف) پچھاڑنا۔

ترکیب: إن حرف مشبہ بہ فعل "الذين" اسم موصول ترون فعل با فاعل هم مفعول اول، "إخوانكم" مفعول ثانی، فعل با فاعل و ہر دو مفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلہ، موصول با صلہ اسم إنَّ، "يشفي" فعل "غليل صدورهم" مفعول أن مصدریہ "تصرعوا" بتاویل مصدر شدہ فاعل، فعل با فاعل و مفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر إنَّ۔

شعر مذکور میں اسم موصول کا استعمال مخاطب کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے، بایں طور کہ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ جن کو اپنا بھائی سمجھتے ہو اور ان کے ساتھ اخوت اور بھائی چارگی کا معاملہ کرتے ہو وہ تمہاری ہلاکت میں راحت محسوس کرتے ہیں، لہٰذا ان کے اس جذبے کے ساتھ تمہارا ان کو اپنا بھائی تصور کرنا بالکل غلط ہے اور تم اس خیال میں غلطی پر ہو۔

وتفخيم شأن المحكوم به: کبھی کبھی اسم موصول کو لانے کا مقصد محکوم بہ کی عظمتِ شان کو بتلانا ہوتا، جیسے: ؂

إنّ الّذي سمك السماء بنى لنا بيتًا دعائمه أعزّ وأطول

لغات: سمَكَ يسمُكُ سمكًا (ن) بلند کرنا، دعائمُ (واحد) دعامةٌ ستون، عزَّ يعِزُّ عِزًّا قوی ہونا۔

ترکیب: إنّ حرف مشبہ بہ فعل، "الذي" اسم موصول، "سمك" فعل بافاعل، "السماء" مفعول بہ فعل بافاعل ومفعول بہ جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلۂ موصول، موصول باصلہ اسم إنّ، "بنیٰ" فعل بافاعل، لنا جار مجرور متعلق بہ بنیٰ، "بیتًا" موصوف "دعائمه" مبتدا، "اعزُّ و أطول" معطوف علیہ ومعطوف خبر، مبتدا باخبر صفت، موصوف باصفت مفعول بہ، فعل بافاعل ومفعول بہ جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر إنّ۔

شعر مذکور میں اسم موصول کے ذریعے محکوم بہ یعنی شاعر اپنے گھر (بیت اللہ) کی عظمت شان کی طرف اشارہ کرر ہا ہے اس طور پر کہ شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ ہمارے گھر یعنی خانہ کعبہ کو بنانے والا وہ ہے جس نے آسمان جیسی بلند وبالا چیز کو بنایا ہے یعنی وہ ایسی ذات ہے جس کا ہر کام عظیم الشان اور بلند مرتبے کا حامل ہوتا ہے، لہٰذا ہمارا گھر (بیت اللہ) بھی عظیم الشان اور رفیع المرتبت ہوگا، اگر شاعر نام ذکر کرتا تو یہ عظمت شان ظاہر نہ ہوتی۔

والتهويل تعظيمًا وتحقيرًا: فرماتے ہیں کہ کبھی اسم موصول کو اس لیے لاتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ مسند الیہ کی خوفنا کی اور ہولنا کی کو بیان کیا جائے پھر یہ ہولنا کی کبھی عظمت کے طور پر ہوتی ہے اور کبھی حقارت کے طور پر، تہویل من جہت التعظیم، جیسے "فغشيهم من اليمّ ماغشيهم" سوڈھانپ لیا ان کو (فرعون اور فرعونیوں کو) سمندر کی اس چیز نے جس نے ڈھانپ لیا۔ آیت کریمہ میں ما اسم موصول "غشيهم" کا فاعل ہے اور "من اليمّ" اسی ما کا بیان ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کو سمندر کے اس قدر کثیر پانی نے ڈھانپ لیا جس کی مقدار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، یعنی پانی اس قدر زیادہ تھا جس کی تفصیل اور جس کا احاطہ ممکن نہیں، تو گویا یہاں موصول وصلہ کے ذریعہ "غشی" کے فاعل اور مسند الیہ کو خوفناک اور باعظمت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

تهويل على سبيل التحقير: کی مثال، جیسے "من لم يدر حقيقة الحال قال ماقال" جس شخص کوحقیقت حال کا علم نہیں اس نے وہ بات کہی جو کہی، مطلب یہ کہ بیہودہ اور لایعنی باتیں وہی شخص کہتا ہے جس کو صحیح صورت حال معلوم نہیں ہوتی ہے، اس مثال میں "ما" سے جو بات مراد لی گئی ہے وہ حقیر اور بے معنی بات ہے۔

والتهكّم: کبھی اسم موصول کا استعمال تہکم اور مذاق کے لیے ہوتا ہے، جیسے "يأَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عليهِ الذِّكرُ اِنَّكَ لمجنُونٌ" اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے تم تو مجنون ہوا۔ یہاں اسم موصول تہکم کے لیے ہے بایں طور کہ یہ جملہ کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بطور استہزاء کہا کرتے تھے کہ (نعوذ باللہ) اللہ رب العزت کو رسول بنانے کے لیے آپ کے علاوہ کوئی اور بڑا آدمی نہیں ملا تھا، یہاں اگر اسم موصول کے بجائے کچھ اور لاتے مثلاً آپ کا اسم گرامی تو یہ مقصد حاصل نہ ہوتا۔

وامّا المُحَلّٰى بال: فيُوتٰى بهٖ إذَا كانَ الغرَضُ الحِكايَةَ عنِ الجنسِ نفسهٖ نحوُ "الإنسانُ حَيوانٌ ناطِقٌ" وتُسمّٰى الْ جِنسِيَّةً ، أو الحِكايةَ عَن مَعْهُودٍ مِنْ أفرَادِ الجِنسِ، وَعَهْدُهُ إمَّا بتَقَدُّمِ ذِكرِهٖ نحوُ "كَمَا أرْسلْنا إلٰى فِرعَونَ رسُولاً فعصٰى فِرعَونُ الرَّسُولَ" وإمَّا بِحُضُورِهٖ بذاتِهٖ نحوُ "اَليَومَ أكْمَلْتُ لكُم دِينَكُمْ" وإمَّا بِمعرِفةِ السَّامِعِ لهُ نحوُ "إذْ يُبَايِعُونَكَ تَحتَ الشَّجرَةِ" وتُسمّٰى اَلْ عَهدِيَّةً ، أوِ الحِكايَةَ عَنْ جمِيعِ أفْرَادِ الجِنسِ نحوُ "إنَّ الإنسانَ لَفِىْ خسْرٍ" وتُسمّٰى اَلْ إسْتغرَاقِيَّةً . وقَدْ يُرادُ بألْ الإشارةُ إلى الجِنسِ فِي فردٍ مَّا نحوُ : ــ

ولقد أمُرُّ علَى اللَّئِيمِ يَسُبُّنِي فمَضَيتُ ثمَّةَ قُلتُ لايَعْنِيْنِي

وَإذَا وَقَعَ المُحَلّٰى بأل خبرًا أفادَ القَصرَ نحوُ "وهُوَ الغفُورُ الوَدُودُ"

ترجمہ: بہر حال معرفہ بالف لام تو اس کو لایا جاتا ہے جب کہ مقصد خود جنس ہی کی حکایت ہو، جیسے "الإنسان حیوانٌ ناطق" انسان حیوان ناطق ہے۔ اور اس کو الف لام جنسی کہا جاتا ہے، یا جنس کے افراد میں سے کسی متعین فرد کی حکایت مقصود ہو، یا تو اس شخص معین کا ذکر پہلے آنے کی وجہ سے، جیسے "کما أرسلنا إلی فرعون رسولاً فعصٰی فرعون الرّسول" جیسا کہ ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا پھر فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا، یا معہود کی ذات کے موجود ہونے کی وجہ سے، جیسے "الیوم أکملت لکم دینکم" آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ یا تو سامع کے اس متعین شخص کو جاننے کی وجہ سے، جیسے "إذ یبایعونك تحت الشجرة" جب کہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اور اس کو الف لام عہدی کہا جاتا ہے، یا جنس کے تمام افراد کی حکایت مقصود ہو، جیسے "إنّ الإنسان لفی خسر" بلاشبہ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ اور اس کو الف لام استغراقی کہا جاتا ہے، اور کبھی الف لام سے اشارہ جنس کی طرف ہوتا ہے کسی بھی فرد کے متعلق، جیسے "ولقد امرّ الخ

جب میں کبھی کسی ایسے کمینے کے پاس سے گذرتا ہوں جو مجھے گالی دیتا ہے تو میں وہاں سے گذر جاتا ہوں اور (جی میں) کہتا ہوں کہ وہ مجھے مراد نہیں لے رہا ہوگا۔

اور جب معرفہ بالف لام خبر واقع ہو تو قصر کا فائدہ دے گا، جیسے "ھو الغفور الودود" وہی بڑا بخشنے والا اور بڑی محبت کرنے والا ہے۔

تشریح: وأمّا المحلّٰی بال: یہاں سے مصنفؒ معرفہ کی پانچویں قسم معرفہ بہ الف لام کی تفصیل بیان کر رہے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ معرفہ بہ الف لام اس وقت لاتے ہیں جب جنس اور حقیقت و ماہیت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس الف لام کو جس سے جنس اور ماہیت کی طرف اشارہ

کیا جائے الف لام جنسی کہا جاتا ہے، جیسے ''الإنسان حیوان ناطق'' مثال مذکور میں ''الإنسان'' کا الف لام جنسی ہے، کیوں کہ اس سے کسی ایک فرد کی نہیں بل کہ انسان کی جنس اور اس کی حقیقت کو بیان کرنا مقصود ہے۔

أو الحکایة عن معهود: فرماتے ہیں کہ کبھی معرفہ بہ الف لام کے لانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنس کے کسی فرد معین اور معہود کی طرف اشارہ ہو جائے یعنی جو متکلم اور مخاطب کے درمیان متعین ہو وہ فرد معین ایک بھی ہو سکتا ہے دو بھی ہو سکتے ہیں، اور دو سے زائد بھی ہو سکتے ہیں، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اس فرد خاص کا تعین تین طریقوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ ہو، یا تو بایں طور کہ اس فرد معین کا تذکرہ ماقبل میں آچکا ہو، جیسے ''کما أرسلنا إلی فرعون رسولاً فعصی فرعون الرسول'' آیت مذکورہ میں محل استشہاد ''الرّسول'' کا الف لام ہے جو عہدی ہے، کیوں کہ رسول کا تذکرہ اس سے پہلے بھی ''إلی فرعون رسولاً'' میں آچکا ہے، لہٰذا ''الرّسول'' سے بھی مراد وہی رسول اول ہوگا۔

و إمّا بحضوره دوسری صورت یہ ہے کہ اس فردِ معین کا تذکرہ سابق میں تو نہیں آیا مگر وہ بذات خود موجود ہے، جیسے ''الیوم أکملت لکم دینکم'' اس آیت میں محل استشہاد ''الیوم'' ہے کیوں کہ اگر چہ ''یوم'' کا تذکرہ ماقبل میں نہیں آیا ہے مگر چوں کہ یہاں خود یوم حاضر کی طرف اشارہ ہے جو خارج میں ذات المعہود ہے، اس لیے الف لام عہد کا ماننا صحیح ہے۔

و إمّا بمعرفة السامع: اسی طریقے سے سامع اور مخاطب اگر اس فرد معین کو کسی طریقے سے جان لے قرائن وغیرہ کے ذریعے، تب بھی اس فردِ معین کے ماقبل میں مذکور ہونے کی ضرورت نہیں، جیسے ''إذ یبایعونك تحت الشجرة'' آیت میں محل استشہاد ''الشجرة'' کا الف لام ہے جو ہر مخاطب قرینے سے جان لیتا ہے کہ اس سے وہی متعین درخت مراد ہے جس کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مقام حدیبیہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی تھی۔

أو الحكاية عن جميع أفراد الجنس فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی الف لام سے جنس کے بعض متعین افراد مراد نہیں ہوتے، (مذکورہ تینوں قسم کے الف لام کو "ال عهدیه" کہیں گے) بل کہ تمام افراد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس الف لام کو "استغراقی" کہا جاتا ہے، کیوں کہ یہ تمام افراد کو شامل ہوتا ہے، جیسے "إنّ الإنسان لفی خسر" آیت مذکورہ میں "الإنسان" کا الف لام استغراقی ہے جو انسان کے ہر فرد کو شامل ہے، اسی لیے ترجمہ یوں کرتے ہیں، بے شک تمام انسان خسارے میں ہیں، اور الف لام استغراقی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد "إلا الّذین آمنوا" سے استثنا کیا گیا ہے۔ چوں کہ استثنا کی دونوں قسموں (متصل و منقطع) میں متصل ہی اصل ہے، اس لیے مستثنیٰ متصل ہی مراد لیا جائے گا، اور استثنائے متصل کی شرط یہ ہے کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہو اور یہ دخول اسی وقت ہوگا جب "الانسان" کے الف لام کو استغراقی مان کر "الّذین آمنوا" کے افراد کو اس میں داخل مانا جائے۔

وقد یراد بأل: فرماتے ہیں کہ کبھی الف لام سے جنس کے فرد غیر معین کی طرف اشارہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں وہ معرفہ نکرے کے درجے میں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ نکرہ ہی کا معاملہ کیا جاتا ہے، جیسے

ولقد أمرّ على اللّئيم يسبّني فمضيت ثمّة قلت: لايعنيني

لغات: لئیم ج لِئام کمینہ، سبَّ یسُبُّ سبًّا (ن) گالی دینا، مضٰی یمضِی مُضیًا گذرنا، عنٰی یعنِیْ عنیًا (ض) مراد لینا۔

ترکیب: واو مستانفہ، لقد برائے تحقیق، امرّ فعل با فاعل، علی حرف جار، "اللّئیم" موصوف "یسبّنی" جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صفت، موصوف با صفت مجرور، جار با مجرور متعلق ہوا "أمرّ" فعل کے، فعل اپنے فاعل و متعلق سے مل کر

معطوف علیہ، فا عاطفہ ''مضیت'' فعل با فاعل، ''ثمة'' مفعول فیہ، فعل با فاعل ومفعول فیہ جملہ خبریہ معطوف، ''قلت'' فعل فاعل سے مل کر قول، ''لایعنیني'' فعل با فاعل، نون وقایہ، ی مفعول، فعل اپنے فاعل اور مفعول سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہو کر مقولہ شدہ جملہ قولیہ ہوا۔

اس شعر میں محل استشہاد ''اللئیم'' ہے جو لئیم نکرہ کے درجے میں ہے اور مراد کوئی بھی کمینہ ہے اور نکرہ کے درجے میں ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ''یسبّني'' جملہ ہے جو ''اللّئیم'' کی صفت واقع ہے اور ضابطہ یہ ہے کہ جب جملہ صفت واقع ہو تو موصوف کا نکرہ ہونا ضروری ہے، مگر یہاں بظاہر ایسا نہیں ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ''اللّئیم'' نکرہ کے درجے میں ہے۔

وإذا وقع المحلّی بال: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ معرفہ بالف لام کے اقسام میں سے اگر کوئی قسم خبر واقع ہو تو یہ خبر مبتدا میں قصر مسند علی المسند الیہ کا فائدہ دے گی، جیسے ''وهو الغفور الودود'' اس آیت میں ''الغفور'' اور ''الودود'' خبر واقع ہیں جو دونوں معرفہ ہیں، اسی وجہ سے قصر مسند علی المسند الیہ کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے، اور ترجمہ یہ ہو رہا ہے وہی بڑا بخشنے والا اور بڑی محبت کرنے والا ہے، یعنی مغفرت ومودت حقیقتاً ذات باری تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ومنحصر ہے۔

وَامّا المُضافُ لِمَعرِفةٍ: فيُؤتَى بِهِ إذَا تعيَّنَ طَرِيقًا لِإحضَارِ معناهُ أيضًا كـ''كِتابِ سِيبوَيهِ'' و''سَفِينةِ نُوحٍ'' وأمَّا إذا لم يتعَيَّنْ لِذلِكَ فيكونُ لأغراضٍ أُخرىٰ.

١ ـ كَتَعذُّرِ التَّعدُّدِ أو تعسُّرِهِ، نحوُ ''أجمَعَ أهلُ الحَقِّ علىٰ كَذا'' و ''أهلُ البَلَدِ كِرامٌ''.

٢ ـ والخُروجِ مِن تبِعَةِ تقْدِيمِ البَعضِ علَى البَعضِ نحوُ ''حضَرَ أمَرَاءُ الجُندِ''.

٣۔ والتَّعظِيمِ لِلمُضافِ نحوُ "كِتابُ السُّلطَانِ حضَرَ" أو المُضافِ إلَيهِ نحوُ "هٰذَا خَادِمِي" أو غيرِهِمَا نحوُ "أخُو الوَزِيرِ عِندِي".

٤۔ والتَّحقِيرِ لِلْمُضافِ نحوُ "هٰذَا ابْنُ اللِّصِّ" أو المُضافِ إلَيهِ نحوُ "اللِّصُّ رَفِيقُ هٰذَا" أو غيرِهِمَا نحوُ "أخُو اللِّصِّ عِندَ عمْرٍو".

٥۔ والاخْتِصارِ لِضِيقِ المَقامِ نحوُ :۔

هَوايَ معَ الرَّكبِ اليَمانِينَ مُصْعِدُ جَنِيبٌ وجُثمانِي بِمكَّةَ مُوثَقُ

بدلَ أنْ يُقالَ الَّذِي أهْواهُ.

ترجمہ: بہرحال وہ اسم جو معرفہ کی طرف مضاف ہو تو اس کو لایا جاتا ہے اس وقت جب کہ وہ اپنے معنی کے احضار کے لیے بطور ایک طریقے کے متعین ہو جائے، جیسے "كتاب سيبويه" و "سفينة نوح" سیبویہ کی کتاب اور نوح کی کشتی، بہرحال اس وقت جب کہ وہ اس کے لیے بطور ایک طریقے کے متعین نہ ہو تو دوسرے مقاصد کے لیے ہوتا ہے، جیسے:

۱۔ تعداد کے بیان کا متعذر اور مشکل ہونا مثلاً "أجمع أهل الحق على كذا" اہل حق نے اس بات پر اتفاق کیا "أهل البلد كرام" شہر کے لوگ شریف ہیں۔

۲۔ بعض افراد کو بعض افراد پر مقدم کرنے کے ضرر سے بچنے کے لیے، جیسے "حضر أمراء الجند" لشکر کے امراء حاضر ہو گئے۔

۳۔ مضاف کی تعظیم کے لیے جیسے "كتاب السلطان حضر" بادشاہ کا خط آیا ہے، یا مضاف الیہ کی تعظیم کے لیے جیسے "هٰذا خادمي" یہ میرا خادم ہے۔ یا مضاف و مضاف الیہ کے علاوہ کسی اور کی تعظیم کے لیے، جیسے "أخو الوزير عندي" وزیر کا بھائی میرے پاس ہے۔

۴۔ مضاف کی تحقیر کے لیے جیسے "هٰذا ابن اللِّصّ" یہ چور کا بیٹا ہے۔ یا

مضاف الیہ کی تحقیر کے لیے، جیسے "اللّصّ رفيق هذا" چوراس کا دوست ہے۔ یا مضاف ومضاف الیہ کے علاوہ کسی اور کی تحقیر کے لیے، جیسے "أخو اللّصّ عند عمرو" چور کا بھائی عمرو کے پاس ہے۔

۵ تنگیٔ مقام کے سبب کلام کو مختصر کرنا، جیسے "هواى مع الركب الخ"

میرا محبوب اہل یمن کے قافلے کے ساتھ جا رہا ہے، ان کا تابع ہوکر اور میرا جسم مکے میں مقید ہے، (هواي) "الذي أهواه" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

تشریح: معرفہ کی چھٹی قسم وہ اسم ہے جو اقسام خمسہ مذکورہ میں سے کسی ایک کی طرف مضاف ہو، اضافت إلی المعرفۃ کا استعمال کلام میں اس وقت ہوتا ہے جب کہ سامع کے ذہن میں کسی چیز کو راسخ کرنے کے لیے اس اضافت إلی المعرفہ کے علاوہ کوئی اور طریقہ ممکن نہ ہو، یہی صورت بطور ایک طریقے کے متعین ہوجائے، جیسے "كتاب سيبويه" سیبویہ کی کتاب "سفينة نوح" نوح علیہ السلام کی کشتی۔

مذکورہ دونوں مثالوں میں "كتاب" اور "سفينه" کا معنی سامع کے ذہن میں لانے کے لیے سوائے اس کے کوئی سبیل نہ تھی کہ "سيبويه" اور "نوح" کی طرف اضافت کی جائے، کیوں کہ دیگر اقسام معرفہ مثلاً علم یا ضمیر یا اسم اشارہ وغیرہ کا استعمال اس وقت ممکن تھا جب ان دونوں چیزوں کا کوئی مستقل نام ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے، اس لیے اضافت کے ساتھ لانے سے ہر شخص اب سمجھ جائے گا کہ کتاب سے مراد وہی "الكتاب" ہے جو فن نحو میں مشہور نحوی امام "سیبویہ" نے تصنیف کی ہے اور "سفينة" سے مراد وہی مشہور کشتی ہے جو حضرت نوح نے بحکم خداوندی بنائی تھی۔

ہاں اگر تعریف کا دوسرا طریقہ ممکن ہو پھر بھی اضافت ہی کو استعمال کیا جائے تو دوسرے مقاصد کے لیے ہوگا، مثلاً:

۱؎ تعذّر التعداد: یعنی تعداد کی تفصیل بیان کرنا متعذر اور ناممکن ہوتا ہے، اس لیے اضافت کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "أجمع أهل الحقّ علی کذا" اہل حق نے اس بات پر اتفاق کیا ہے۔ یہاں چوں کہ دنیا بھر کے اہل حق کی تفصیل اوران کوشمار کرانا عادتاً ناممکن ہے، اس لیے اضافت کے ساتھ ذکر کر کے "أهل الحق" کہہ دیا، اور کبھی تعداد کا بیان ناممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہوا کرتا ہے ایسے موقع پر بھی دشواری سے بچنے کے لیے اضافت کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "أهل البلد کرام" ۔شہر کے لوگ معزز ہیں۔ شہر کے تمام لوگوں کے تعداد کا بیان کرنا اور نام بنام ان کی تفصیل کرنا محال تو نہیں البتہ دشوار ضرور ہے، اس دشواری سے بچنے کے لیے "أهل البلد" اضافت کا استعمال کیا۔

۲؎ والخروج من تبعة: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً چند لوگوں کا تذکرہ کرنا ہے، اب اگر نام بنام ان کا ذکر کیا جائے تو یہ سوال ہوگا کہ کس کا پہلے ذکر کریں اور کس کا بعد میں، پھر یہ کہ جن کا نام مؤخر ہو جائے ممکن ہے انہیں برا لگے اور ضرر پہنچانے کے درپے ہو جائیں، اس الجھن اور دشواری سے بچ نکلنے لیے اضافت کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "حضر أمراء الجند" لشکر کے تمام امیر آ گئے، اب اس طرح گویا متکلم نے پیشگی تدبیر اختیار کر لی دوسرے کے عتاب سے بچ نکلنے کے لیے۔

۳؎ والتعظیم للمضاف: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کبھی اضافت کا استعمال مضاف کی تعظیم کے لیے کرتے ہیں، جیسے "کتاب السلطان حضر" بادشاہ کا خط آیا ہے، مثال مذکور میں اگر "الکتاب حضر" کہہ دیا جاتا تب بھی خط کے آنے کی اطلاع ہو جاتی، مگر کتاب کی عظمت کو بتلانے کے لیے یہ اضافت کی گئی کہ بادشاہ کا خط آیا ہے کسی معمولی آدمی کا خط نہیں ہے۔

اسی طریقے سے اس اضافت سے کبھی مضاف الیہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے،

جیسے "هذا خادمي" یہ میرا خادم ہے، مثال مذکور میں مضاف الیہ کی تعظیم بایں طور ہو رہی ہے کہ متکلم ایسا شخص ہے جس کے پاس غلام ہیں۔

اور کبھی کبھی مضاف ومضاف الیہ کے علاوہ کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، جیسے "أخو الوزير عندي" وزیر کا بھائی میرے پاس ہے۔ مثال مذکور میں نہ تو "أخ" کی تعظیم مقصود ہے اور نہ ہی "وزیر" مضاف الیہ کی، بل کہ متکلم کی تعظیم مقصود ہے کہ متکلم اتنا معزز آدمی ہے کہ بادشاہ کے وزیر کی آمد ورفت اس کے پاس ہوتی رہتی ہے۔

۴ **والتحقير للمضاف:** کبھی کبھی اس اضافت الی المعرفہ سے مضاف کی تحقیر مقصود ہوتی ہے، جیسے "هذا ابن اللّص" یہ چور کا بیٹا ہے، اس مثال میں مضاف کی تحقیر ہے کہ یہ ایسا شخص ہے جس کا باپ چور ہے اور کبھی مضاف الیہ کی تحقیر مقصود ہوتی ہے، جیسے "اللّص رفيق هذا" چور اس شخص کا ساتھی ہے، یہاں مضاف الیہ کی تحقیر بایں طور ہو رہی ہے کہ یہ ایسا شخص ہے جس کا ساتھی چور ہے اور کبھی مضاف ومضاف الیہ کے علاوہ کی تحقیر وتذلیل مقصود ہوتی ہے، جیسے "أخو اللّص عند عمرو" چور کا بھائی عمرو کے پاس آتا جاتا ہے۔

مثال مذکور میں نہ تو "أخ" سے مضاف کی تحقیر مقصود ہے اور نہ ہی "اللّص" مضاف الیہ کی بل کہ "عمرو" کی تحقیر مقصود ہے کہ عمرو اتنا گھٹیا آدمی ہے کہ چور کے بھائی سے اس کا تعلق ہے اور چور کے بھائی کی اس کے پاس آمد ورفت رہتی ہے۔

۵ **والاختصار لضيق المقام:** مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کبھی اضافت کا استعمال وقت کی تنگی کی وجہ سے اختصار کے لیے کرتے ہیں، جیسے جعفر بن علبہ کا شعر: ؎

هو اي مع الرّكب اليمانين مصعد جنيبٌ وجثماني بمكة موثق

لغات: هَوِيَ يهوىٰ هوىً محبت کرنا (س) رَكْبٌ (ج) أركبٌ وركوبٌ، قافلہ۔ أصعدَني الأرض إصعارًا (افعال) اونچی زمین کی طرف جانا۔ جنيبٌ فرمانبردار۔ أوثق إيثاقًا (افعال) رسی سے باندھنا۔

ترکیب: هواي مضاف ومضاف الیہ مبتدا "مع الركب اليمانين" مضاف بامضاف الیہ ظرف "مصعد" خبر اول "جنيبٌ" خبر ثانی، مبتدا بہ ہر دو خبر، جملہ اسمیہ خبریہ۔ واو مستانفہ "جثماني" مضاف بامضاف الیہ مبتدا "بمكة" متعلق مقدم بہ موثق، موثق خبر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشہاد لفظ "هواي" ہے جس کو اضافت کے ساتھ لایا گیا ہے "الّذي أهواه" کے بدلے میں، کیوں کہ اگر "الّذي أهواه" کہا جاتا تو اتنا اختصار نہ ہوتا جب کہ مقصود اختصار ہے اور اختصار اس لیے مطلوب ہے کہ شاعر قید خانے میں ہے اور محبوب سفر کے لیے تیار ہے اس جدائیگی کی حالت میں شدت تکلیف اور تنگیٔ مقام کی وجہ سے چوں کہ لمبی چوڑی بات نہیں ہو پاتی اس لیے انسان چاہتا ہے کہ مختصراً ہی کچھ کہہ دے۔

وأمّا المُنادىٰ: فيُوتىٰ بِهٖ إذَا لَمْ يُعْرَفْ لِلْمُخاطَبِ عُنْوَانٌ خاصٌّ نحوُ "يا رجُلُ ويَافتىٰ"، وقَدْ يُؤتىٰ بِهٖ لِلإشَارَةِ إلىٰ عِلَّةِ مَايُطلَبُ مِنهُ نحوُ "ياغُلامُ أَحْضِرِ الطَّعامَ" و"يَاخَادِمُ أسرِجِ الفَرَسَ" أو لِغرضٍ يُمكِنُ اعتِبارُهٗ هٰهُنَا مِمَّا ذُكِرَ في النِّداءِ.

ترجمہ: بہر حال منادی تو اس کو لایا جاتا ہے جب کہ مخاطب کو کوئی خاص پتہ معلوم نہ ہو، جیسے "يا رجلُ! يا فتىٰ!" اے آدمی! اے جوان شخص! اور کبھی منادی سے اشارہ کیا جاتا ہے اس چیز کی علت کی طرف جو چیز اس سے طلب کی جا رہی ہے، جیسے "ياغلام أحضر الطعام" اے غلام کھانا لے "وياخادم اسرج الفرس" اے خادم گھوڑے پر زین کس دے۔ یا کسی ایسے مقصد کے لیے لایا جاتا ہے جس کا اعتبار کرنا یہاں ممکن ہو جن اغراض کا ندا میں ذکر کیا گیا۔

تشریح: حضرات مصنفینؒ یہاں سے معرفہ کی آخری قسم منادیٰ کا بیان کر رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ معرفہ بہ ندا کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ

مخاطب کومتوجہ کرنا ہواور اس کا نام و پتہ وغیرہ معلوم نہ ہو، جیسے "یارجل ویافتی" رجلٌ اور فتی دونوں منادیٰ ہیں، جب متکلم کو مخاطب کا کوئی خاص پتہ معلوم نہیں ہوتا ہے تو ایسے ہی عام عنوان سے پکارا جاتا ہے۔

وقد یؤتی الخ: فرماتے ہیں کہ کبھی منادیٰ کے ذریعے اس چیز کی علت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جو چیز اس منادی مخاطب سے طلب کی جاتی ہے، جیسے مہمان وغیرہ کی موجودگی میں آقا کا غلام سے کہنا "یاغلام! أحضر الطعام" اے غلام کھانا لے آ، یا سفر کے وقت کہنا "یاخادم اسرج الفرس" اے نوکر گھوڑے پر زین کس دے، اس جیسے جملے بول کر آقا موجود حضرات کو یہ تاثر دینا اور اس علت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ جس شخص سے یہ کام لے رہا ہوں وہ انہیں جیسے کاموں کے لیے ہے، گویا "غلامیت" اور "خادمیت" ان امور کی علت ہے، جو علت لفظ غلام اور خادم سے خود سمجھی جارہی ہے۔

اور کبھی ان اغراض کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی منادیٰ کو لاتے ہیں جن کا اعتبار ندا کی بحث میں ممکن ہو۔

وأمَّا النَّكِرةُ: فيُوتى بِهَا إذا لم يُعلَمْ لِلْمَحكِيْ عنهُ جِهةُ تعرِيفٍ، كَقَولِكَ "جاءَ هٰهُنَا رجلٌ" إذَا لم يُعرَفْ مايُعَيِّنُهُ مِنْ علَمٍ أو صِلةٍ أو نحوِهِمَا وقَدْ يُؤتى بِهَا لِأغراضٍ أُخرىٰ.

١۔ كالتَّكثيرِ والتَّقليلِ نحوُ "لِفُلانٍ مالٌ" و "رِضوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أكبَرُ" أيْ مالٌ كثيرٌ ورِضوانٌ قلِيلٌ.

٢۔ والتَّعظِيمِ والتَّحقِيرِ نحوُ ؎

لَهُ حاجِبٌ عن كلِّ أمرٍ يشِينُهُ ولیسَ لهُ عنْ طالبِ العُرفِ حاجِبٌ

٣۔ والعُمُومِ بعدَ النَّفيِ نحوُ "ماجَاءَ نا مِنْ بشِير" فإنَّ النكِرَةَ في سِياقِ النَّفيِ تعُمُّ.

٤۔ وقصْدِ فردٍ مُعيَّنٍ أو نوعٍ كذلكَ نحوُ "واللّٰهُ خلقَ كُلَّ دابَّةٍ مِن مَّاءٍ"

٥۔ وإخفاءِ الأمرِ نحوُ "قال رجُلٌ إنَّكَ انحرفتَ عنِ الصَّوابِ" تُخْفِيْ اسْمهٗ حتّٰى لايَلحَقَهٗ أذىً.

ترجمہ: بہرحال نکرہ، پس اسے اس وقت لایا جاتا ہے جب محکی عنہ (مسند الیہ) کے بارے میں کوئی جہت تعریف معلوم نہ ہو، جیسے تمہارا قول "جاء ھھنا رجلٌ" یہاں ایک آدمی آیا۔ اس وقت جب کہ علم وصلہ وغیرہ میں سے کوئی جہت یا صورت معلوم نہ ہو جو اس کی مراد کو متعین کرے اور کبھی نکرہ کو دوسرے مقاصد کے لیے لایا جاتا ہے، جیسے:

۱ تکثیر و تقلیل مثلاً "لفلان مالٌ" فلاں کے پاس بہت مال ہے "ورضوانٌ مِّن اللّٰهِ اکبر" اور اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سی رضامندی بھی بہت بڑی چیز ہے، یعنی مال کثیر اور رضامندی قلیل۔

۲ تعظیم وتحقیر کے لیے جیسے لہ حاجب الخ

اُس (محبوب) کے لیے مانع عظیم ہے ہر اس چیز سے جو اس کو عیب دار کرے، لیکن ممدوح کے پاس بھلائی کے طالب کے لیے کوئی مانع نہیں۔

۳ نفی کے بعد عموم کے لیے، جیسے "ماجاء نا من بشیر" ہمارے پاس کوئی بھی خوشخبری دینے والا نہیں آیا۔ کیوں کہ نکرہ نفی کے تحت عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

۴ کسی فردِ معین یا کسی نوع معین کا ارادہ، جیسے "وَاللّٰهُ خلقَ كُلَّ دابَّةٍ مِنْ مَّاءٍ" اور اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے۔

۵ بات کو چھپانے کے لیے، جیسے "قال رجلٌ إنّك انحرفت عن الصّواب" ایک شخص نے کہا تم سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہو۔ تم اس شخص کا نام چھپا رہے ہوتا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

تشریح: معرفہ کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد اب حضرات

مصنفینؒ نکرہ کا بیان فرمارہے ہیں کہ نکرے کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ محکی عنہ (مسندالیہ) کے بارے میں کوئی بھی تعریف کی جہت معلوم نہ ہو، جیسے کسی آدمی کو خبر دیتے ہوئے کہنا "جاء ھٰھنا رجلٌ" یہاں ایک شخص آیا۔ مثال مذکور میں "رجلٌ" کو نکرہ لایا گیا ہے، اس لیے کہ متکلم کو اس کے بارے میں کوئی بھی جہت تعریف معلوم نہیں جس کی وجہ سے اس کی نکارت میں کچھ کمی کردے، مثلاً اس کا نام یا صلہ وغیرہ، کیوں کہ اگر کچھ بھی معلوم ہوتا تو اس میں کچھ تخصیص ہوجاتی اور بالکل نکرہ نہ رہ جاتا۔

وقد یؤتٰی بھا: فرماتے ہیں کہ نکرہ کو دوسرے مقاصد کے لیے بھی لایا جاتا ہے، جیسے:

۱ تکثیر کے لیے جیسے "لفلان مالٌ" فلاں کے پاس بہت مال ہے، اس مثال میں "مالٌ" کی تنوین تکثیر کے لیے ہے اور مراد مال کثیر ہے یعنی فلاں کے پاس مال بہت زیادہ ہے، اسی وجہ سے اس کی وضاحت "کثیرٌ" سے کی گئی ہے، اسی طریقے سے تقلیل کے لیے بھی نکرہ کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "رضوانٌ من اللّٰہ أکبر" اللہ تعالیٰ کی معمولی رضامندی بھی بہت بڑی چیز ہے، آیت کریمہ کے اس جز میں "رضوانٌ" کی تنوین تقلیل کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی تھوڑی رضامندی بھی بہت بڑی چیز اور بڑی کامیابی ہے، اسی وجہ سے اس کی وضاحت "قلیل" سے کی گئی ہے۔

۲ والتعظیم حضرات مصنفین فرماتے ہیں کہ نکرہ کو کبھی کبھی تعظیم اور تحقیر کے لیے لایا جاتا ہے، جیسے ؎

له حاجب عن کل أمر یشینه　　ولیس له عن طالب العرف حاجب

لغات: حَجَبَ یحجُبُ حجبًا (ن) روکنا، حاجِبٌ ج حواجِبُ مانع، رکاوٹ، شان یشِینُ شینًا (ض) عیب لگانا، عرفٌ جود،

بخشش، عطیہ۔

ترکیب: لہ متعلق بہ ثابتٌ خبر مقدم، "حاجبٌ" موصوف "عن کلّ امرٍ" جار با مجرور متعلق مقدم بہ "یشین" فعل با فاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صفت، موصوف باصفت مبتدا، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ شدہ معطوف علیہ، واو عاطفہ، "لیس" فعل ناقص، "لہ وعن طالب العرف" ہردو مجرور متعلق بہ ثابتاً محذوف کے ہوکر خبر مقدم "حاجبٌ" اسم مؤخر، لیس فعل ناقص اپنے اسم وخبر سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں پہلے "حاجب" کا نکرہ تعظیم کے لیے اور دوسرے "حاجب" کا نکرہ تحقیر کے لیے ہے اس طریقے سے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ممدوح کے لیے ہر عیب لگانے والی شئ سے ایک بڑا مانع ہے یعنی ممدوح ایسا بے غبار شخص ہے کہ اگر کوئی عیب لگانا چاہے تو اس پر عیب نہیں لگا سکتا، بل کہ عیب اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا، اور جہاں تک ممدوح سے احسان طلب کرنے کا تعلق ہے تو احسان طلب کرنے والے کے واسطے اس کے لیے معمولی سی بھی رکاوٹ نہیں ہے، چہ جائے کہ کوئی بڑی رکاوٹ ہو، یعنی ممدوح کا دربار کھلا ہے، جو چاہے جب چاہے احسان طلب کرسکتا ہے۔

۳ والعموم بعد النفی: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کبھی نکرہ نفی کے بعد واقع ہوتا ہے تو ایسی صورت میں عموم کا فائدہ دیتا ہے، یعنی ہر فرد سے نفی ہو جاتی ہے، جیسے "ماجاء نا من بشر" اس آیت میں "بشیر" ہی محل استشہاد ہے، جو نکرہ کے بعد واقع ہے، جس کی وجہ سے بشیر کے ہر فرد سے نفی ہو رہی ہے یعنی کوئی بھی بشارت دینے والا نہیں آیا۔

۴ وقصد فرد معین: کبھی نکرہ اس لیے لاتے ہیں تا کہ فردِ معین اور نوع معین پر دلالت کرے، یعنی کبھی تو اس نکرے سے وحدت شخصیہ مراد ہوتی ہے

اور کبھی وحدت نوعیہ، جیسے باری تعالیٰ کا قول "وَاللّٰه خلق كلّ دابّةٍ مّن ماء" اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ آیت مذکورہ میں محل استشہاد "دابّةً" اور "ماءٍ" ہیں جو دونوں نکرہ ہیں اور ان دونوں سے وحدت شخصیہ اور وحدت نوعیہ دونوں مراد ہو سکتی ہیں، اگر وحدت شخصیہ یعنی فرد معین مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو ایک شخص سے پیدا کیا، یعنی اس کے باپ کے نطفے سے۔

اور اگر وحدت نوعیہ یعنی نوع معین مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک نوع کو، نطفے کی ایک خاص نوع سے پیدا کیا جو اس نوع کے ساتھ خاص ہے، یعنی انسان کو انسان کے نطفے سے، گھوڑے کو گھوڑے کے نطفے سے، بکری کو بکرے کے نطفے سے وغیرہ، ایسا نہیں کہ کسی انسان کو گھوڑے کے نطفے سے پیدا کر دیا ہو۔

(۵) وإخفاء الأمر: کبھی نکرہ لانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بات دوسروں سے مخفی رہے تا کہ کوئی اور اس سے واقف نہ ہو سکے، جیسے "قال رجلٌ إنّك انحرفت عن الصواب" ایک شخص نے کہا تم راہِ راست سے ہٹ گئے۔ مثال مذکور میں "رجلٌ" محل استشہاد ہے اور اس کو نکرہ اس لیے لایا گیا ہے تا کہ دوسرے لوگ اس کے نام سے آگاہ نہ ہو سکیں، اس لیے کہ اگر آگاہ ہو جائیں تو ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کو تکلیف پہنچا دے۔

البَابُ الخَامِسُ في الإطْلاقِ والتَّقييْدِ

إذَا اقْتُصِرَ في الجُملةِ علَى ذِكرِ المُسْنَدِ والمُسنَدِ إلَيهِ فالحُكمُ مُطلَقٌ وإذا زِيدَ علَيهَا شيْءٌ مِمَّا يتعلَّقُ بِهِمَا أو بأَحَدِهِمَا فالحُكمُ مقيَّدٌ، والإطلاقُ يكُونُ حيثُ لايتعلَّقُ الغرضُ بِتقْييدِ الحُكمِ بوجهٍ مِنَ الوُجُوهِ لِيذْهبَ السَّامِعُ فيهِ كُلَّ مذهَبٍ مُمْكِنٍ، والتَّقيِيدُ يكونُ حيثُ يتعلَّقُ

الغرضُ بِتقْييدِهِ بِوجهٍ مخصُوصٍ لَو لَمْ يُراعَ تفُوتُ الفَائدةُ المَطْلُوبَةُ ، ولِتفْصِيلِ هٰذا الإجمالِ نقُولُ إنَّ التَّقيِيدَ يكونُ بِالمَفاعِيلِ ونحوِهَا والنَّواسخِ وِالشَّرطِ والنَّفيِ والتوابِعِ وغيرِ ذالك .

أمّا المفَاعِيلُ ونحوُهَا: فالتَّقييدُ بها يكونُ لِبيانِ نوعِ الفعلِ أو ماوقَعَ عليهِ أو فيهِ أو لأجلهٖ أو بِمُقارَنَتِهٖ أو بيانِ المُبهمِ مِنَ الهَيئَةِ والذَّاتِ أو بيانِ عدَمِ شُمُولِ الحُكمِ ، وتكُونُ القُيُودُ محطَّ الفَائِدةِ ، والكلامُ بِدُونِها يكونُ كاذِبًا أو غيرَ مقصُودٍ بِالذَّاتِ نحوُ و "ماخلَقْنا السّمٰواتِ والأرضَ ومَابينَهُمَا لاعِبِينَ"

پانچواں باب اطلاق اور تقیید کے بیان میں

جب جملے میں مسند اور مسند الیہ کے ذکر پر اکتفا کیا جائے تو حکم مطلق ہوگا اور جب ان دونوں (مسند و مسند الیہ) پر کچھ زیادتی کردی جائے (جملے میں) یا ان دونوں میں سے کسی ایک پر تو حکم مقید ہو جائے گا اور اطلاق اس جگہ میں ہوتا ہے جہاں کسی بھی طریقے سے حکم کو مقید کرنے سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو، تاکہ سامع اس میں ہر ممکن طریقہ اختیار کر سکے اور تقیید وہاں ہوتی ہے جہاں اس کو کسی مخصوص طریقے سے مقید کرنے سے کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو فائدۂ مطلوبہ فوت ہو جائے، اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہم کہتے ہیں:

تقیید مفاعیل کے ساتھ ہوتی ہے اسی طرح نواسخ (افعال ناقصہ وغیرہ) اور شرط، نفی، اور توابع وغیرہ سے۔

بہر حال مفاعیل اور ان کے مثل تو تقیید ان کے ذریعے فعل کی نوعیت کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہے، یا اس چیز کو بیان کرنے کے لیے جس پر فعل واقع ہو، یا اس جگہ کو بیان کرنے کے لیے جس میں فعل واقع ہو، یا فعل کی وجہ بیان کرنے

کے لیے، یا جس کی مقارنت کے لیے فعل واقع ہوا ہے یا تقیید، مبہم ہیئت اور مبہم ذات کو بیان کرنے کے لیے ہوتی ہے یا حکم کی عدم شمولیت کو بیان کرنے کے لیے اور یہ قیودات محل فائدہ ہوتی ہیں اور کلام ان کے بغیر کاذب یا غیر مقصود بالذات ہوتا ہے، جیسے "وماخلقنا السمٰوات والأرض ومابينهما لاعبين" اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔

تشریح: اس پانچویں باب میں حضرات مصنفینؒ جملے کو مطلق اور مقید لانے کے ضابطے اور ان کے فوائد پر روشنی ڈال رہے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی جملے میں صرف مسند اور مسند الیہ کا ذکر کیا جائے اور کوئی چیز مذکور نہ ہو تو حکم مطلق مانا جائے گا اور اگر مسند و مسند الیہ کے علاوہ کسی اور چیز کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کا تعلق دونوں سے ہے یا مسند و مسند الیہ میں سے کسی ایک سے ہے تو وہ حکم مقید مانا جائے گا۔

اطلاق ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں متکلم کا مقصد محض اپنی بات کو مخاطب کے سامنے پیش کرنی ہوتی ہے بغیر کسی تفصیل وتشریح کے۔ اور تقیید ایسے مقامات پر ہوتی جہاں متکلم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پوری وضاحت سے مخاطب کے سامنے اپنی بات پیش کرے، اب ایسے موقع پر اگر قیودات لگا کر اپنی بات کو پیش نہیں کرے گا، تو وضاحت نہیں ہو پائے گی، اور مطلوبہ فائدہ ومقصد حاصل نہ ہوگا، مثلاً ایک شخص کو یہ کہنا ہے کہ "زید نے قرآن حفظ کرلیا" وہ اگر صرف اتنا کہہ دے "زيدٌ حفظ القرآن" تو بات مکمل ہوگئی، مگر یہ حکم، حکم مطلق ہے، لیکن اگر ایک شخص کو یہ کہنا ہے کہ زید نے فلاں سنہ میں قرآن حفظ کیا" تو صرف "زيدٌ حفظ القرآن" کہنا کافی نہ ہوگا، بل کہ "في سنة كذا" کی بھی قید لگانی ہوگی، ورنہ بات واضح نہ ہوگی، اور فائدۂ مطلوبہ حاصل نہ ہوگا۔

واضح رہے کہ کبھی حکم کو مطلق رکھنے میں فائدہ رہتا ہے جب کہ کبھی مقید کرنے میں فائدہ رہتا ہے جیسا کہ ماقبل میں گذرا، مطلق کا فائدہ یہ رہتا ہے کہ مخاطب کو اس جملے کے حکم کے متعلق پورا اختیار رہتا ہے کہ جو چاہے اس کلام سے مراد لے، مثلاً "زیدٌ حفظ القرآن" زید نے قرآن حفظ کرلیا، اس مثال میں چوں کہ صرف مسند و مسند الیہ مذکور ہے اور کچھ نہیں ہے اس لیے مخاطب یہ بھی مراد لے سکتا ہے کہ ایک سال میں کیا یا دو سال میں یا اس سے زیادہ میں، پھر یہ کہ بچپن میں حفظ کیا یا جوانی میں جب کہ یہ بات حکم مقید میں نہیں ہوتی۔

ان اجمالی باتوں کے بعد مصنفینؒ ان چیزوں کو بیان فرمارہے ہیں جن کی وجہ سے حکم مقید ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ حکم مفعولات، نواسخ (افعال ناقصہ، حروف مشبہ بہ فعل وغیرہ) حروف شرط، نفی اور توابع وغیرہ سے مقید ہوتا ہے پھر ہر ایک کی وضاحت فرمارہے ہیں۔

أمّا المفاعیل: فرماتے ہیں کہ حکم کو مفاعیل (پانچوں مفعول) سے مقید کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو فعل کی نوعیت معلوم ہوجاتی ہے اگر مفعول (مفعول مطلق) ہو اور نوعیت کے بیان کے لیے ہو، جیسے "جلست جلسة الأستاذ" میں استاذ کی طرح بیٹھا۔ اور اگر مفعول بہ کے ساتھ مقید کیا جائے تو مقصد اس اسم کا بیان کرنا ہوتا ہے، جس پر فعل واقع ہوا ہو، جیسے "ضرب الأستاذ التلمیذ" میں "التلمیذ" اور کبھی فعل کی جگہ، یا وقت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اگر جملے میں مفعول فیہ کو ذکر کیا جائے جیسے "ضرب الأستاذ التلمیذ یوم الخمیس في الفصل" استاذ نے طالب علم کی جمعرات کو درس گاہ میں پٹائی کی۔ "یوم الخمیس" سے وقت، اور "في الفصل" سے جگہ معلوم ہوگئی اور کبھی کبھی حکم کی علت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب جملے میں مفعول لہ کا تذکرہ کردیا جائے، جیسے "لم أسافر خوفًا من الحرّ الشدید" میں نے سخت

گرمی کے خوف سے سفر نہیں کیا۔ مثال مذکور میں ''خوفًا من الحرّ الشدید'' سے سفر نہ کرنے کی وجہ معلوم ہو رہی ہے، اور کبھی تقیید سے مقارنتِ فعل بتلانا مقصود ہوتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب جملے میں مفعول معہ کا ذکر کر دیا جائے، جیسے ''جاء المسافر والمتاعَ'' مسافر سامان کے ساتھ آیا۔ یہاں ''والمتاعَ'' سے معیت اور مقارنت معلوم ہو رہی ہے، اسی طریقے سے حکم کو مقید کر دینے سے کبھی مبہم ہیئت اور ذات کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب جملے میں حال اور تمیز کو ذکر کر دیا جائے، جیسے ''جاء زیدٌ راکبًا'' ''راکبًا'' سے آنے کی مبہم ہیئت کی وضاحت ہو رہی ہے اور ''طاب زیدٌ علمًا'' میں ''علمًا'' سے مبہم ذات کی وضاحت ہو رہی ہے، پہلی مثال حال کی ہے اور دوسری مثال تمیز کی۔

اور کبھی تقیید سے مقصود حکم کے عدم شمول کو بیان کرنا ہوتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب جملے کو مستثنیٰ کے ذریعے مقید کیا جائے، جیسے ''نجح الطلاب إلاّ المتکاسلین'' طلبہ کامیاب ہو گئے مگر سستی برتنے والے (کامیاب نہیں ہوئے) مثال مذکور میں ''إلاّ'' کے ذریعہ متکاسلون کا استثنا کر لیا گیا ہے اور نجاح کا حکم ان کو شامل نہیں ہے۔

وتکون القیود الخ: فرماتے ہیں کہ ان قیودات سے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اگر قیودات کو ذکر نہ کیا جائے تو کبھی کبھی کلام کاذب یا غیر مقصود بالذات ہو جاتا ہے، جیسے باری تعالیٰ کا قول ''وماخلقنا السمٰوات والأرض ومابینهما لاعبین'' ''اور ہم نے آسمان وزمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان ہیں اس طور پر نہیں پیدا کیا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہیں۔

آیت مذکورہ میں اگر ''لاعبین'' کی قید نہ ہوتی تو یہ جملہ کاذب ہو جاتا، کیوں کہ اس صورت میں مطلب یہ ہوتا کہ ''ہم نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا،'' یعنی ان کا خالق ہمارے علاوہ کوئی اور ہے،

حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ تمام چیزوں کا خالق اللہ رب العزت ہی ہے۔
کلام کے غیر مقصود بالذات ہونے کی مثال، جیسے ”كان زيدٌ مسافرًا“ زید مسافر تھا مثال مذکور میں زید کے مسافر ہونے کی خبر دی جارہی ہے زمانہ گذشتہ میں، لیکن اگر ”کان“ کو حذف کر دیا جائے تو جملہ ہو جائے گا زیدٌ مسافرٌ ”زید مسافر ہے“ یعنی اس خبر کا تعلق زمانۂ حال سے ہو جائے گا نہ کہ ماضی سے۔ اور یہ غیر مقصود بالذات ہے، اس لیے کہ مقصد زمانۂ ماضی کے متعلق خبر دینا ہے نہ کہ زمانۂ کے متعلق۔

وأمَّا النَّواسِخُ فَالتَّقْيِيدُ بِهَا يكُونُ لِلأغْراضِ الَّتِي تُؤدِّيهَا معَانِيْ أَلفَاظِ النَّواسِخِ كَالاستِمرارِ أوِ الحِكايةِ عنِ الزَّمنِ في ”كانَ“ والتوقِيتِ بِزمَنٍ معيَّنٍ فِي ”ظَلَّ وبَاتَ وأصبَحَ وأمسٰى وأضحٰى“ أو بِحالةٍ معيَّنةٍ في دَامَ والمقاربَةِ في ”كادَ وَكرُبَ ، وَأوْشكَ“ واليَقِين في ”وجَدَ وألفٰى ودرىٰ وتعلَّمَ“ وهَلُمَّ جرًّا ، فالجُملةُ في هٰذا ، تنعَقِدُ مِنَ الاسمِ والخبَرِ أو منَ المفعُولينِ فقَطْ ، فإذا قُلتَ ”ظَنَنْتُ زيدًا قائِمًا“ فمعنَاهُ زيدٌ قائمٌ علٰى وجهِ الظَّنِّ .

ترجمہ: بہر حال نواسخ تو ان کے ذریعہ جملے کو مقید کرنا ان اغراض کے لیے ہوتا ہے جو کہ الفاظ نواسخ کے معانی ادا کرتے ہیں، جیسے استمرار یا زمانے کی حکایت ”کان“ میں اور کسی معین زمانے کے ساتھ موقت کرنا ”ظل ، بات، أصبح ، أمسٰى ، أضحٰى“ میں، یا کسی متعین حالت سے مقید کرنا ”دام“ میں اور مقاربت کا معنٰی ”کاد ، کرب ، أوشك“ میں اور یقین ”وجد ، ألفٰى ، دریٰ ، تعلّم“ میں اور اسی طریقے سے دیگر۔
تو جملہ اس صورت میں (نواسخ کے ساتھ مقید کرنے کی صورت میں) صرف اسم وخبر یا دو مفعولوں سے مرکب ہوتا ہے لہٰذا جب تم نے کہا ”ظننت زیدًا

قائمًا" تو اس کا مطلب "زیدٌ قائمٌ علی وجہ الظّن" ہوا (زید میرے گمان کے مطابق کھڑا ہے)

تشریح: وأما النواسخ: یہاں سے حضرات مصنفینؒ نواسخ کے ساتھ جملے کو مقید کرنے کے فوائد بیان کر رہے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ نواسخ، یعنی افعال ناقصہ، حروف مشبہ بہ فعل، افعال مقاربہ وغیرہ کے ساتھ مقید کرنا ان مقاصد کے لیے ہوتا ہے جو کہ الفاظ نواسخ کے معانی ادا کرتے ہیں، مثلاً افعال ناقصہ میں سے "کان" استمرار زمانہ کو بتلاتا ہے تو کان کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ سے استمرار اور حکایتِ زمان ہوگی جیسے "کان زیدٌ صائمًا" زید روزے دار تھا، یہاں کان زمانہ ماضی کو بتلا رہا ہے، اسی طریقے سے "ظلّ ، بات ، أصبح ، أمسٰی ، أضحٰی" یہ افعال وقت معین پر دلالت کرتے ہیں تو ان افعال کے ساتھ مقید کرنے کی وجہ وقت معین مراد لینا ہوگی، چناں چہ "ظلّ" دن کو بتلاتا ہے، جیسے "ظلّ المطر غزیرًا" پورے دن موسلا دھار بارش رہی، اور "بات" رات کے وقت کو بتلاتا ہے، جیسے "بات المریض نائمًا" مریض پوری رات سوتا رہا، اور "أصبح" صبح کے وقت کو بتلاتا ہے، جیسے "أصبح زیدٌ فقیرًا" زید صبح کو محتاج ہوگیا، اور أمسٰی شام کے وقت پر دلالت کرتا ہے، جیسے "أمسٰی خالدٌ مصلّیًا" خالد شام کو نمازی ہوگیا، اسی طریقے سے "أضحٰی" چاشت کے وقت کو بتلاتا ہے، جیسے "أضحٰی زیدٌ أمیرًا" زید چاشت کے وقت امیر ہوگیا۔

یوں سمجھو کہ اگر مقصد دن کے وقت میں کسی چیز کو بتلانا ہے تو "ظلّ" کا استعمال کریں گے، رات کے لیے "بات" صبح کے لیے "أصبح" شام کے لیے "أمسٰی" اور چاشت کے لیے "أضحٰی" کا استعمال کریں گے۔

اسی طریقے سے "دام" دوام پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا اگر دوام کا معنی مراد لینا ہے تو دام کی قید سے مقید کریں گے، جیسے "دام ھٰذا القلم جدیدًا" یہ قلم نیا

ہی رہا۔ یعنی اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہا اور اگر فعل کے قریب ہونے کو بتلانا ہوتا ہے تو افعال مقاربہ "كاد ، كرب ، أوشك" کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "كاد هٰذا المريض أن يموت" قریب تھا کہ یہ بیمار جاں بحق ہوجائے۔ اسی طریقے سے اگر یقین کا معنی مراد لینا ہوتا ہے تو "وجد ، ألفى ، درىٰ ، تعلّم" وغیرہ افعال کی قید سے جملے کو مقید کردیتے ہیں، جیسے "كنتُ وجدتُ في نفسي أن انجح في الامتحان" مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میں امتحان میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

فالجملة في هٰذا: فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں بھی (جب کہ جملے کو نواسخ کے ساتھ مقید کردیا جائے) جملہ یا تو اسم وخبر (مبتدا وخبر) سے مرکب ہوگا یا تو دو مفعولوں سے، جیسے کہ "تقیید بالنسخ" سے پہلے تھا، رہا ناسخ تو وہ محض ایک قید ہوتا ہے اس کی وجہ سے اجزاء جملہ میں اضافہ نہیں ہوتا، مثلاً "كان زيدٌ قائمًا" اصل میں "زيدٌ قائمٌ" تھا، "كان" نے داخل ہوکر مبتدا اور خبر کے حکم کو منسوخ کردیا اور مبتدا "كان" کا اسم اور خبر "كان" کی خبر ہوگئی، اسی طریقے سے "ظننت زيداً قائماً" بھی اصل میں "زيدٌ قائمٌ" تھا "ظننت" نے داخل ہوکر مبتدا اور خبر کے حکم کو منسوخ کردیا اور انہیں اپنا مفعول بنالیا، لیکن اگر کوئی "ظننت" کے داخل ہونے کے باوجود بھی ان دونوں کو پہلی حالت پر باقی رکھنا چاہے اور ظن کا بھی معنی پیدا کرنا چاہے تو یوں کہہ سکتا ہے "زيدٌ قائمٌ على وجه الظن"

وَأَمَّا الشَّرطُ: فالتَّقييدُ بهِ يكُونُ للأغراضِ الَّتِي تُؤدِّيهَا معَانِي أدَواتِ الشَّرطِ كالزَّمانِ في "متىٰ وأيَّانَ" والمَكانِ في "أينَ وأنّىٰ" و "حيثُمَا" والحالِ في "كيفَمَا" واستِيفاءُ ذٰلكَ وتحقِيقُ الفرقِ بينَ الأدواتِ يُذكَرُ فِي علمِ النَّحوِ وإنَّمَا يُفرقُ هٰهُنَا بينَ "إنْ وإذا ولَو"

لاختِصاصِهَا بِمزایَا تعَدُّ مِن وُجُوهِ البَلاغَةِ .

ترجمہ: اور بہر حال شرط، تو اس کے ذریعہ مقید کرنا ان اغراض کے لیے ہوتا ہے جو ادوات شرط کے معانی ادا کرتے ہیں، مثلاً زمان "متیٰ" اور "أیّان" میں، اور مکان "أین ، أنّی ، حیثما" میں اور حال "کیفما" میں اور اس بحث کی تفصیل اور حروف شرط کے درمیان فرق کی بحث و تحقیق علم نحو میں ہوتی ہے۔

یہاں صرف إن ، إذا اور لو کے درمیان فرق بیان کیا جا رہا ہے ان کی کچھ ایسی خصوصیات کے ساتھ مخصوص ہونے کی وجہ سے جن کا شمار اسباب بلاغت میں سے ہوتا ہے۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنّفینؒ نے شرط کے ساتھ حکم کو مقید کرنے کی وجہ بیان کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ حکم کو شرط کے ساتھ مقید کرنا ان مقاصد کے لیے ہوتا ہے جو ادوات شرط کے معانی ادا کرتے ہیں، مثلاً ادوات شرط میں سے "متی" اور "أیان" ہیں جو دونوں وقت پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا "متیٰ" اور "أیّان" کو کسی جملے میں استعمال کرنے کا مقصد وقت مراد لینا ہوگا، جیسے کسی نے کہا "متیٰ ذهبت إلی البیت" تم گھر کب گئے تھے؟ یہاں قائل کا مقصد وقت کو معلوم کرنا ہے۔

اسی طریقے سے أین ، أنّی ، حیثما یہ تینوں جگہ کو بتلاتے ہیں، تو کلام کو ان الفاظ کے ساتھ مقید کرنے کا مقصد جگہ کو معلوم کرنا ہوگا، جیسے کوئی کہے "أین کنت ذهبتَ" تم کہاں گئے تھے؟ تو مطلب یہ ہوگا کہ تم اس جگہ کو بتلاؤ جہاں گئے تھے اور "کیفما" حال دریافت کرنے کے لیے آتا ہے، مثلاً کسی نے کہا "کیفما أنت" آپ کیسے ہیں؟ تو مطلب یہ ہے کہ آپ صحت و بیماری وغیرہ کے متعلق اپنی حالت بیان کریں۔

واستیفاء ذلك: فرماتے ہیں کہ اس بحث کی مکمل وضاحت نحو کی کتابوں

میں کی جاتی ہے۔

وتحقیق الفرق: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ ادوات شرط کے مابین کچھ فرق بھی ہے، مگر ان فروق کی تحقیق ہم یہاں نہیں بیان کریں گے، اس لیے کہ بلاغت سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے، بل کہ ان کا تذکرہ علم نحو کی کتابوں میں ہوتا ہے، البتہ صرف إن إذا اور لو کے مابین پائے جانے والے فرق کو واضح کیا جائے گا، کیوں کہ ان تینوں میں کچھ ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن کا تعلق اسباب بلاغت سے ہے۔

فـ"إن" و"إذا" للشَّرطِ في الإستِقبال وَ"لَو" للشَّرطِ في المُضيِّ، والأصلُ في اللَّفظِ أن يتَّبعَ المعنىٰ فيكُونُ فِعلاً مُضارِعًا مَعَ إن وإذا ومَاضِيًا مَعَ لَو نحوُ "وإن يستغِيثُوا يُغاثُوا بِماءٍ كَالمُهلِ" ع "وإذا تُرَدُّ إلىٰ قَلِيلٍ تقنَعُ" و "لَوشَاءَ لَهَداكُم اَجمعِينَ"

والفَرقُ بينَ إن وإذا أنَّ الأصلَ عدمُ الجزمِ بِوُقُوعِ الشَّرطِ مَعَ إن والجزمُ بِوُقُوعِهِ مَعَ إذا ولِهٰذا غلَبَ استِعمَالُ المَاضِي مَعَ إذا، فكَأنَّ الشَّرطَ واقِعٌ بِالفِعلِ، بِخلافِ إنْ، فإذَا قُلتَ "إنْ أبرأُ مِنْ مَرَضِي أتصَدَّقُ بِألفِ دِينَارٍ" كُنتَ شَاكًّا في البُرءِ، وإذَا قُلتَ: "إذا بَرِئتُ مِنْ مرَضِي تصدَّقتُ" كنتَ جازِمًا بِهِ أو كَالجَازِمِ، وعلىٰ ذٰلكَ فالأحوالُ النادِرةُ تُذكَرُ فِي حيِّزِ إن والكَثيرَةُ فِي حيِّزِ إذا، ومِنْ ذٰلكَ قَولُهُ تعالىٰ "فإذا جآءتهُمُ الحسنَةُ قالُوا لنَا هذِهِ وإنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسىٰ ومَنْ مَّعهُ" فلِكَونِ مجيءِ الحسنَةِ مُحقَّقاً إذِ المُرادُ بِهَا مُطلَقُ الحسَنَةِ الشَّامِلُ لأنواعٍ كثيرةٍ كَمَا يُفهَمُ مِنَ التَّعرِيفِ بِألِ الجِنسِيَّةِ ذُكِرَ مَعَ إذا، وعُبِّرَ عنهُ بِالمَاضِي، ولِكَونِ مجيءِ السَّيِّئةِ نادِرًا إذِ المُرادُ بِهَا نوعٌ مخصُوصٌ كَما يُفهَمُ مِنَ التَّنكِيرِ، وهُوَ الجَدبُ ذُكِرَ مَعَ إنْ، وعبِّرَ عنهُ بِالمُضارِعِ؛

فَفِي الآية مِنْ وصْفِهِمْ بإنكَارِ النِّعمِ وشِدَّةِ التحامُلِ علٰى مُوسٰى عليهِ السَّلامُ مالايخفٰى .

ترجمہ: تو "إن" اور "إذا" استقبال میں شرط کے لیے ہیں اور "لو" شرط کے لیے ہے فعل ماضی میں، اور لفظ میں اصل یہ ہے کہ معنی کے تابع ہو، لہٰذا وہ لفظ إن اور إذا کے ساتھ فعل مضارع ہوگا اور لو کے ساتھ فعل ماضی ہوگا، جیسے "وإن يستغيثوا يغاثوا بماءٍ كالمهل" اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، "وإذا تردّ إلى قليل تقنع" اور جب نفس کو لوٹا دیا جائے مال قلیل کی جانب تو وہ قناعت کرنے والا ہوجائے گا، ولو شاء لهداكم أجمعين اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ پر لے آتا۔

اور "إن" و "إذا" کے درمیان فرق یہ ہے کہ "إن" کے ساتھ شرط کا واقع ہونا اصلاً غیر یقینی ہے اور "إذا" کے ساتھ شرط واقع ہونا یقینی ہے، اسی وجہ سے فعل ماضی کے ساتھ "إذا" کا استعمال بکثرت ہوتا ہے، کیوں کہ شرط گویا بالفعل واقع ہوچکی ہے، برخلاف "إن" کے تو جب تم کہتے ہو "إن أبرأُ من مرضي أتصدّق بألف دينار" اگر میں اپنی بیماری سے شفایاب ہوگیا تو ایک ہزار دینار صدقہ کروں گا، تو گویا تم کو شفایابی میں شک ہے اور جب تم نے کہا "إذا بَرِئْتُ مِنْ مَرَضِي تَصَدَّقتُ" جب میں اپنی بیماری شفا پاجاؤں گا تو صدقہ کروں گا، تو گویا تمہیں شفایابی کا یقین ہے، یا یقین کرنے والے کی طرح ہو، اور اسی بنیاد پر نادر اور عجیب وغریب حالت "إن" کے تحت بیان ہوتے ہیں اور کثیر الوقوع حالات "إذ" کے تحت، اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے "فإذا جاء تهم الحسنة قالوا لنا هذه وإن تصبهم سيّئة يطّيروا بموسىٰ ومن معه" سو جب ان پر خوش حالی آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لیے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے

ہیں۔تو خوش حالی کے محقق ہونے کی وجہ سے (اس لیے کہ مراد حسنہ سے مطلق حسنہ ہے جو شامل ہے بہت سی نوعوں کو جیسا کہ سمجھا جاتا ہے الف لام تعریف سے جو کہ جنسی ہے) ذکر کیا گیا ہے ''إذا'' کے ساتھ اور اس کو فعل ماضی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ''سیئۃ'' کے نادر ہونے کی وجہ سے (کیوں کہ مراد اس سے خاص قسم ہے، جیسا کہ اس کی تنکیر سے سمجھا جارہا ہے، اور وہ قحط سالی ہے) ''إن'' کے ساتھ ذکر کیا گیا اور اس کو فعل مضارع سے تعبیر کیا، تو آیت کریمہ میں کافروں کے نعمتوں کا انکار اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیے جانے والے شدت ظلم کا بیان ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

تشریح: یہاں سے مصنفینؒ ''إن'' ''إذا'' اور ''لو'' کے درمیان پائے جانے والے فرق کی وضاحت کر رہے ہیں، حضرات مصنفینؒ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ''إن'' اور ''إذا'' یہ دونوں استقبال میں شرط کے لیے مشترک ہیں، جب کہ ''لو'' ماضی کے ساتھ خاص ہے، مطلب یہ ہے کہ إن اور إذا ان دونوں سے استقبال کا ترجمہ ہوتا ہے، خواہ فعل ماضی ہی پر داخل ہوں اگر چہ یہ کم ہے اور ''لو'' سے فعل ماضی کا ترجمہ ہوتا ہے اور لفظ کے سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ ''وہ معنی کی موافقت کرتا ہے اور اسی کے تابع ہوتا ہے اور جب یہ ضابطہ ہے تو چوں کہ إن اور إذا مستقبل کا معنی دیتے ہیں، اس لیے یہ دونوں فعل مضارع پر داخل ہوں گے، کیوں کہ فعل مضارع ہی استقبال کا معنی دیتا ہے اور ''لو'' کا دخول فعل ماضی پر ہوگا کیوں کہ وہ ماضی کا معنی دیتا ہے، إن کی مثال جیسے ''**وإن یستغیثوا یغاثوا بماءٍ کالمهل**'' اگر وہ لوگ فریاد طلب کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ذریعہ جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا۔

آیت مذکورہ میں ''إن'' کے ساتھ فعل مضارع واقع ہوا ہے، اور ترجمہ بھی استقبال ہی کا ہو رہا ہے، اور جیسے ''**وإذا تردّ إلی قلیل تقنع**'' یہ مثال ''إذا'' کی

ہے یہاں بھی "إذا" فعل مضارع پر داخل ہے، اور "ولوشاء لهداكم أجمعين" اوراگر وہ چاہتا تو تم سب کوراہ پر لے آتا، یہ "لو" کی مثال ہے جو فعل ماضی پر داخل ہےاور ماضی کا ترجمہ ہورہا ہے۔

والفرق بين إن وإذا الخ: اوپر جوفرق بیان ہواوہ فرق لفظی تھااوراب یہاں سے مصنفینؒ إن اور إذا کے درمیان فرق معنوی کو بیان فرمارہے ہیں کہ إن شرطیہ کے ساتھ لگایاجانے والاحکم غیریقینی ہوتا ہے، جب کہ "إذا" کا ساتھ لگایا جانے والاحکم حتمی اور یقینی ہوتا ہے، اسی وجہ سے إذا کا ساتھ فعل ماضی کا استعمال بہت زیادہ ہے، یعنی چوں کہ إذا یقین کو بتلاتا ہےاور ماضی میں جوبات ہوچکی ہوتی ہے وہ بھی یقینی ہی ہوا کرتی ہے،توشرط کو ماضی کے ساتھ مقید کرنا ایسے ہی ہوا کہ گویا حقیقتاً اس کا وقوع ہو چکا ہے،خلاصہ یہ ہے کہ یقین کا فائدہ دونوں سے حاصل ہوتا ہے،اسی لیےاس مناسبت کی وجہ سے دونوں ساتھ پائے جاتے ہیں۔

فإذا قلت الخ: فرق مذکور کو مصنفینؒ ایک مثال سے واضح کرر ہے ہیں، تاکہ بات اوقع فی النفس ہوجائے،فرماتے ہیں کہ اگرکسی نے "إن" کا استعمال کرتے ہوئے کہا "إن أبرأ من مرضي أتصدق بألف دينار" اگرمیں اپنی بیماری سے شفایاب ہوجاؤں گا تو ایک ہزار دینار صدقہ کروں گا۔تو گویا کہ اسے شفایابی میں شک ہے، اس لیے کہ "إن" سے یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، برخلاف "إذا" کے کہ اگر "إذا" کا استعمال کرتے ہوئے کہا "إِذَا بَرِئْتُ مِنْ مَرَضِي تَصَدَّقْتُ" جب میں اپنی بیماری سے شفایاب ہوجاؤں گا تو صدقہ کروں گا۔ تو گویا کہ اسے شفایابی کا یقین ہے اور وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ شفایابی تو یقینی ہے، جب ہوجائے گی تو صدقہ کروں گا،اس لیے کہ إذا یقین کو بتلاتا ہے۔

وعلى ذلك: فرماتے ہیں کہ چوں کہ "إن" کی اصل عدم الجزم ہے اور إذا کی اصل الجزم بالوقوع ہے، اسی وجہ سے اگر نادر الوقوع اشیاء میں إن کا

استعمال کرتے ہیں اور کثیر الوقوع احوال کا تذکرہ کرنا ہوتا ہے تو إذا کا استعمال کرتے ہیں، کیوں کہ نادر الوقوع چیزوں کا ہونا غیر یقینی اور کثیر الوقوع کا ہونا یقینی ہوا کرتا ہے، چناں چہ باری تعالیٰ کے ارشاد میں ایسا ہی ہے، جیسے "فإذا جاءتهم الحسنة قالوا لنا هذه وإن تصبهم سيئة يطيروا بموسى ومن معه" سو جب ان پر خوش حالی آجاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے لیے ہی ہونی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی ہے تو موسیٰ اور انکے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے ہیں۔

آیت کریمہ مذکورہ میں "الحسنة" کو "إذا" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس کا وقوع بالکل محقق اور یقینی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حسنہ سے مراد مطلق حسنہ ہے جو بہت سی نوعوں کو شامل ہے اور الف لام جنسی کے ذریعہ معرفہ لانا اس کی دلیل ہے، مثلاً پیداواری، ارزانی، آرام، مال کی کثرت وغیرہ، اس کے برخلاف "سيّئة" ہے، جس کا وقوع نادر اور کم ہے، اسی لیے "إن" کے ساتھ ذکر کیا اور اس کے بعد فعل مضارع لائے، "سيئة" کے نادر الوقوع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مراد اس سے "سيئة" کی ایک خاص قسم یعنی "خشک سالی" ہے اور اس کا نکرہ لانا خود اسی کی دلیل ہے۔

آیت مذکورہ میں کافروں کے انکارِ نعمت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کیے جانے والے مظالم کی شدت کا بیان ہے۔

ولَو لِلشَّرطِ في المُضِيِّ ولِذَا يَلِيها الفِعلُ المَاضِي، نحوُ "ولَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خيرًا لأَسْمَعَهُمْ" ومِمَّا تقدَّمَ يُعْلَمُ أنَّ المَقْصُودَ بالذَّاتِ مِنَ الجُمْلةِ الشَّرْطِيَّةِ هُوَ الجوابُ، فإذَا قُلتَ "إن اجْتَهَدَ زيدٌ أكْرَمْتُهُ" كُنتَ مُخبِرًا بِأنَّكَ ستُكرِمُهُ ولكنْ في حَالِ حُصُولِ الاجتِهادِ لافي عُمُومِ الأحوالِ، ويَتفَرَّعُ على هذا أنَّها تُعَدُّ خَبرِيَّةً أو إنْشائِيَّةً بِاعْتِبارِ جَوابِها .

ترجمہ: لوشرط کے لیے ہے زمانہ ماضی میں، اسی وجہ فعلِ ماضی کا

اتصال اس کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے ”ولو علم الله فيهم خيراً لأسمعهم“ اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو ان کے سننے کی توفیق دیتے، اور تفصیل مذکور سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جملہ شرطیہ سے مقصود بالذات جواب ہوتا ہے، تو جب تم نے کہا ”إن اجتهد زيدٌ اكرمته“ اگر زید محنت کرے گا تو میں اس کا اکرام کروں گا۔ تو گویا کہ تم اس کو خبر دے رہے ہو، کہ جلد ہی تم اس کا اکرام کروگے، لیکن محنت کے پائے جانے کی صورت میں نہ کہ عمومی احوال میں اور اسی پر متفرع ہوتا ہے یہ کہ یہ جملہ خبریہ شمار کیے جائیں گے یا انشائیہ ان کے جواب کے اعتبار سے۔

تشریح: إن اور إذا کے بارے میں تفصیل بیان کرنے کے بعد اب مصنفینؒ ”لو“ کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں، کہ ”لو“ ماضی کے لیے ہے، یعنی ماضی ہی کی خبر دے گا اور اسی وجہ سے لو کا دخول بھی فعل ماضی ہی پر ہوتا ہے، جیسے ”ولو علم الله فيهم خيراً لأسمعهم“ اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو انہیں سننے کی توفیق دیتے، لیکن چوں کہ کوئی خیر تھی ہی نہیں اس لیے قبولیت کے ساتھ سننے کی توفیق بھی نہیں ملی۔

آیت مذکورہ میں ”لو“ فعل ماضی پر داخل ہے اور آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ماضی میں خیر کا ثبوت ہوتا تو انہیں سماع کی بھی توفیق ہوتی۔

ومما تقدّم: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ شرط کی بحث کا حاصل یہ نکلا کہ جملہ شرطیہ میں مقصود بالذات جواب ہوا کرتا ہے اور شرط حکم کے لیے بطور قید ذکر کی جاتی ہے، لہٰذا اگر کسی نے کہا ”إن اجتهد زيدٌ اكرمته“ اگر زید محنت کرے گا تو میں اس کا اکرام کروں گا۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ متکلم زید کے اکرام کی خبر دینا چاہتا ہے کہ اگر محنت پائی گئی تو اکرام کیا جائے گا، نہ یہ کہ ہر حال میں زید کا اکرام ہوگا۔

ويتفرّع علىٰ هذا: فرماتے ہیں کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ جملہ شرطیہ

سے مقصود بالذات جواب ہے تو اسی قاعدے کے مطابق جملہ شرطیہ کے جواب کو دیکھ کر اس کے خبریہ اور انشائیہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا، یعنی اگر جواب سے کسی چیز کے متعلق خبر دینا معلوم ہو تو جملہ خبریہ ہوگا، اور اگر کسی چیز کی طلب معلوم ہو تو جملہ انشائیہ ہوگا، رہا نفس شرط تو وہ چوں کہ ایک قید ہے اس لیے نہ وہ خبر ہے اور نہ انشاء بل کہ صرف ایک جملہ ہے۔

نوٹ: ''لوْ'' کے بارے میں نحو کی کتابوں میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''لوْ'' انتفائے ثانی کے لیے آتا ہے انتفائے اول کی وجہ سے، اس کا خلاصہ بھی وہی ہے جو ماقبل میں گزرا ہے، مثلاً ''لو جئتني لأكرمتك'' اگر تم میرے پاس آتے تو میں تمہارا اکرام کرتا، اس مثال میں گویا متکلم نے زمانۂ گزشتہ میں حصول اکرام کو مخاطب کے آنے پر موقوف کیا، یعنی چوں کہ زمانہ گزشتہ میں تمہارا آنا ہوا نہیں، اس لیے میرا اکرام بھی نہیں ہوا۔

وَأَمَّا النَّفْيُ: فالتَّقْيِيدُ بِهٖ يكُونُ لسَلْبِ النِّسبَةِ على وجْهٍ مخصُوصٍ مِمَّا تُفيدُهُ أحرُفُ النَّفيِ وهِيَ سِتَّةٌ لا، وما، وإن، ولَنْ، ولم، ولـمَّا، فَلا للنَّفْيِ مُطْلَقًا، وَمَا وإنْ لِنفْيِ الحَالِ إنْ دَخلَا على المُضارِعِ، وَلَنْ لِنفيِ الإستِقبَالِ ؛ ولَمْ ولمّا لنَفيِ المُضِيِّ ، إلَّا أنَّهُ بِلَمَّا ينسحِبُ على زَمَنِ التَّكلُّمِ ويخْتصُّ بِالمُتوَقَّعِ ، وعلى هٰذا فَلَا يقالُ: ''لَمَّا يقُمْ زيدٌ ثُمَّ قامَ'' ولا ''لمَّا يجتمع النقيضان'' كما يقال: ''لم يقم ثمّ قام'' ولمْ يجْتَمِعَا ، فلمَّا فِيْ النَّفيِ تُقابِلُ قَدْ في الإثباتِ، وحِينَئِذٍ يكُونُ مَنْفِيُّهَا قريبًا مِنَ الحَالِ ، فَلَايَصِحُّ ''لَمَّا يجِئْ مُحَمَّدٌ في العَامِ المَاضِيْ''

ترجمہ: بہر حال نفی تو اس کے ذریعہ حکم کو مقید کرنا، مخصوص طریقے پر نسبت کو سلب کرنے کے لیے ہوتا ہے، جس کا فائدہ حروف نفی دیتے ہیں اور وہ چھ حروف ہیں، لا، ما، إن، لن، لم، لمّا، تو لا مطلقاً نفی کے لیے ہے اور ما اور اِن

حال کی نفی کے لیے ہیں اگر دونوں فعل مضارع پر داخل ہوں، لن استقبال کی نفی کے لیے ہے اور لم ولمّا نفی ماضی کے لیے ہیں مگر یہ کہ لمّا کے ذریعے ماضی کی نفی زمانہ تکلم تک ممتد رہتی ہے اور متوقع الحصول کے ساتھ مختص ہوتی ہے، اسی بنیاد پر نہیں کہا جاتا "لمّا يقم زيد ثم قام" اور نہ ہی "لمّا يجتمع النقيضان" کہا جائے گا جیسے کہ کہا جاتا ہے "لم يقم ثم قام" وہ نہیں کھڑا تھا پھر کھڑا ہوگیا، اور "لم يجتمعا" (أي النقيضان) دو نقیض جمع نہیں ہوئیں، تو لما نفی میں اس قد کے مقابل میں آتا ہے جو اثبات میں ہوتا ہے، اس وقت لما کے ذریعہ نفی کردہ خبر حال سے قریب ہوگی، پس نہیں صحیح ہوگا یہ کہنا "لما يجئ محمد في العام الماضي" اب تک محمد گذشتہ سال میں نہیں آیا۔

تشریح: یہاں سے حضرات مصنفینؒ نے حروف نفی کے ذریعہ حکم کو مقید کرنے کے فائدے کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ حروف نفی کے ذریعہ مخصوص طریقے پر نسبت کو سلب کیا جاتا ہے، جس کا فائدہ حروف نفی دیتے ہیں، حروف نفی کل چھ ہیں: لا، ما، إن، لن، لم، لما، اس کے بعد مصنفینؒ نے ہر ایک کی تفصیل بیان کی ہے، سب سے پہلے "لا" کے بارے میں فرمایا کہ لا مطلقا" نفی کے لیے آتا ہے اور مطلقا" کا مطلب یہ ہے کہ ماضی، حال، استقبال وغیرہ کسی زمانے کی کوئی قید اس میں نہیں ہے جیسا کہ دیگر حروف نفی میں زمانے کی قید بھی ملحوظ ہے، جیسے "لازيد في الحجرة" زید گھر میں نہیں ہے۔ اس مثال میں "لا" سے مطلقاً زید کے گھر میں ہونے کی نفی ہو رہی ہے، کسی زمانے کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔

"ما" اور "إن" یہ دونوں حال کی نفی کے لیے آتے ہیں اگر فعل مضارع پر داخل ہوں، جیسے "مايقرأ زيد" زید نہیں پڑھ رہا ہے۔ "إن يجلسُ الأمير" امیر نہیں بیٹھے ہیں، اور "لن"، فعل مضارع پر داخل ہو کر استقبال کی نفی کے لیے آتا ہے، جیسے "لن يلعب" وہ ہرگز نہیں کھیلے گا، اور لم ولما ماضی کی نفی کے لیے

آتے ہیں، مگر لم اور لما کے درمیان فرق یہ ہے کہ لما کی نفی استغراق کے ساتھ ہوتی ہے، یعنی نفی کا تعلق زمانہ ماضی سے حال تک رہتا ہے، اور لم میں یہ بات نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ لما جس فعل پر داخل ہوتا ہے اس کا وقوع ممکن ہونے کے ساتھ متوقع ہوتا ہے، جیسے "وصل الأستاذ إلى الفصل ولما يدرّس" استاذ درس گاہ میں پہنچ گئے، اور اب تک سبق نہیں پڑھایا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تدریس کا آغاز اب تک تو نہیں ہوا مگر توقع ہے کہ آغاز ہو جائے، اسی وجہ سے "لمّا يقم زيدٌ ثم قام" اب تک زید کھڑا نہیں ہوا پھر کھڑا ہو گیا کہنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہاں نفی کا معنی زمانہ حال تک ممتد نہیں رہا ہے، بل کہ زمانہ حال میں قیام کا ثبوت ہو رہا ہے۔ اور نہ ہی "لمّا يجتمع النقيضان" کہنا صحیح ہے، اس لیے کہ لمّا کا استعمال اسی وقت صحیح ہے جب کہ لمّا کے بعد والے فعل کا ہونا متوقع ہو، اور نقیضین کا اجتماع متوقع ہی نہیں ہے، اس لیے "لمّا يجتمع النقيضان" کہنا بھی صحیح نہیں ہے، برخلاف لم کے، کہ لم چوں کہ متوقع کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بل کہ صرف نفی کا معنی دیتا ہے، اس لیے "لم يقم ثم قام" اور "لم يجتمعا (أي النقيضان)" کہنا صحیح ہے، گویا کہ "لمّا" نفی کا معنی دینے میں ایسے ہی ہے جیسے "قد" اثبات میں، اس لیے کہ "قد" جب فعل مضارع پر داخل ہوتا ہے تو اس سے استقبال کے معنی ختم کر دیتا اور حال کا معنی پیدا کر دیتا ہے، اور اسی طرح "لمّا" کے ذریعہ جو نفی ہوتی ہے وہ حال سے قریب ہوتی ہے، اسی وجہ سے "لمّا يجيءُ محمد في العام الماضي" کہنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس میں "العام الماضي" کی قید لگی ہے، جس کی وجہ سے حال کا ترجمہ نہیں ہو سکتا، اگر صرف "لما يجيءُ محمد" ہوتا تو صحیح تھا۔

وَأَمَّا التَّوابِعُ: فالتَّقييدُ بِهَا يكُونُ لِلأغراضِ الَّتي تُقصَدُ مِنهَا

فالنَّعتُ: يكُونُ للتَّمييزِ ، نحوُ "حضَرَ عليٌّ الكاتِبُ" والكَشفِ

نحوُ "الجسمُ الطَّويلُ العَرِيضُ العَمِيقُ يشْغَلُ حيِّزًا منَ الفَراغ" والتَّأكيدِ، نحوُ "تلكَ عشرَةٌ كامِلَةٌ" والمدحِ نحوُ "حضَرَ خَالِدُ نِالهُمامُ" والذَّمِّ نحوُ "وامْرأتُهُ حمَّالة الحَطَبِ" والتَّرحُّمِ نحو "أحسِنْ إلى خالِدِ نِالمِسكِينِ"

ترجمہ: بہرحال توابع تو ان کے ذریعہ مقید کرنا ان اغراض کے لیے ہوتا ہے جن کا ان کے ذریعے ارادہ کیا جائے، چناں چہ صفت (موصوف کو دوسروں سے) ممتاز کرنے کے لیے ہوتی ہے، جیسے "حضر علي نِالكاتب" کاتب علی حاضر ہوگیا۔اور موصوف کے معنی کی وضاحت کے لیے، جیسے "الجسم الطويل العريض العميق يشغل حيزاً من الفراغ" لمبا، چوڑا، گہرا جسم خالی جگہ کو گھیر لیتا ہے۔اور تاکید کے لیے جیسے "تلك عشرة كاملة" یہ پورے دس روزے ہوئے۔ اور مدح کے لیے جیسے "حضَرَ خالدُ نِالهُمَامُ" عالی ہمت بادشاہ خالد آ گئے۔اور مذمت کے لیے جیسے "وَامْرأتُهُ حمَّالَةُ الحَطَبِ" اس کی بیوی جو لکڑیاں لادکر لاتی ہے۔ اور ترحم کے لیے، جیسے "ارحم إلى خالد المسكين" بے چارے خالد کے ساتھ رحم کرو۔اس مثال میں المسكين کو ترحم کے لیے لایا گیا ہے، اس لیے کہ المسكين کا لفظ ہی یہ بتلا رہا ہے کہ موصوف بہت ہی لاچار اور مجبور ہے، اس کے ساتھ مہربانی کرنی چاہیے۔

وَالتَّوكيدُ: يكُونُ للتَّقْرِيرِ ودَفْعِ توهُّمِ التَّجوُّزِ أوِ السَّهْوِ أوْ عدَمِ الشُّمُولِ نحوُ "زَارَنِي الأمِيرُ نفسُهُ" و "سَلِمَ الجَيشُ عامَّتُهُ".

وعَطْفُ البَيَانِ: يكُونُ لِمُجرَّدِ التَّوضِيحِ نحوُ "اَقْسَمَ بِاللّٰهِ أبُوْ حفْصٍ عُمَرُ" أو للتَّوضِيحِ مَعَ المَدْحِ نحوُ "جَعَلَ اللّٰهُ الكَعْبَةَ البَيتَ الحَرَامَ قِيامًا للنَّاسِ" وَيَكْفِي فِي التَّوضِيحِ أن يُوضِحَ الثَّاني الأوَّلَ عِندَ الاجْتِماعِ وإن لَمْ يَكُنْ أوضَحَ مِنْهُ عِندَ الانْفِرادِ كـ"عَلِيٌّ زَيْنُ العَابِدِينَ" و"العَسْجَدُ، الذَّهَبُ".

وَعطْفُ النَّسقِ: يكُونُ لِلأغراضِ الَّتِيْ تُؤدِّيْها أحرُفُ العَطْفِ كَالتَّرْتِيبِ معَ التَّعقِيبِ فِيْ الفاءِ ومَعَ التَّراخِيِ في ثُمَّ.

والبَدَلُ: يكُونُ لِزيادَةِ التَّقرِيرِ والإيضَاحِ نحوُ "قَدِمَ ابْنِي عليٌّ" في بَدَلِ الكُلِّ و"سَافَرَ الجُندُ أغْلَبُهُ" في بدَلِ البَعضِ و"نَفَعَنِي الأستاذُ عِلْمُهُ" في بَدَلِ الاشْتِمالِ.

ترجمہ: تاکید متبوع کی پختگی اور (متبوع سے) معنیٰ مجازی کے وہم کو دور کرنے یا سہو کے وہم کو دور کرنے یا حکم کے عام نہ ہونے کے وہم کو دور کرنے کے لیے آتی ہے، جیسے "زَارَني الأمِيرُ نفسُهُ" امیر نے خود مجھ سے ملاقات کی، اور "سلم الجيش عامته" مکمل لشکر محفوظ رہا، اور عطف بیان محض وضاحت کے لیے ہوتا ہے جیسے "أقسم باللهِ أبو حفص عمر" اللہ کی قسم کھائی ابوحفص یعنی عمر نے۔ یا مدح کے ساتھ وضاحت کے لیے ہوتا ہے، جیسے "جَعَلَ الله الكعبة البيت الحرام قياماً للنَّاسِ" خداتعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا۔ توضیح میں یہ کافی ہے کہ ثانی اول کو واضح کرے (تابع ومتبوع کے) اجتماع کے وقت، اگرچہ اس سے زیادہ واضح نہ ہو انفراد کے وقت، جیسے "عليٌّ زَينُ العَابِدِينَ" اور "العَسْجَدُ، الذَّهَبُ" علی زین العابدین ہیں اور عسجد سونے کو کہتے ہیں۔

عطف نسق (عطف بہ حرف) ان مقاصد کے لیے ہوتا ہے جنہیں حروف عطف ادا کرتے ہیں، جیسے کہ ترتیب تعقیب کے ساتھ فا میں اور ترتیب تراخی کے ساتھ "ثم" میں۔

بدل زیادتی بیان اور وضاحت کے لیے ہوتا ہے، جیسے "قَدِمَ اِبنِيْ عليٌّ" میرا بیٹا علی آیا۔ بدل الکل میں اور "سافرَ الجند أغلبه" لشکر سفر پر گیا یعنی اکثر حصہ۔ بدل البعض میں "ونفعني الأستاذ علمه" استاذ سے مجھے نفع پہنچا یعنی

ان کے علم سے، بدل الاشتمال میں۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفینؒ نے توابع کی دیگر چار اقسام کی وضاحت کی ہے، سب سے پہلے تاکید کے متعلق فرمایا کہ تاکید مختلف مقاصد کے لیے لائی جاتی ہے، کبھی تو تاکید لانے کا مقصد متبوع کے حکم کو بحیثیت نسبت پختہ کرنا، معنی مجازی کے وہم کو دور کرنا اور متبوع کے لفظ میں سہو واقع ہوجانے کے وہم کو دور کرنا ہوتا ہے، جب کہ کبھی تاکید متبوع کے حکم کو بحیثیت شمول پختہ کرنے اور حکم کے عام نہ ہونے کے وہم کو دور کرنے کے لیے لائی جاتی ہے، جیسے ''زارني الأمير نفسه'' امیر نے خود مجھ سے ملاقات کی۔

مثال مذکور میں محل استشہاد لفظ ''نفسه'' جو ایک طرف اگر نسبت کی پختگی پر دلالت کررہا ہے کہ امیر ہی نے مجھ سے ملاقات کی تو دوسری طرف معنیٰ مجازی کے وہم کو بھی دور کررہا ہے کہ امیر کا کوئی قاصد اور ایلچی نہیں ملا ہے کہ مجازاً اس کو امیر کہہ دیا گیا ہو بل کہ امیر نے بذات خود ملاقات کی ہے، نیز اسی سے احتمال سہو بھی دور ہورہا ہے کہ مجھے ''الأمير'' کہنے میں کوئی شک نہیں ہوا ہے، بل کہ یقین سے کہہ رہا ہوں کہ امیر ہی سے میری ملاقات ہوئی ہے، اور جیسے ''سلم الجيش عامته'' پورا لشکر محفوظ رہا، اس کی مثال بھی مخبر لشکر کے محفوظ رہنے کی خبر کو بطور یقین پیش کررہا ہے کہ اس خبر میں کوئی شک نہیں ہے، ساتھ ساتھ بعض مجاہدین کے حکم حفاظت میں شامل نہ ہونے کے وہم کو بھی دور کررہا ہے کہ محفوظ رہنے کا یہ حکم ہر فرد کے لیے عام ہے۔

وعطف البيان: یہاں سے حضرات مصنفینؒ عطف بیان کو لانے کا مقصد بیان فرما رہے ہیں کہ عطف بیان لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مبیَّن (متبوع) کی وضاحت ہوجاتی ہے، جیسے ''أقسم بالله أبو حفص عمر'' اللہ کی قسم کھائی ابوحفص یعنی عمر نے۔ اس مثال میں ''عمر'' عطف بیان ہے اور اس کے

ذریعہ ''ابوحفص'' کی وضاحت ہورہی ہے کہ ابوحفص اور عمر دونوں ایک ہی ہیں، اور کبھی کبھی عطف بیان کولانے کا مقصد وضاحت اور مدح ہوتا ہے، جیسے، جعل اللّٰه الكعبة البيت الحرام قياماً للنّاسِ'' آیت کریمہ میں ''البیت الحرام'' کعبہ کا عطف بیان ہے، جس سے کعبہ کی وضاحت بھی ہورہی ہے اور مدح بھی، وضاحت تو ظاہر ہے کہ کعبہ سے مراد بیت حرام ہے اور مدح اس طور پر کہ کعبہ ایسا گھر ہے جس میں لڑائی، جھگڑا، فسق وفجور سب حرام ہیں اور اس میں داخل ہونے والا شخص مامون رہتا ہے۔

ويكفي في التوضيح: فرماتے ہیں کہ وضاحت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اگر عطف بیان اور اس کے مبین (جس کا وہ عطف بیان ہے) کا اجتماع ہوجائے تو دوسرا اول کی وضاحت کردے، خواہ انفرادی حالت میں بیان اس سے زیادہ واضح نہ ہو، جیسے ''عليّ زين العابدين'' اور ''العسجد ، الذهب'' یعنی کوئی شخص علی کونہیں جانتا تھا اس کی وضاحت زین العابدین سے کردی یا ''عسجد'' کونہیں جانتا تھا تو اس کی وضاحت ''الذهب'' سے کردی (علی سے مراد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نبیرے علی بن حسین مراد ہیں) مذکورہ دونوں مثالوں میں سے پہلی مثال میں ثانی (زین العابدین) اول (علی) کے مقابلے میں زیادہ واضح نہیں ہے، اور دوسری مثال میں ثانی، اول کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے، مگر اجتماع کے وقت میں ایک دوسرے کی وضاحت کردیتا ہے اور عطف بیان میں اتنا ہی کافی ہے۔

عطف النسق يكون: یہاں سے حضرات مصنفینؒ عطف بہ حرف کے ذریعہ کلام کو مقید کیے جانے کی وجہ بیان فرمارہے ہیں کہ عطف نسق کے ذریعہ کلام کو مقید کرنا ان اغراض کے لیے ہوتا ہے جو حروف عاطفہ سے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً حروف عاطفہ میں سے ایک حرف ''ف'' ہے، جو ترتیب اور تعقیب دونوں کا

فائدہ دیتا ہے تو گویا فا کے ذریعے عطف کرنا ترتیب وتعقیب کے مقصد کے لیے ہوگا، جیسے "جاء زیدٌ فخالدٌ" زید آیا فوراً اس کے بعد خالد آیا۔ مثال مذکور سے ایک تو دونوں کے آنے کی ترتیب معلوم ہوئی کہ آنے میں "زید" مقدم ہے اور "خالد" موخر ہے، اور تعقیب پر بھی دلالت ہوئی بایں طور کہ زید کے آنے کے فوراً بعد خالد آ گیا تاخیر کے ساتھ نہیں آیا، اور "ثم" تراخی کے ساتھ ترتیب کے لیے بھی آتا ہے، تو گویا "ثم" کے ذریعہ عطف کرنا ترتیب وتراخی دونوں کے لیے ہوگا، جیسے "جاء زیدٌ ثم خالدٌ" زید آیا پھر خالد اس مثال سے ترتیب اور تراخی دونوں چیزیں سمجھ میں آ رہی ہیں، بایں طور کہ آنے کی ترتیب میں زید مقدم اور خالد موخر ہے اور تراخی اس طریقے پر کہ زید کے آنے کے کافی دیر بعد خالد آیا ہے یعنی دونوں کی آمد کے درمیان فصل ہے۔

والبدل یکون: فرماتے ہیں کہ بدل کے ذریعہ کلام کو مقید کرنے کا مقصد محکوم علیہ (مبدل منہ) کی وضاحت کرنا ہوتی ہے، خواہ بدل الکل ہو یا بدل البعض یا بدل الاشتمال، بدل الکل کی مثال "قدم ابني عليٌّ" ہے، یہاں "عليٌّ" ابني کی وضاحت کر رہا ہے، بدل البعض کی مثال "سافر الجند أغلبه" ہے یہاں "أغلبه" الجند کی وضاحت کر رہا ہے کہ سفر کے لیے لشکر کا اکثر حصہ روانہ ہوا ہے نہ کہ پورا لشکر، اور بدل الاشتمال کی مثال "نفعني الأستاذ علمه" ہے، یہاں "علمه" استاذ کی وضاحت کر رہا ہے، کہ استاذ کی جس چیز سے فائدہ حاصل کیا ہے استاذ اس پر مشتمل ہے یعنی وہ چیز استاذ کے اندر موجود ہے اور وہ علم ہے، کیوں کہ بغیر علم کے کسی کو استاذ نہیں بنایا جاتا۔

البابُ السّادِسُ في القصرِ

القَصرُ تخْصِيصُ شَيْءٍ بطَرِيقٍ مَخْصُوصٍ ويَنْقسِمُ إلى حقِيقيٍّ وإضَافِيٍّ،

فالحقِيقِيُّ مَاكَانَ الاخْتِصاصُ فِيهِ بِحَسبِ الوَاقِعِ والحقِيقَةِ لا بِحسبِ الإضافَةِ إلٰى شَيْ آخر نحوُ "لَا كَاتِبَ في المَدِينةِ إلَّا عَلِيٌّ" إذا لَمْ يَكُنْ فِيهَا غيرُهُ مِنَ الكُتَّابِ، والإضَافِيُّ مَا كَانَ الاخْتِصَاصُ فِيهِ بِحسبِ الإضَافَةِ إلٰى شَيْ مُعَيَّنٍ نحوُ "مَا عَلِيٌّ إلَّا قَائِمٌ" أَيْ إنَّ لهُ صِفَةَ القِيَامِ لاصِفَةَ القُعُودِ وليسَ الغَرْضُ نفْيَ جمِيعِ الصِّفاتِ عنهُ مَاعدَا صِفَةِ القِيامِ.

چھٹا باب قصر کے بیان میں

قصر ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ خاص کر دینا ہے مخصوص طریقے سے، قصر منقسم ہوتا ہے حقیقی اور اضافی کی طرف، قصر حقیقی وہ قصر ہے جس میں اختصاص واقع اور حقیقت کے اعتبار سے ہو، نہ کہ دوسری چیز کی طرف نسبت کرتے ہوئے، جیسے "لا كاتب في المدينة إلَّا عليٌّ" شہر میں علی کے علاوہ کوئی کاتب نہیں ہے، اس وقت کہیں گے جب کہ شہر میں اس کے علاوہ کوئی کاتب نہ ہو۔

قصر اضافی وہ قصر ہے جس میں کسی شئ معین کی طرف نسبت کرتے ہوئے اختصاص پایا جائے، جیسے "ما عليّ إلا قائم" علی تو کھڑا ہی ہے، یعنی اس کے لیے صفت قیام ہے نہ کہ صفت قعود، اور مقصد صفت قیام کے علاوہ اس سے تمام صفات کی نفی کرنا نہیں ہے۔

تشریح: اس چھٹے باب حضرات مصنفینؒ نے قصر اور اس کے اقسام کو بیان فرمایا ہے، سب سے پہلے قصر کی تعریف کی ہے اور قصر کی قسموں کی طرف اشارہ کیا ہے، قصر کے لغوی معنی ہیں "الحبس" روکنا، اور قصر کی اصطلاحی تعریف مصنفینؒ نے یہ کی ہے کہ قصر ایک شئ کو دوسری شئ کے ساتھ ایک خاص طریقے پر مختص کرنے کو کہتے ہیں، پھر فرمایا کہ قصر کی دو قسمیں ہیں (١) قصر حقیقی (٢) قصر اضافی

قصر حقیقی ایک شئ کا دوسری شئ کے ساتھ باعتبار حقیقت خاص کرنے کا نام

ہے اس طریقے پر کہ پہلی شئ دوسری شئ کے علاوہ کسی شئ میں بھی نہ پائی جائے اور اسی کی وضاحت مصنّفینؒ نے "لابحسب الإضافة إلی شيئ آخر" سے کی ہے، یعنی یہ اختصاص حقیقت کے اعتبار سے نہ ہو، نہ کہ کسی دوسری شئ کی طرف نسبت کرتے ہوئے، جیسے "لا کاتب في المدینة إلا عليٌّ" شہر میں علی کے علاوہ کوئی کاتب نہیں ہے، اس مثال میں "صفت کتابت" علی کی ذات پر منحصر ہے، کہ اس کے علاوہ شہر میں کوئی اور کاتب ہے ہی نہیں، یہ کہنا اس وقت صحیح ہوگا جب کہ حقیقت میں اس کے علاوہ شہر میں کوئی کاتب نہ ہو۔

قصر اضافی کی وضاحت یوں کی ہے کہ قصر اضافی اس اختصاص کو کہتے ہیں جس میں حصر بعض کے اعتبار سے ہو، یعنی ایک شئ کا دوسری شئ کے ساتھ بہ نسبت کسی معین شئ کے خاص کرنا، نہ کہ حقیقت کے اعتبار سے، جیسے "ما عليٌّ إلّا قائمٌ" علی کھڑا ہی ہے۔ مثال مذکور میں علی کے لیے صفت قعود کے مقابلے میں صفت قیام کا قصر کیا گیا ہے، نہ یہ کہ علی سے قیام کے علاوہ بقیہ دیگر اوصاف ہی کی نفی کی گئی ہے۔

وَكُلٌّ مِنْهُمَا يَنْقَسِمُ إلٰى قَصْرِ صِفَةٍ علٰى مَوصُوفٍ نحوُ "لا فَارِسَ إلَّا عليٌّ" وقَصْرِ مَوصُوفٍ علٰى صِفَةٍ نحوُ "وَمَا مُحَمَّدٌ إلَّا رسُولٌ" فيَجُوزُ علَيهِ المَوتُ.

والقَصْرُ الإضَافِي ينْقَسِمُ بِاعْتِبارِ حَالِ المُخاطَبِ إلٰى ثَلاثَةِ أقسَامٍ.

١۔ قصْرُ إفْرادٍ إذَا اعتَقَدَ المُخاطَبُ الشَّرْكَةَ.

٢۔ قصرُ قلبٍ إذَا اعتَقَدَ العَكْسَ.

٣۔ قصرُ تعيِينٍ إذَا اعتقَدَ واحِدًا غيرَ مُعَيَّنٍ.

ولِلْقَصْرِ طُرُقٌ، مِنْهَا النَّفيُ والاستِثْناءُ، نحوُ "إنْ هٰذَا إلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ" ومِنْهَا إنَّمَا، نحوُ "إنَّمَا الفاهِمُ عَلِيٌّ" ومِنْهَا العَطْفُ بِـ"لا أوْ بَلْ أو لكِنْ" نَحوُ "أنَا نَاثِرٌ لا نَاظِمٌ" و "مَا أنَا حَاسِبٌ بَلْ كَاتِبٌ" ومِنْهَا تقْدِيمُ مَا

حقُّهُ التَّأخِيرُ ، نحوُ "إيَّاكَ نَعبُدُ"

ترجمہ: اوران میں سے ہرایک منقسم ہوتا ہے قصر صفت علی موصوف کی طرف، جیسے "لا فارس إلاَّ عليٌّ" شہ سوار صرف علی ہی ہے، اور قصر موصوف علی صفت کی طرف، جیسے "وما محمدٌ إلاَّ رسولٌ" محمد ایک رسول ہی تو ہیں۔ لہٰذا آپ پر موت طاری ہونا ممکن ہے۔

اور قصر اضافی مخاطب کی حالت کے اعتبار سے منقسم ہوتا ہے تین قسم کی طرف: قصر افراد، جب کہ مخاطب شرکت کا اعتقاد رکھے اور قصر قلب، جب کہ عکس حکم کا اعتقاد رکھے اور قصر تعیین، جب کہ کسی ایک غیر معین کا اعتقاد رکھے، اور قصر کے مختلف طریقے ہیں، انہیں میں سے نفی اور استثناء ہے، جیسے "إن هذا إلا ملكٌ كريمٌ" یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ اوران ہی میں سے "إنّما" ہے جیسے "إنّما الفاهم عليٌّ" سمجھنے والا علی ہی ہے۔ اوران ہی میں سے "لا" کے ساتھ عطف کرنا ہے یا "بل" اور "لکن" کے ساتھ، جیسے "أنا ناثرٌ لا ناظمٌ" میں نثر نگار ہوں شاعر نہیں ہوں "وما أنا حاسب بل كاتبٌ" میں حساب کرنے والا نہیں ہوں بلکہ لکھنے والا ہوں۔ اور انہیں میں تقدیم ما حقہ التاخیر (اس چیز کو مقدم کردینا جس کا حق مؤخر کرنا تھا) ہے، جیسے "إيّاكَ نعبد" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

تشریح: وكلّ منهما: حضرات مصنفینؒ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ قصر حقیقی اور قصر اضافی ان دونوں میں سے ہرایک کی دو دو قسمیں ہیں اور یہ تقسیم قصر کے دونوں طرف (مقصور اور مقصور علیہ) کے اعتبار سے ہے۔

(۱) قصر الصفة على الموصوف صفت کا موصوف پر قصر کرنا۔

(۲) قصر الموصوف على الصفة موصوف کا صفت پر قصر کرنا۔

گویا کل چار قسمیں ہوگئیں، اب ہرایک کی تفصیل مع مثال درج ذیل ہے:

۱۔ موصوف کا صفت پر قصر حقیقی، اس کا مطلب یہ ہے کہ موصوف میں اس صفت کے علاوہ کوئی اور صفت حقیقت کے اعتبار سے نہ پائی جائے، جیسے "ما زیدٌ إلاَّ کاتبٌ" زید کاتب ہی ہے، یعنی اس میں کتابت کے علاوہ کوئی اور صفت حقیقت کے اعتبار سے پائی ہی نہیں جاتی، مثال مذکور میں زیدٌ موصوف کا قصر کیا گیا ہے صفت کتابت پر۔

واضح رہے کہ یہ مثال فرضی برائے تفہیم ہے، اس لیے کہ ایسا محال ہے کہ کسی کے اندر صرف ایک ہی صفت ہو اور کوئی دوسری صفت ہو ہی نہ۔

۲۔ صفت کا موصوف پر قصر حقیقی یعنی وہ صفت اس موصوف کے علاوہ کسی اور موصوف میں باعتبار حقیقت نہ پائی جائے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس موصوف میں اس صفت کے علاوہ اور صفات بھی ہوں، جیسے "لا یعلم الغیبَ إلاَّ اللّٰہ" اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی اس صفت کے ساتھ متصف ہے ہی نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ اس صفت کے علاوہ اور بھی بہت سارے اوصاف سے متصف ہے، مثلاً سمیع ہونا، بصیر ہونا، خالق و مالک ہونا وغیرہ۔

۳۔ موصوف کا صفت پر قصر اضافی یعنی موصوف کو ایک صفت کے ساتھ کسی دوسری صفت کے اعتبار سے خاص کرنا، خواہ اس دوسری صفت کے علاوہ اور صفات بھی اس میں پائی جائیں، یا نہ پائی جائیں، مثلاً ایک شخص زید کو کاتب اور شاعر دو صفتوں سے متصف سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ کاتب تو ہو اور شاعر نہ ہو تو اس وقت کہیں گے "ما زیدٌ إلا کاتبٌ" زید کاتب ہی ہے، اس مثال میں زید موصوف کا صفت کتابت پر قصر کیا گیا ہے، مگر صفت شاعری کے اعتبار سے، یعنی زید شاعر نہیں، خواہ شاعری کے علاوہ اور بہت سی صفتیں اس کے اندر پائی جاتی ہوں۔

"وما محمدٌ إلاَّ رسول" میں بھی یہی قصر موصوف علی صفت ہے، اس طریقے سے کہ آیت کریمہ کے مخاطب صحابۂ کرام ہیں، جنہیں حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے وصال پر حیرانی ہوئی تو گویا انہوں نے آپ کے لیے دو صفتیں ثابت کیں (۱) رسالت (۲) تبرّی عن الموت اور "وما محمدٌ إلاّ رسولٌ" فرما کر حضور کو صفت رسالت پر قصر کر دیا گیا، کہ آپ کے لیے صرف صفت رسالت ہے، صفت تبرّی عن الموت نہیں، لہٰذا آپ کے وصال سے حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ صفت کا موصوف پر قصر اضافی یعنی صفت کو ایک موصوف کیساتھ کسی دوسرے موصوف کے اعتبار سے خاص کرنا، خواہ اس دوسرے موصوف کے علاوہ دیگر موصوفوں میں وہ صفت پائی جائے، یا نہ پائی جائے، جیسے "لافارس إلا عليٌّ" علی ہی شہ سوار ہے، اس شخص سے کہنا جس کا خیال یہ ہو کہ علی کے علاوہ راشد بھی شہ سوار ہے، تو اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ راشد اور علی دونوں میں صرف علی ہی شہ سوار ہے، راشد نہیں، خواہ علی کے علاوہ اور دوسرے بھی شہ سوار ہوں، ان کی نفی مقصود نہیں ہے۔

والقصر الإضافي ينقسم: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ مخاطب کے حال کے اعتبار سے قصر اضافی کی تین قسمیں ہیں، قصر افراد، قصر قلب اور قصر تعیین۔

قصر افراد: یہ ہے کہ مخاطب شرکت کا گمان رکھتا ہو اور متکلم ایک پر منحصر کر دے، جیسے "ما قائمٌ إلاّ زيدٌ" صرف زید ہی کھڑا ہے، اس شخص سے کہنا جو یہ گمان رکھتا ہو کہ زید اور عمرو دونوں کھڑے ہیں، گویا متکلم نے زید پر کھڑے ہونے کا قصر کر کے شرکت کا گمان ختم کر دیا۔

قصر قلب: یہ ہے کہ مخاطب متکلم کے خلاف خیال رکھتا ہو، مثلاً مخاطب یہ خیال رکھتا ہو کہ صرف عمر ہی کھڑا ہے تو اس وقت "ماقائمٌ إلا زيدٌ" قصر قلب کی مثال ہوگی، اس لیے کہ یہ مخاطب کے خیال کے بالکل برعکس ہے۔

قصر تعیین: یہ ہے کہ مخاطب متردد ہو، وہ نہیں جانتا کہ زید کھڑا ہے یا عمر اس وقت "ما قائم إلاّ زيدٌ" کہہ کر گویا کہ متکلم نے زید کے کھڑے ہونے کو متعین

کر دیا ہے، یہی قصر تعیین ہے۔

وللقصر طرق: یہاں سے مصنفینؒ قصر کے طریقوں کو بیان فرمار ہے ہیں کہ قصر کے چار طریقے ہیں:

۱۔ نفی واستثناء کا طریقہ، جیسے "إن هذا إلا ملكٌ كريم" نہیں ہے یہ مگر کوئی بزرگ فرشتہ، مثال مذکور میں "إن" نافیہ ہے، اس کے بعد إلّا سے استثناء کیا گیا ہے، اس صورت میں مقصور علیہ حرف استثناء کے بعد ہوگا۔

۲۔ إنّما کا طریقہ جیسے "إنّما الفاهم عليّ" سمجھنے والا تو علی ہی ہے، اس طریقے میں مقصور علیہ وجوباً مؤخر ہوگا۔

۳۔ لا یا بل یا لکن کے ذریعے عطف کرنے کا طریقہ، جیسے "أنا ناثرٌ لا ناظم" میں نثر نگار ہوں شاعر نہیں ہوں، یہ عطف بہ لا کی مثال ہے اور جیسے "ما أنا حاسبٌ بل كاتبٌ" میں حساب داں نہیں ہوں، بل کہ کاتب ہوں، یہ بل کے ذریعہ عطف کی مثال ہے اور لکن کے ذریعے عطف کی مثال جیسے "ما أنا طامعٌ لكن قانعٌ" میں حریص نہیں ہوں، لیکن قناعت کرنے والا ہوں۔

عطف بہ "لا" میں مقصور علیہ لا سے پہلے ہوگا اور عطف بہ بل اور عطف بہ لکن میں "بل" اور "لکن" کے بعد ہوگا۔

۴۔ تقدیم ماحقہ التاخیر کا طریقہ، یعنی جس چیز کو مؤخر ہونا چاہئے اس کو مقدم کرنا، جیسے "إيّاكَ نعبُدُ" ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یہاں "إيّاك" کو جو کہ "نعبد" کا مفعول بہ ہے، اس سے پہلے لے آیا گیا ہے، حالاں کہ مفعول بہ کو فعل کے بعد آنا چاہیے، اس صورت میں مقصور علیہ مقدم ہوتا ہے۔

البَابُ السّابعُ في الوَصلِ والفَصلِ

الوَصلُ عطفُ جُملَةٍ علىٰ أُخرىٰ ، والفَصلُ تركُهُ ، والكَلامُ هٰهُنا

قَاصِرٌ علَى العطفِ بِالوَاوِ، لِأنَّ العطفَ بغيرِهَا لايقَعُ فيهِ اشْتِراكٌ ، وَلِكُلٍّ مَنَ الوَصلِ بِهَا والفَصلِ مواضِعُ .

مَواضِعُ الوَصلِ بِالوَاوِ : يجِبُ الوَصلُ في مَوضَعَينِ .

الأوَّلُ إذَا اتَّفقَتِ الجُملَتَانِ خبرًا أو إنْشاءً وكَانَ بينَهُمَا جِهَةٌ جَامِعةٌ ، أيْ مناسَبَةٌ تَامَّةٌ وَلَمْ يكُنْ مَانِعٌ مِنَ العَطْفِ نحوُ "إنَّ الأبْرارَ لَفِي نَعِيمٍ" وإنَّ الفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيمٍ" ونَحوُ "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلاً ولْيَبْكُوا كَثِيرًا"

الثَّاني إذَا أوهَمَ تَرْكُ العَطْفِ خِلافَ المَقْصُودِ كَمَا إذَا قُلتَ: "لَا، وَشَفَاهُ اللّٰهُ" جَوابًا لِمَنْ يَسْألُكَ هَلْ بَرِئَ عَلِيٌّ مِنَ المَرَضِ فَتَرْكُ الَواوِ يُوهِمُ الدُّعَاءَ علَيهِ وَغَرَضُكَ الدُّعَاءُ لَهُ .

ساتواں باب وصل اور فصل کے بیان میں

وصل ایک جملے کا دوسرے جملے پر عطف کرنا ہے اور فصل عطف کا چھوڑ دینا ہے اور بحث یہاں صرف عطف بالواو کے متعلق ہے، اس لیے کہ اگر عطف بغیر واؤ کے ہو تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا، اور واؤ کے ذریعہ ہر وصل وفصل کے کچھ مواقع ہیں

(واؤ کے ذریعہ وصل کے مواقع) دو جگہوں میں وصل ضروری ہے۔

اول جب کہ دو جملے خبر یا انشا ہونے کے اعتبار سے یکساں ہوں اور ان دونوں کے درمیان کوئی جہت جامعہ یعنی مناسبت تامہ ہو اور عطف سے کوئی مانع بھی نہ ہو، جیسے "إنّ الأبرارَ لفي نعيمٍ وإنّ الفجّارَ لفي جحيمٍ" نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ اور جیسے "فليضحكوا قليلاً وليبكوا كثيرًا" سو تھوڑے دنوں ہنس لیں اور بہت دنوں روتے رہیں۔

دوم جب کہ عطف کا ترک کر دینا خلاف مقصود کا وہم پیدا کرے، جیسے جب

تم نے کہا "لا ، وشفاه الله" نہیں اور خدا اس کو شفا دے۔ اس شخص کے جواب میں جو تم سے سوال کرے "هل برئ عليٌ من المرض" کیا علی بیماری سے شفا پا گیا؟ تو واو کا چھوڑ دینا بددعا کا وہم پیدا کرتا ہے، جب کہ تمہارا مقصد اس کو دعا دینا ہے۔

تشریح: اس ساتویں باب میں حضرات مصنفینؒ وصل اور فصل کے متعلق تفصیل بیان فرما رہے ہیں کہ کس جگہ دو جملوں کے درمیان وصل رہے گا اور کس جگہ فصل کیا جائے گا؟ سب سے پہلے مصنفینؒ نے وصل اور فصل کی تعریف کی ہے، چناں چہ فرمایا کہ وصل نام ہے ایک جملے کا دوسرے جملے پر عطف کرنا اور فصل عطف نہ کرنے کو کہتے ہیں، اس کے بعد "والكلام هنا" سے فرماتے ہیں کہ حروف عطف تو دس ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے ذریعے ایک جملے کا دوسرے جملے پر عطف کیا جاتا ہے، مگر یہاں پر بحث صرف عطف بالواو کے متعلق ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ واو کے علاوہ دیگر حروف عاطفہ سے عطف میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا ہے، صرف واؤ ہی ایک ایسا حرف ہے جس کے ذریعہ اشتباہ ہوتا ہے، اس لیے بحث کو اسی پر منحصر رکھا۔

ولكلٍّ من الوصل بها الخ: واؤ کے ذریعہ عطف کرنے اور نہ کرنے یعنی وصل اور فصل دونوں کے کچھ مواقع ہوتے ہیں، جن کی تفصیل آرہی ہے، سب سے پہلے وصل کو بیان فرما رہے ہیں کہ وصل دو جگہوں میں واجب ہے۔

۱ جب دونوں جملے خبریہ یا دونوں انشائیہ ہوں اور دونوں کے درمیان کوئی وجہ جامع یعنی مناسبت تامہ ہو مناسبت تامہ کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جملوں میں کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہو جو ان دونوں جملوں کے اجتماع کا تقاضہ کرے، اور عطف سے کوئی چیز مانع بھی نہ ہو یعنی کوئی ایسی چیز نہ ہو جو فصل کو چاہتی ہو، جیسے "إنَّ الأبرارَ لفي نعيمٍ وإنَّ الفجّارَ لفي جحيمٍ" آیت کریمہ میں دونوں

جملوں میں وصل کیا گیا ہے، کیوں کہ دونوں جملے خبری ہیں اور دونوں کے مسند الیہ یعنی "أبرار" اور "فجّار" کے درمیان وجہ جامع تضاد کی نسبت ہے (تضاد بھی ایک قسم کی مناسبت ہے اس لیے کہ احد الضدین کے تصور سے ضد آخر خود بہ خود ذہن میں آجاتی ہے) اور اس کے علاوہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو فصل کو چاہتی ہو، دوسری مثال، جیسے "فليضحكوا قليلاً وليبكوا كثيرًا" اس آیت میں بھی دونوں جملوں میں وصل ہے اور وجہ جامع ضحک اور بکاء کے درمیان نسبت تضاد ہے اور وصل سے مانع بھی کوئی چیز نہیں ہے۔

۲ دو جملوں میں سے ایک خبریہ اور ایک انشائیہ ہو یا دونوں خبر و انشاء کے اعتبار سے تو متفق ہوں مگر ان دونوں میں کوئی مناسبت معنوی نہ ہو اور دونوں جملوں کے درمیان وصل نہ کرنے سے خلاف مقصود کا وہم ہو، جیسے تم سے کوئی پوچھے "هل برئ عليٌ من المرض" کیا علی ٹھیک ہوگیا؟ اور تم اس کا جواب نفی میں دینا چاہو اور اس کے ساتھ شفایابی کی دعا بھی دینا چاہو تو یوں کہو گے "لا ، وشفاه الله" نہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو شفا دے۔ مثال مذکور میں "لا" ایک جملہ ہے اور "شفا الله" دوسرا جملہ ہے، دونوں میں وصل کیا گیا ہے، کیوں کہ ایک جملہ "لا" خبریہ ہے اس لیے کہ یہ "لم يبرأ" کے معنی میں ہے، اور یہی "وشفاه الله" کا معطوف علیہ ہے اور دوسرا جملہ "شفاه الله" انشائیہ ہے، اب اگر واؤ لاکر وصل نہ کیا جاتا اور یوں کہا جاتا "لاشفاه الله" تو متکلم کے مقصود کے خلاف کا وہم ہوتا، اس لیے کہ "لاشفاه الله" کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ اسے شفا نہ دے اور یہ بددعا ہے، حالاں کہ مقصد دعا دینا ہے، نہ کہ بددعا دینا۔

حضرات مصنفین کے قول "وغرضك الدعاء له" سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ "دعا لأحد يدعو دعاءً" کے معنی آتے ہیں، کسی کے حق میں دعا کرنا، اور "دَعَا عَلَيه" کے معنی کسی کے لیے بددعا کرنے کے ہیں، یعنی صلے کی تبدیلی سے

معنی میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔

ہاں اگر دو جملے ایسے ہوں جن میں عطف نہ کرنے کی وجہ سے مقصود متکلم کے خلاف کا وہم نہ ہو تو پھر عطف نہیں کریں گے بل کہ فصل کرنا ضروری ہو جائے گا، جیسے "سافر الأستاذ حفظه الله" استاذ سفر پر گئے اللہ ان کی حفاظت فرمائے۔ اس مثال میں بھی پہلا جملہ خبریہ اور دوسرا انشائیہ ہے مگر ان دونوں کے درمیان ایسا تعلق نہیں ہے کہ مقصودِ متکلم کے خلاف کا وہم ہو اس لیے عطف کو ترک کر دیا۔

مَوَاضِعُ الفَصْلِ: يَجِبُ الفَصْلُ في خَمسَةِ مَوَاضِعَ .

الأول أنْ يكونَ بينَ الجُمْلَتَينِ اتِّحادٌ تَامٌّ بِأنْ تَكُونَ الثَّانِيةُ بَدَلاً مِنَ الأُولٰى نحو "أمَدَّكُم بِمَا تعلَمُونَ امَدَّكُمْ بِأنْعَامٍ وبَنِينَ" أو بِأنْ تكُونَ بَيانًا لها نحوُ "فوَسْوَسَ إِلَيهِ الشَّيطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الخُلدِ" أوْ بِأنْ تكُونَ مُؤكِّدَةً لَهَا نحوُ "فَمَهِّلِ الكَافِرِينَ امْهِلْهُمْ رُوَيدًا" ويُقَالُ في هٰذَا المَوضِعِ: إنَّ بينَ الجُملَتَينِ كَمَالَ الاتِّصَالِ .

الثَّاني أن يكُونَ بينَ الجُمْلَتَينِ تبايُنٌ تامٌّ بِأنْ يختَلِفَا خبَرًا أو إنْشاءً كَقَولِهِ

وَقَالَ رَائِدُهُمْ أرْسُوْا نُزَاوِلُهَا
فَحَتْفُ كُلِّ امْرِئٍ يَجْرِي بِمِقْدَارِ

أوْ بِأنْ لايكُونَ بَينَهُمَا مُنَاسَبَةٌ في المَعْنٰى كَقَوْلِكَ "عليٌّ كاتبٌ" "الحمَامُ طائرٌ" فإنَّهُ لامناسبَةَ في المَعنٰى بَينَ كِتَابَةِ عَلِيٍّ وَطَيَرانِ الحَمَامِ، ويُقَالُ في هٰذا المَوضِعِ : إنَّ بَينَ الجُملَتَينِ كَمَالَ الانْقِطَاعِ .

(مواقع فصل) پانچ جگہوں میں فصل واجب ہے

اول یہ کہ وہ دو جملوں کے درمیان اتحاد تام ہو، اس طریقے سے کہ دوسرا

جملہ پہلے جملے کا بدل واقع ہو، جیسے "أَمَدَّكُم بِمَا تَعلَمُونَ أَمَدَّكُم بِأَنعَامٍ وَّ بَنِينَ" اس نے تمہاری ان چیزوں سے امداد کی جن کو تم جانتے ہو مواشی اور بیٹوں سے۔ اس طور پر کہ دوسرا جملہ پہلے کا بیان ہو، جیسے "فَوَسوَسَ إِلَيهِ الشَّيطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَل أَدُلُّكَ عَلىٰ شَجَرَةِ الخُلدِ" پھر ان کو شیطان نے بہکایا کہنے لگا کہ اے آدم میں تم کو ہمیشگی کا درخت بتلا دوں۔ یا بایں طور کہ دوسرا جملہ پہلے کے لیے تاکید ہو، جیسے "فَمَهِّلِ الكٰفِرِينَ أَمهِلهُم رُوَيدًا" کافروں کو یوں ہی رہنے دیجئے، ان کو تھوڑے سے دنوں رہنے دیجئے۔ اور اس جیسے مقام میں کہا جاتا ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان کمال اتصال ہے۔

دوسرے یہ کہ دونوں جملوں کے درمیان مکمل مباینت ہو بایں طور کہ دونوں مختلف ہوں خبر اور انشاء کے اعتبار سے، جیسے شاعر کا شعر وقال رائدهم ؎

ان کے (قوم کے) سردار نے کہا ٹھہر جاؤ ہم ان سے قتال کریں گے (اور دیکھو موت سے مت ڈرو) کیوں کہ ہر آدمی کی موت اپنے وقت پر آئے گی۔

یا بایں طور کہ دونوں جملوں کے درمیان معنی میں کوئی مناسبت نہ ہو، جیسے تمہارا قول "عليٌّ كاتب، الحمام طائرٌ" علی کاتب ہے، کبوتر پرندہ ہے۔ کیوں کہ علی کی کتابت اور پرندے کے اڑان کے درمیان معنیً کوئی مناسبت نہیں ہے، اور اس جیسے مقام میں کہا جاتا ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان کمال انقطاع ہے۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفین نے مواقع فصل کو بیان کیا ہے کہ کن کن جگہوں میں فصل واجب ہے، چناں چہ فرمایا کہ پانچ جگہوں میں فصل واجب ہے۔

۱ جب کہ دونوں جملوں کے درمیان کمال اتصال ہو اس طرح پر کہ دوسرا جملہ پہلے جملے کا بدل واقع ہو، جیسے "أمدّكم بما تعلمون أمدّكم بأنعام وّبنين" آیت کریمہ میں دوسرا جملہ "أمدّكم بأنعام وّبنين" پہلے جملے کا بدل ہے، اس لیے دونوں جملوں میں فصل کیا گیا اور "و أمدّكم" نہیں کہا گیا، یا دونوں

جملوں کے درمیان کمال اتصال اس طرح پایا جائے کہ دوسرا جملہ پہلے جملے کا بیان ہو، جیسے "فوسوس إليه الشيطٰن قال يا آدم هل أدلّك علىٰ شجرة الخلد"

آیت کریمہ میں دوسرا جملہ "قال یا آدم الخ" پہلے جملے "فوسوس إليه الشيطٰن" کا بیان ہے یعنی بہکانے کا انداز کیا تھا اور وسوسہ کس چیز کے متعلق تھا؟ اس کو دوسرے جملے میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ وسوسہ اکل شجرۂ ممنوعہ کے متعلق تھا، اسی لیے دونوں جملوں میں فصل کیا گیا ہے، یا دونوں جملوں کے درمیان کمال اتصال بایں طور ہو کہ دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید ہو، جیسے "فمهّل الكافرين أمهلهم رويدًا"

آیت کریمہ میں دوسرا جملہ "أمهلهم رويدًا" پہلے جملے کی تاکید ہے اور دونوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے، اسی وجہ سے دونوں میں فصل واقع ہے، گویا کہ دو جملوں کے درمیان کمال اتصال پائے جانے کی تین شکلیں ہیں، بدل، بیان اور تاکید۔

۲۔ دوسری صورت دونوں جملوں کے درمیان فصل واقع ہونے کی یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان کمال انقطاع ہو اس طرح پر کہ ایک جملہ خبریہ ہو اور ایک انشائیہ ہو، یا دونوں جملوں میں خبر اور انشاء کے اعتبار سے تو توافق ہو مگر دونوں کے درمیان کوئی مناسبت معنوی نہ ہو، پہلی صورت کی مثال، جیسے

وقال رائدهم أرسو نزاولها   فحتف كل امرئ يجري بمقدار

لغات: رائدٌ ج روّادٌ سردار، لیڈر۔ أرسىٰ إرساءً (افعال) ٹھہرنا، زاول مزاولة (مفاعلة) مقابلہ کرنا، حتفٌ موت، جرى يجري جَرَيانًا واقع ہونا، جاری ہونا۔

ترکیب: واو مستانفہ، قال فعل، رائدهم فاعل، فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ قول، "أرسُوا" فعل امر بافاعل جملہ فعلیہ انشائیہ "نُزاولها" فعل بافاعل

ومفعول جملہ فعلیہ انشائیہ شدہ جواب امر، امر با جواب امر جملہ مقولہ، فاتعلیلیہ، "حتف" مضاف "كل امرئ" مضاف الیہ سے مل کر مبتدا، يجري فعل بافاعل، بمقدار جارمجرور سے مل کر يجري سے متعلق ہوا، فعل بافاعل ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

شاعر نے اس شعر میں "أرسوا" اور نُزَاوِلهَا" دونوں کے درمیان فصل کیا ہے، اس لیے کہ پہلے جملہ "أرسوا" صیغۂ امر ہونے کی وجہ سے لفظاً ومعنیً دونوں اعتبار سے انشائیہ ہے، اور دوسرا جملہ نزاولہا لفظا اور معنی دونوں اعتبار سے خبریہ ہے، گویا دونوں جملے خبر اور انشاء کے اعتبار سے مختلف ہیں اور یہی کمال انقطاع ہے جو مانع وصل ہے۔

دوسری صورت کمال انقطاع کے پائے جانے کی یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان معنیً کوئی مناسبت نہ ہو اگر چہ دونوں جملے خبری یا انشائی ہی کیوں نہ ہوں، جیسے "عليٌّ كاتب ، الحمام طائرٌ" علی کاتب ہے، کبوتر پرند ہے۔ مثال مذکور میں دنوں جملے جملہ خبریہ ہی ہیں، مگر اس کے باوجود عطف نہیں کیا گیا اور دونوں جملوں میں فصل کیا گیا ہے، اس لیے کہ اگر چہ دونوں جملے خبری ہیں، مگر دونوں جملوں یعنی علی کی کتابت اور کبوتر کے اڑان کے درمیان معنوی مناسبت کچھ بھی نہیں ہے، نہ تو مسند الیہ کے اعتبار سے اور نہ ہی مسند کے اعتبار سے، بل کہ ہر ایک جملہ اپنا الگ الگ مفہوم ادا کر رہا ہے۔

الثَّالِثُ كَونُ الجُمْلَةِ الثَّانِيَةِ جَوابًا عَنْ سُؤَالٍ نَشَأ مِنَ الجُمْلَةِ الأولَى كَقَولِهِ ۔

زَعَمَ العَواذِلُ أنَّنِي فِيْ غَمْرَةٍ ۔۔۔ صَدَقُوْا ولكِنْ غَمْرَتِي لاتَنْجَلِي

كَأنَّهُ قِيلَ أصَدَقُوْا في زَعْمِهِمْ أمْ كَذَبُوْا؟ فَقالَ: صَدَقُوْا ، ويُقالُ بَينَ الجُمْلَتَينِ شِبْهُ كَمَالِ الإتِّصَالِ .

الرَّابِعُ أنْ تُسْبَقَ جُمْلَةٌ بِجُمْلَتَينِ يَصِحُّ عطْفُهَا على إحداهُمَا لِوُجُودِ المُنَاسَبَةِ وَفِي عطْفِها على الأخرىٰ فسَادٌ فيُترَكُ العطْفُ دفْعًا لِلْوَهمِ كَقَوْلِهِ

وَتَظُنُّ سَلْمىٰ أَنَّنِي أَبْغِي بِهَا بَدَلاً أَرَاهَا فِي الضَّلاَلِ تَهِيمُ

فَجُمْلَةُ "أرَاهَا" يَصِحُّ عطفُهَا على "تَظُنُّ" لكِنْ يَمْنَعُ مِنْ هٰذَا تَوَهُّمُ العَطْفِ علىٰ جُملَةِ "أَبْغِي بِهَا" فتَكُونُ الجُمْلَةُ الثَّالِثَةُ مِنْ مَظْنُونَاتِ سَلْمىٰ مَعَ أَنَّهُ لَيسَ مُرَادًا ، ويُقَالُ بَينَ الجُمْلَتَينِ فِي هٰذَا المَوضِعِ شِبْهُ كَمَالِ الانْقِطَاعِ.

ترجمہ: تیسری جگہ (مقام فصل کی) دوسرے جملے کا اس سوال کا جواب ہونا ہے جو پہلے جملے سے پیدا ہوا ہے، جیسے شاعر کا شعر زَعَم العواذل ـ

ملامت کرنے والے گروہ نے یہ گمان کیا کہ میں مصیبت میں ہوں، انہوں نے سچ گمان کیا، مگر میری مصیبت دور ہونے والی نہیں ہے۔

گویا کہ کہا گیا "أصدقوا في زعمهم أم كذبوا" کیا وہ لوگ اپنے گمان میں راہ راست پر ہیں یا جھوٹے؟ تو شاعر نے کہا "صدقوا" وہ لوگ راہ راست پر ہیں اور کہا جائے گا کہ دونوں جملوں کے درمیان شبہ کمال اتصال ہے۔

چوتھی جگہ یہ ہے کہ دونوں جملوں کے آگے کوئی جملہ آجائے جس کا عطف کرنا ان دونوں میں سے ایک پر صحیح ہو مناسبت کے پائے جانے کی وجہ سے اور دوسرے پر عطف کرنے میں فساد ہو تو عطف کو چھوڑ دیا جائے گا وہم سے بچنے کے لیے، جیسے شاعر کا شعر وتظنّ سلمیٰ ـ

سلمیٰ گمان کرتی ہے کہ میں اس کے علاوہ کسی اور کو چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں وہ گمراہی میں بھٹک رہی ہے۔

تو جملہ "اراها" کا "تظنّ" پر عطف کرنا صحیح ہے، لیکن "أبغي بها" کے جملے پر عطف کا وہم اس سے مانع ہے، اس لیے کہ تیسرا جملہ بھی سلمیٰ کے مظنونات میں

سے ہو جائے گا، حالاں کہ یہ شاعر کی مراد نہیں ہے، اور اس جیسے مقام میں کہا جاتا ہے کہ دو جملوں میں شبہ کمال انقطاع ہے۔

تشریح: ماقبل میں مصنفینؒ نے یہ بیان کیا تھا کہ مواقع فصل پانچ ہیں، جن میں سے دو کا بیان پہلے ہو چکے اور عبارت بالا میں تیسری اور چوتھی جگہ کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ تیسری جگہ جہاں دو جملوں کے درمیان فصل واجب ہے یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان شبہ کمال اتصال ہو اور یہ اس طرح ہوگا کہ دوسرا جملہ اس سوال کا جواب ہو جو پہلے جملے سے سمجھا گیا ہے، جیسے ؎

زعم العواذل أنني في غمرة صدقوا ولكن غمرتي لاتنجلي

لغات: زَعَمَ يَزْعُمُ زعمًا (ف) گمان کرنا، عواذلُ (واحد) عاذلةٌ ملامت گر، عَذَلَ يَعْذُلُ ويعذِل عذلا (ن ض) ملامت کرنا، غَمْرَة (ج) غَمَراتٌ شدت مصیبت، سختی، اِنْجلَى الهمُّ ينجلي اِنْجلاءً (انفعال) غم دور ہونا۔

ترکیب: زعم فعل العواذل فاعل أن حرف مشبہ بہ فعل، ی اس کا اسم، في غمرة جار با مجرور کائنًا سے متعلق ہو کر خبر أنَّ، أنَّ با اسم وخبر خود مفعول زعم، لكن ملغی، غمرتي مبتدا، لاتنجلي جملہ فعلیہ خبر یہ شدہ خبر۔

شعر مذکور میں دونوں جملوں یعنی "زعم العواذل الخ" اور "صدقوا الخ" میں فصل کیا گیا ہے، کیوں کہ پہلے مصرعہ میں جب شاعر نے ملامت گروں کا ایک خیال ظاہر کیا کہ وہ اسے پریشان حال سمجھ رہے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ملامت گروں نے سچ کہا یا جھوٹ؟ تو شاعر نے جواب میں کہا کہ ہاں! انہوں نے سچ کہا گویا کہ دوسرا جملہ پہلے جملے سے پیدا شدہ سوال کا جواب واقع ہے، اب چوں کہ یہاں پر سوال و جواب میں شدید تعلق اور اتصال ہے، اس لیے یہ بعض اعتبار سے کمال اتصال کے مشابہ ہے، اس لیے اس کا نام شبہ کمال اتصال رکھا گیا۔

الرابع: چوتھی صورت دو جملوں کے درمیان فصل کی یہ ہے کہ دونوں جملوں

کے درمیان شبہ کمال انقطاع ہو اس طریقے پر کہ دو جملوں کے بعد کوئی ایسا جملہ ہو جس کا عطف کرنا ان دو جملوں میں سے کسی ایک پر صحیح ہو لیکن عطف کرنے میں اس بات کا وہم ہو کہ ممکن ہے اس جملے کا کسی دوسرے جملے پر عطف ہو جائے جو مقصود نہیں ہے، پس اس وہم کو دور کرنے کے لیے جملۂ اولیٰ اور ثانیہ کے درمیان عطف نہیں کیا جائے گا، بل کہ فصل اور ترک واجب ہوگا، جیسے ۔

وتظنّ سلمٰی أنني أبغي بها بدلاً أراها في الضَّلال تهيم

لغات: بغٰی يبغِي بُغْيةً (ض) چاہنا، ضَلَّ يَضِلُّ ضَلالاً (ض) گمراہ ہونا، هَامَ يَهِيمُ هَيمًا پریشان ہونا، آوارہ پھرنا۔

ترکیب: واو مستانفہ، تظنّ فعل ''سلمٰی'' فاعل ''أنّ'' حرف مشبہ بہ فعل، ي اس کا اسم ''أبغي'' فعل بافاعل، بها ''ابغي'' سے متعلق ہے ''بدلاً'' مفعول، فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر أنّ، و أنّ بااسم وخبر خود مفعول تظُنُّ. ''أریٰ'' فعل بافاعل ''ها'' ذوالحال ''في الضَّلال'' متعلق مقدم بہ تهيم، ''تهيم'' فعل بافاعل ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ حال، ذوالحال باحال مفعول۔

شعر مذکور میں تیسرے جملے ''أراها'' کا عطف پہلے جملے ''تظن'' پر درست ہے، اس لیے کہ دونوں جملوں میں معنوی مناسبت موجود ہے بایں طور کہ ''تظن'' کا مسند الیہ معشوقہ ہے اور ''أراها'' کا مسند الیہ عاشق ہے تو گویا دونوں جملوں میں مناسبت تامہ موجود ہے، جس کا تقاضا یہ تھا کہ ایک کا دوسرے پر عطف کیا جائے، لیکن عطف نہیں کیا گیا، اس لیے کہ اگر عطف کے ساتھ ''و أراها'' کہہ دیا جاتا تو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ ''اُراها'' کا عطف ''تظن'' پر نہیں، بل کہ ''أبغي'' پر ہے، اور یہ وہم اس لیے ہوسکتا ہے کہ ''أراها'' سے پہلے ''أبغي'' کا ہی جملہ ہے اس قرب کی وجہ سے ذہن کا اسی طرف منتقل ہونا ممکن ہے، ایسی صورت میں جملہ ''أراها''

بھی سلمٰی ہی کے مظنونات میں شامل ہو جائے گا اور مطلب یہ ہو جائے گا کہ سلمٰی یہ گمان کرتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دوسرے کو چاہتا ہوں اور وہ یہ بھی گمان کرتی ہے کہ میں اس کو گمراہی میں بھٹکتی ہوئی خیال کرتا ہوں، حالاں کہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ سلمٰی جو یہ گمان کرتی ہے کہ میں اس کے مقابلے میں دوسرے کو چاہتا ہوں، اُس کے اِس گمان کے سلسلے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ گمراہی میں بھٹک رہی ہے، پس اس خلاف مقصود کے وہم کو دور کرنے کے لیے عطف ترک کر دیا گیا اور "أراها" بغیر عطف کے کہا گیا، اس صورت کو شبہ کمال انقطاع اس لیے کہتے ہیں کہ یہ مانع عطف پر مشتمل ہے تو مانع عطف کی وجہ سے انقطاع پایا گیا، مگر وہ مانع چوں کہ ذاتی نہیں ہے اس لیے کمال انقطاع نہیں قرار دیا گیا، بل کہ شبہ کمال انقطاع نام رکھا گیا۔

الخامسُ: أنْ لایُقْصَدَ تَشْرِيكُ الجُملتَينِ في الحُكْمِ لِقيامِ مَانِعٍ كَقَولِهِ تعالىٰ "وإذَا خلَوْا إلى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْا إنَّا مَعَكُمْ إنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" فَجُمْلَةُ "اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" لایَصِحُّ عَطْفُهَا علىٰ "إنَّا مَعَكُمْ" لاقتِضَائِهِ أنَّهُ مِنْ مقولِهِمْ ولاَ علىٰ جُمْلةِ "قَالُوْا" لاقتِضَائِهِ أنَّ اسْتِهزَاءَ اللّٰهِ بِهِمْ مُقَيَّدٌ بِحَالِ خُلُوِّهِمْ إلىٰ شَيَاطِيْنِهِمْ ، ويُقَالُ بينَ الجُمْلَتَينِ فِي هٰذَا الموضِعِ تَوَسُّطٌ بينَ الكَمَالَينِ.

ترجمہ: پانچویں جگہ (جہاں فصل واجب ہے) یہ ہے کہ حکم (اعرابی) میں دونوں جملوں کو شریک کرنے کا قصد نہ کیا جائے، کس مانع کے پائے جانے کی وجہ سے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "وإذا خلوا إلى شياطينهم قالوا إنّا معكم إنّما نحن مستهزؤن اللّٰه يستهزئ بهم" اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں ہم بے شک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف استہزاء کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ، تو "اللّٰه

یستھزئ بھم'' کے جملے کا عطف کرنا إنّا معکم پر صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ عطف چاہتا ہے کہ یہ بھی ان (منافقین) کے مقولے میں سے ہو جائے، اور نہ ''قالوا'' پر عطف کرنا صحیح ہے، کیوں کہ اس عطف کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منافقین سے استہزاء، ان کے سرداروں کے پاس تنہا رہنے کی صورت میں مقید ہو، اور ان جیسی جگہوں کے بارے میں کہا جائے گا کہ دو جملوں میں توسط بین الکمالین ہے۔

تشریح: جن پانچ صورتوں میں فصل اور ترک عطف واجب ہے، ان میں سے چار صورتوں کا بیان ہو چکا، اب یہاں سے پانچویں صورت کا بیان کیا جا رہا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب دو جملوں کے درمیان توسط بین الکمالین (بین کمال الانقطاع وکمال الاتصال) ہو تب بھی فصل واجب ہے، توسط بین الکمالین کے پائے جانے کی صورت بایں طور ہوگی کہ دو جملوں کے درمیان مناسبت اور ربط تو ہو، مگر کسی مانع کی وجہ سے دونوں جملوں کو کسی ایک حکم میں شامل کرنے کا قصد نہ کیا جائے، اس خدشے سے کہ اگر شامل کر لیا گیا یعنی ایک جملے کا دوسرے پر عطف کر دیا گیا تو معنی میں خلل پیدا ہو جائے گا، جیسے ''وإذا خلوا إلیٰ شیاطینھم قالوا إنّا معکم إنّما نحن مستھزؤن'' اور جب یہ منافقین تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو استہزا کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ان سے استہزاء کر رہے ہیں۔

آیت کریمہ میں ''اللہ یستھزئ بھم'' کا عطف ''إنّا معکم'' پر صحیح نہیں ہے، کیوں کہ عطف کرنے کی صورت میں جملہ ''اللہ یستھزئ بھم'' منافقین کا مقولہ ہو جائے گا، حالاں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اسی طریقے سے ''قالوا'' کے اوپر بھی عطف کرنا صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ''قالوا'' پر عطف کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا منافقین کے ساتھ استہزا اس وقت کے ساتھ خاص ہو جائے گا

جب منافقین کے سرداروں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ استہزاء عام ہے، کسی وقت متعین کے ساتھ مقید نہیں ہے۔

البابُ الثامنُ في الإيجَازِ والإطْنابِ والمُساوَاة

كُلُّ مَايَجُولُ في الصَّدرِ مِنَ المَعَانِي يُمْكِنُ أَنْ يُعَبَّرَ عنهُ بثلاثِ طُرُقٍ.

١ـ المُسـاوَاةُ: وهِيَ تَأدِيَةُ المَعنى المُرادِ بِعِبارةٍ مُساوِيةٍ لهُ بأنْ تَكُونَ علَى الحدِّ الَّذِيْ جرىٰ بهِ عُرفُ أوْساطِ النَّاسِ وهُمُ الَّذِيْنَ لَمْ يَرْتَقُوْا إلىٰ دَرَجةِ البَلاغةِ ولَمْ ينْحطُّوْا إلى درجَةِ الفَهاهةِ نحوُ "وَإِذَا رَأَيتَ الَّذِينَ يخُوضُونَ في آياتِنَا فَأعرِضْ عنهُمْ"

٢ـ والإيجازُ: وهُوَ تأدِيةُ المعنىٰ بعِبارةٍ ناقِصةٍ عنهُ مَعَ وفائِهَا بالغَرَضِ نحوُ ع قِفَانَبْكِ مِنْ ذِكرىٰ حبيبٍ ومنْزِلِ

فإذَا لَمْ تفِ بالغرضِ سُمِّيَ إخْلالاً كَقَولِه ؎

وَالعيشُ خيرٌ فِي ظِلَا   لِ النَّوكِ مِمَّنْ عَاشَ كَدًّا

مُرادُهُ أنَّ العَيشَ الرَّغَدَ في ظِلَالِ الحُمْقِ خيرٌ مِنَ العَيشِ الشَّاقِّ في ظِلَالِ العَقْلِ.

آٹھواں باب ایجاز، اطناب اور مساوات کے بیان میں

جو بھی معانی دل میں آتے ہیں تین طریقوں سے ان کی تعبیر ممکن ہے۔

۱ مساوات اور وہ معنیٰ مقصود کا ادا کرنا ہے، ایسی عبارت سے جو اس مقصد کے مساوی ہو، اس طور پر کہ عبارت اس حد پر ہو جس پر درمیانی طبقے کے لوگوں کا عرف جاری ہو اور وہ (اوساط الناس) ایسے لوگ ہیں جو درجۂ بلاغت تک نہ پہنچے ہوں اور عجز و درماندگی کے درجے تک نہ گر گئے ہوں، جیسے "وَإِذَا رأيت الَّذين

يخوضون في آياتنا فأعرض عنهم'' اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کرر ہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جائیے۔

۲ ایجاز اور وہ معنی کو اس سے کم عبارت میں ادا کرنا ہے اس عبارت کے مقصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، جیسے ع

فقانبك من ذكرىٰ حبيب ومنزل

اے دونوں ساتھیوں ٹھہر جاؤ ہم محبوب اور منزلِ محبوب کی یاد میں رولیں۔

لیکن اگر وہ عبارت غرض کو پوری نہ کرے، تو اس کو اخلال کہتے ہیں، جیسے شاعر کا شعر ے

والعيش خير في ظلا ل النوك ممن عاش كذا

زندگی بے وقوفی کے سایے میں بہتر ہے اس شخص کی زندگی سے جو مشقت کے ساتھ زندگی گزارے۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ آرام وسکون کی زندگی حماقت کے سائے میں بہتر ہے عقل کے سائے میں تکلیف دہ زندگی سے۔

تشریح: اس آٹھویں باب میں مصنفینؒ ایجاز، اطناب اور مساوات کا بیان فرمارہے ہیں کہ گفتگو اور کلام کے تین طریقے ہوتے ہیں اور بلیغ شخص اپنی مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے ان ہی تین طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کرتا ہے، پہلا طریقہ مساوات ہے، دوسرا ایجاز اور تیسرا اطناب، یعنی کبھی تو بہت مختصر کلام کرتا ہے اور کبھی طویل اور کبھی درمیانی جو نہ مختصر ہو اور نہ طویل، حضرات مصنفینؒ ہر ایک کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں، عبارت بالا میں مساوات اور ایجاز کی تشریح کی ہے چناں چہ فرمایا:

المساواة وهي تادية المعنى: مساوات یہ ہے کہ الفاظ معنی مقصود کے برابر ہوں یعنی اتنے ہی الفاظ ہوں جتنے معانی ہوں اور اتنے ہی معانی ہوں جتنے

الفاظ، یعنی نہ الفاظ معانی سے زیادہ ہوں اور نہ معانی الفاظ سے زیادہ ہوں، جیسے "وَإذا رأيت الّذين يخوضون في آياتنا" اور جب آپ لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات میں عیب جوئی کرر ہے ہیں، توان لوگوں سے کنارہ کش ہوجایئے۔

آیت مذکورہ میں مساوات ہے اس طریقے سے کہ الفاظ صرف اتنے ہیں جتنے معانی، چناں چہ اگر اس میں کوئی لفظ بڑھادیا جائے تو وہ لفظ زیادہ ہوجائے گا اور اگر کم کردیا جائے تو معنی میں خلل واقع ہوجائے گا، اردو میں جیسے ؂

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

اس شعر میں کوئی لفظ معنیٔ مقصود سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔

الإيجاز وهو تأدية المعنى: یہاں سے دوسرے طریقے یعنی ایجاز کی وضاحت فرمار ہے ہیں کہ ایجاز یہ ہے کہ الفاظ معنیٔ مقصود سے کم ہوں، لیکن مقصود مکمل طریقے سے واضح ہوجائے، یعنی وہی مختصر عبارت معنی مقصود کو ادا کرنے کے لیے کافی ہو، جیسے "قِفَانَبْكِ مِنْ ذِكرىٰ حَبِيبٍ و مَنزِلِ" اے دونوں ساتھیو! ٹھہر جاؤ ہم محبوب اور منزل محبوب کی یاد میں رولیں۔

مثال مذکور میں الفاظ تو معنیٔ مقصود سے کم ہیں اس طریقے سے کہ "یا رفیقای" وغیرہ جیسے الفاظ شروع میں نہیں ذکر کیے گئے ہیں، جب کہ شاعر نے اپنے دوساتھیوں کو مخاطب کر کے یہ کہا ہے لیکن "قفا" تثنیہ کا صیغہ ذکر کردیا ہے تا کہ دونوں پر دلالت ہوجائے، ایسے ہی "و منزل" کے بعد "منزل حبیب" تھا مگر وہاں بھی "حبیب" کو ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ پہلا "حبیبٌ" اس پر دلالت کرر ہا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ کے اختصار کے باوجود معنیٔ مقصود مکمل طریقے سے ادا ہور ہے ہیں۔

اور اگر عبارت معنیٔ مقصود سے کم ہو اور معنیٔ مقصود اس سے واضح نہ ہو، بل کہ اس

کو سمجھنے کے لیے تکلف اور غور وفکر کی ضرورت ہو تو اس کا نام اخلال ہے، جیسے ؎

والعيش خير في ظلا ل النوك ممن عاش كدا

لغات: عاشَ يعِيشُ عيشًا (ض) آرام کے ساتھ زندگی گذارنا، ظِلالٌ (واحد) ظِلٌّ سایہ، نوِكَ ينوَكُ نوَكًا (س) بے وقوف ہونا، كدَّ يكُدُّ كدًّا (ن) محنت کرنا، مشقت اٹھانا۔

ترکیب: واو مستانفہ، "العيش" مبتدا، "خيرٌ" صیغہ صفت "في" جار "ظلال النوك" مجرور، جار با مجرور متعلق اول بہ خيرٌ، من حرف جار، من موصولہ، عاش فعل ضمیر فاعل ذوالحال، كدًّا بتاویل اسم فاعل حال، ذوالحال با حال فاعل فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صلہ، موصول با صلہ مجرور شدہ متعلق ثانی، خيرٌ بہ ہردو متعلق خبر مبتدا، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور سے شاعر کی مراد یہ بیان کرنا ہے کہ جہالت کی وہ زندگی جس میں خوش حالی ہو اس زندگی سے بہتر ہے جس میں علم کے ساتھ تنگ دستی ہو، یعنی خوش حال جاہل کی زندگی تنگ دست عالم کی زندگی سے بہتر ہے، مگر یہ مطلب شعر مذکور کے الفاظ سے مکمل طریقے سے نہیں سمجھا جا رہا ہے، اس لیے کہ یہی معنی نثر میں ان الفاظ میں ادا کیے گئے ہیں، إن العيش الرغد في ظلال الحمق خيرٌ من العيش الشاق في ظلال العقل" اور شعر میں "العيش" کی صفت "الرغد" اور "ممن عاش كدًّا" کی قید "في ظلال العقل" موجود نہیں ہے اور نہ ہی ان الفاظ محذوفہ پر دلالت کرنے کے لیے کوئی قرینہ ہے، اسی وجہ سے مقصود واضح نہیں ہے۔

٣. والإطنابُ وهو تأديةُ المعنى بعِبارةٍ زائدةٍ عنهُ معَ الفائِدةِ نحو "ربِّ إنّي وهن العَظمُ منّي واشتَعلَ الرَّأسُ شيبًا" أي كَبرتُ فإذا لَم تكُنْ في الزِّيادةِ فائدةٌ سُمّي تطويلاً إن كانت الزِّيادةُ غير مُتعيِّنةٍ، وحشوًا إنْ تعيَّنتْ فالتَّطويلُ نحوُ ع

وَألفٰى قَولَها كَذِبًا ومَينًا

وَالحَشْوُ نحوُ ع

وأعلَمُ عِلْمَ اليَومِ والأمسِ قَبْلَهُ

وَمَنْ دوَاعِي الإيجازِ تسهِيلُ الحِفْظِ، وتقرِيبُ الفَهمِ، وضِيقُ المَقامِ والإخفاءُ ودفعُ سآمةِ المُحادَثة.

وَمِنْ دواعِي الإطنَابِ تثبِيتُ المعنى، وتوضِيحُ المُرادِ، والتّوكيدُ ودفعُ الإبهامِ.

ترجمہ: اطناب اور وہ معنیٰ مقصود کو ادا کرنا ہے اس معنیٰ سے زائد عبارت میں فائدے کے ساتھ، جیسے "ربّ إنّي وهن العظم منّي واشتعل الرأس" اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوچکی ہیں اور سر میں بڑھاپا پھیل گیا ہے۔یعنی میں بوڑھا ہوگیا ہوں، تو اگر زائد عبارت میں کوئی فائدہ نہ ہوتو تطویل کہیں گے بشرطیکہ زائد عبارت غیر متعین ہو، اور حشو کہیں گے اگر متعین ہو، تطویل جیسے "وألفى قولها كذبًا و مينًا" اور پایا اس نے (جذیمۃ الابرش نے) اس (زبّاء) کی بات جھوٹی اور دروغ آمیز۔

اور حشو جیسے "واعلم علم اليوم والأمس قبله" میں آج اور آج سے پہلے کل گذشتہ کی خبر جانتا ہوں۔

اور ایجاز کے اسباب میں سے ہے یاد کرنے کی آسانی، (فہم مراد کو) ذہن سے قریب کردینا، اور مقام کی تنگی، اخفاء اور گفتگو میں اکتاہٹ سے بچانا ہے۔اور اطناب کے اسباب میں سے معنیٰ کو (دل میں) راسخ کردینا، مقصد کا واضح کردینا، تاکید پیدا کرنا اور ابہام کو دور کرنا ہے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں اولاً حضرات مصنفینؒ نے گفتگو کے تیسرے طریقے "اطناب" کی تعریف کی ہے، مثال سے وضاحت فرمائی ہے، اس کے بعد ایجاز

واطناب کے اسباب کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایاو الإطناب و ھو تأدیة المعنی یعنی اطناب کہتے ہیں کسی فائدے کی غرض سے معنیٰ مقصود کواس سے زائد عبارت میں ادا کرنا، جیسے ''ربِّ إنّي و ھن العظم منّی و اشتعل الرّأسُ شیبًا'' اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی۔

آیت کریمہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کی زبان مبارک سے حکایت کی گئی ہے، جب انھوں نے طلبِ ولد کے لیے پروردگار عالم سے دعا کی تھی اور اپنے بڑھاپے کو بیان کیا تھا، آیت میں اطناب بایں طور ہے کہ ''و ھن العظم'' سے معنی مقصود ادا ہو جارہا ہے، یعنی صرف اس جملے سے بڑھاپے کے آجانے کا معنیٰ واضح ہورہا ہے مگر ''و اشتعل الرأس شیبًا'' کا جملہ جو زائد لایا گیا ہے وہ ایک فائدے کے لیے، اور وہ فائدہ یہ ہے کہ دوسرے جملے میں اسی معنی کو بلیغ اور خوب صورت انداز میں ادا کیا ہے، اس لیے کہ اگر اس طلبِ ولد کے موقعے پر جب کہ ظاہری اسباب مفقود ہیں، لفظ ''کبرت'' جیسے سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا جاتا تو وہ قوت پیدا نہ ہوتی جو ''وہن عظم'' اور ''اشتعال شیب'' میں ہے۔

لیکن اگر زیادتی میں کوئی فائدہ نہ ہو تو پھر اسے اطناب نہیں کہیں گے، بل کہ اس کا نام ''تطویل'' ہوگا اس وقت جب کہ زیادتی متعین نہ ہو، اور اگر زیادتی متعین ہے تو اس کا نام ''حشو'' ہے گویا کہ تطویل اور حشو کے درمیان فرق زیادتی کی تعیین اور عدم تعیین ہے، تطویل کی مثال، جیسے ''و ألفی قولھا کذبًا و مینًا''

مثال مذکور میں محل استشہاد لفظ ''کذبا و میناً'' ہے جن میں ایک زائد ہے اور بغیر کسی فائدے کے ہے، اس لیے کہ جو معنیٰ ''مین'' سے ادا ہوا ہے بالکل یہی معنی ''کَذِبٌ'' سے بھی ادا ہورہا ہے اور یہ زیادتی بھی غیر متعین ہے، کیوں کہ ہم تعیین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں سے کون زائد ہے۔

اور حشو کی مثال، جیسے ''و اعلم علم الیوم و الأمس قبله'' مثال مذکور میں

محل استشہاد لفظ "قبله" ہے جو زائد ہے اور کوئی فائدہ نہیں دے رہا ہے، کیوں کہ "قبلیت" کا معنی خود ہی "أمس" کے اندر پایا جا رہا ہے، لہٰذا مزید ایک لفظ "قبله" کے لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا، اور یہی "قبله" متعین طور پر زائد ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ "الأمس" کا عطف الیوم پر تو صحیح ہے مگر "قبله" کا صحیح نہیں ہے۔

ومن دواعي الایجاز: یہاں سے مصنفینؒ ایجاز کے اسباب کو بیان فرما رہے ہیں کہ کن مقاصد کے لیے کلام کو مختصر لایا جاتا ہے، چناں چہ فرمایا کہ ایجاز کا ایک سبب تو تسہیل حفظ ہے یاد کرنے میں آسانی پیدا کرنا، یعنی کلام کو مختصر اس لیے لایا جاتا ہے، تاکہ اسے یاد کرنے اور ضبط کرنے میں آسانی ہو، کیوں کہ جو بات مختصر ہوتی ہے اس کو یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

دوسرا سبب: تقریب فہم ہے، سمجھنے میں قریب کر دینا، یعنی مختصر بات کو آدمی بہت جلد سمجھ جاتا ہے، اس لیے کلام میں ایجاز کرتے ہیں، کیوں کہ طویل بات سے کبھی کبھی اصل مقصد ہی خبط ہو جاتا ہے۔

تیسرا سبب: ضیق مقام ہے، موقع ومحل کے تنگ ہونے کی وجہ سے بھی آدمی طویل گفتگو کرنے سے عاجز رہتا ہے، اس لیے تھوڑے وقت میں مختصر بات پر اکتفا کر لیتا ہے۔

چوتھا سبب: اخفاء ہے بات کو مخفی رکھنا، یعنی کبھی اس لیے بات مختصر کی جاتی ہے کہ سارے لوگ اس سے واقف نہ ہو جائیں، بل کہ بات صرف انہیں تک محدود رہے، جن کو وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے۔

پانچواں سبب: **دفع سآمة المحادثة** ہے اکتاہٹ سے بچانا، یعنی کبھی کبھی طویل کلام کرنے سے اس وجہ سے احتراز کیا جاتا ہے تاکہ سامعین اکتاہٹ محسوس نہ کریں، کیوں کہ طویل بات سے انسان اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے، نتیجتاً بات کو پوری دل جمعی سے نہیں سنتا ہے۔

ومن دواعی الإطناب: ایجاز کے اسباب کو بیان فرمانے کے بعد اب اطناب کے اسباب کو بیان کرر ہے ہیں، فرماتے ہیں کہ اطناب کے اسباب میں سے ایک سبب "تثبیت المعنی" ہے معنی کو دل میں راسخ کرنا، یعنی طویل کلام اس لیے کرتے ہیں تا کہ مخاطب کے دل میں معنی بالکل ثابت اور راسخ ہوجائے اور بات پوری طرح جاں گزیں ہوجائے۔

دوسرا مقصد: توضیح المراد ہے مقصد کو واضح کرنا، یعنی کلام کو اس لیے طویل کرنا تا کہ مقصد پوری طرح واضح ہوجائے، اس لیے کہ مختصر کلام کرنے سے بسا اوقات مقصد واضح نہیں ہو پاتا اور بات پیچیدہ رہتی ہے۔

تیسرا مقصد: تاکید ہے یعنی بات کو مؤکد اور مستحکم کرنے کے لیے کلام طویل کیا جاتا ہے۔

چوتھا مقصد: دفع الإبهام ہے یعنی کبھی کلام میں کسی طرح کا ابہام رہ جاتا ہے اس ابہام کو دور کرنے کے لیے طویل کلام کرتے ہیں۔

أَقْسَامُ الإِيجَازِ

الإيجازُ إمَّا أنْ يكُونَ بِتَضَمُّنِ العِبارةِ القَصِيرةِ مَعانِيَ كَثِيرةً، وهو مُركزُ عِنايةِ البُلَغاءِ، وبِهِ تتفاوتُ أقْدارُهُمْ ويُسَمّٰى إيجازَ قَصْرٍ نحوُ قولِهٖ تعالٰى "ولَكُمْ فِي القِصَاصِ حيوٰةٌ" وَإمَّا أن يكُونَ بِحَذْفِ كلِمَةٍ أوْ جُمْلَةٍ أوْ أكْثَرَ مع قَرِينَةٍ تُعَيِّنُ المَحْذُوفَ، ويُسَمّٰى إيجَازَ حذْفٍ، فَحَذفُ الكَلِمَةِ كحَذْفِ "لا" في قولِ امْرَئِ القَيسِ فقلتُ: ؎

يمينَ اللّٰه اَبْـرحُ قَـاعِـدًا
وَلَوْ قطَّعُوْا رَأسِي لدَيكِ وأوصَالِي

وحَذْفُ الجُمْلةِ كَقَولِهٖ تعالٰى "وَإنْ يُّكَذِّبُوكَ فقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ

قَبْلِكَ" أي فتَأسَّ وَاصْبِرْ ، وحذفُ الأكثرِ نحوُ قَولِهِ تعالىٰ "فَأرْسِلُون يُوسفُ أيُّهَا الصِّدِّيقُ" أي اَرْسِلُونِيْ إلىٰ يُوسفَ لِاَسْتَعْبِرَهُ الرُّؤيَا ففعَلُوا فَأتَاهُ فَقَالَ لَهُ: يايوسفُ .

ایجاز کی قسمیں

ایجاز یا تو مختصر عبارت کے بہت زیادہ معانی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہی قسم اہل بلاغت کی توجہ کی مرکز ہے اور اسی سے بلاغت میں ان کی قدریں وحیثیتیں مختلف ہوتی ہیں اور اس کا نام ایجاز قصر ہے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول "ولكم في القصاص حيوٰة" اورتمہارے لیے قصاص میں بڑی زندگی ہے، یا تو کسی کلمے یا جملے یا اس سے زیادہ کے حذف کرنے سے ہوگا محذوف کے تعین پر قرینے کے پائے جانے کے ساتھ اور اس کا نام ایجاز حذف ہے، تو کلمے کے حذف کی مثال، جیسے "لا" کا حذف کرنا ہے امرئ القیس کے قول فقلت يمين الله الخ میں ۔

تو میں نے کہا خدا کی قسم میں بیٹھا ہی رہوں گا، اگر چہ وہ لوگ تمہارے سامنے میرے سر اور جوڑوں کو کاٹ ڈالیں۔

اور جملے کا حذف کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول "وإن يُكَذِّبُوكَ فقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ" اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جا چکے ہیں، یعنی یہ کہ آپ غم گساری سے کام لیں اور صبر کریں۔ اور جملے سے زیادہ کا حذف کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "فارسلون يوسف أيها الصديق" آپ لوگ مجھ کو بھیج دیجئے اے یوسف! اے صدق مجسم! یعنی یوسف کے پاس مجھ کو بھیجو تا کہ میں ان سے خواب کی تعبیر دریافت کروں، پس ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، چناں چہ وہ یوسف علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے

کہا اے یوسف!

تشریح: عبارت مذکورہ میں ایجاز کی قسموں کو بیان کیا گیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایجاز کی دو قسمیں ہیں (۱) ایجاز قصر (۲) ایجاز حذف۔

مصنفینؒ نے ایجاز قصر کی تشریح بایں طور کی ہے کہ ایجاز قصر یہ ہے کہ عبارت مختصر ہو اور معانی زیادہ ہوں جیسے "**ولکم فی القصاص حیٰوۃ**" آیت کریمہ میں الفاظ تو بہت مختصر ہیں مگر وہ اپنے اندر معانی کثیرہ کو سموئے ہوئے ہیں، اس طریقے سے کہ اس آیت میں قصاص کا حکم بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ تمہارے لیے اس قانون قصاص کے نفاذ میں جانوں کا بڑا بچاؤ ہے، کیوں کہ اس قانون کے اجراء کے خوف سے لوگ ارتکاب قتل سے ڈریں گے تو کئی ایک جانیں بچ جائیں گی، اور آیت کریمہ کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکم قصاص قاتل کے حق میں باعث حیات اخروی ہے۔

اور ایجاز حذف کی توضیح بایں طور کی ہے کہ ایجاز حذف یہ ہے کہ کسی جملے میں کوئی کلمہ یا جملہ یا جملے سے زائد کو حذف کر دیا جائے اور جملے میں ایسا قرینہ بھی موجود ہو جو محذوف کو متعین کرے، کلمے کے حذف کی مثال حضرات مصنفینؒ نے امرئ القیس کے مندرجہ ذیل شعر سے دی ہے ؎

فقلت یمین اللّٰہ أبرح قاعدًا ولو قطعوا رأسي لدیك وأوصالي

لغات: رأسٌ (ج) رُؤُوْسٌ سر، أوصالٌ (واحد) وصلٌ جوڑ، عضو۔

ترکیب: فا برائے تفسیر، قلت فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ قول "یمین اللّٰہ" مضاف با مضاف الیہ مفعول ہوا، أقسم فعل محذوف کا، فعل قسم با فاعل ومفعول جملہ فعلیہ انشائیہ شدہ قسم، "أبرح" فعل ناقص ضمیر اس کا اسم، قاعدًا خبر، فعل ناقص اپنے اسم وخبر سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ جواب قسم ومقولہ۔ لو، وصلیہ، "قطعوا" فعل با فاعل "رأسي" معطوف علیہ، واو عاطفہ "أوصالي" معطوف،

معطوف علیہ و معطوف مفعولِ قطعوا "لدیك" ظرف فعل با فاعل و مفعول و ظرف جملہ فعلیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "أبرح" ہے، جو اصل میں "لاأبرح" تھا "لا" کو حذف کردیا گیا ہے۔ لا ابرح افعال ناقصہ میں سے ہے، اور "مابَرِحَ" کا مضارع متکلم ہے جو "لاأزال" کے معنی میں، ہے یعنی میں مستقل بیٹھا ہی رہوں گا۔

حذف جملہ کی مثال جیسے "وإن یکذّبوك فقد کذّبت رسلٌ من قبلك" ہے جو اصل میں "وإن یکذبوك فتأسَّ و اصبر" ہے اور یہ ان شرطیہ کی جزا ہے "فقد کذّبت رسل من قبلك فتاسَّ و اصبر" کو حذف کردیا گیا اور قرینہ فقد کذّبت ہے جو جزا کے قائم مقام کردیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ "تاسَّ" اور "اصبر" دو جملے محذوف نہیں ہیں بل کہ محذوف صرف ایک ہی جملہ ہے، اور دوسرا جملہ پہلے جملے کے معنی کی وضاحت کے لیے ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مشرکین آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ غم نہ کریں، اور صبر سے کام لیں، کیوں کہ صرف آپ ہی کو نہیں جھٹلایا جارہا ہے؛ بل کہ آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے۔

ایک جملے سے زائد حذف کی مثال، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "فارسلون یوسف أیها الصدیق" آپ مجھ کو بھیج دیجئے اے یوسف! اے صدق مجسم۔

آیت مذکورہ میں ایک جملے سے زائد محذوف ہے، کیوں کہ اصل عبارت یہ تھی "فارسلوني إلی یوسف لاستعبره الرّؤیا ففعلوا فأتاه فقال له یایوسف" اس آیت میں "لأستعبره الرّؤیا، ففعلوا، فأتاه، فقال له، یا" پانچ جملے محذوف ہیں، اس لیے کہ "یا" بھی ایک جملہ "ادعوا" کے قائم مقام ہے۔

قرینہ یہاں پر آیت کریمہ کے سیاق وسباق کے جملے ہیں جو خواب کی تعبیر کے لیے اجازت طلب کرنے اور تعبیر بتلانے پر دلالت کررہے ہیں۔

أقسامُ الإطنابِ

الإطناب يكونُ بِأمُورٍ كثِيرَةٍ .

مِنْهَا: ذِكرُ الخاصِّ بعدَ العامِّ نحوُ "اجْتَهِدُوْا فِيْ درُوسِكُمْ واللُغةِ العرَبِيَّةِ" وفَائدَتُهُ التَّنبيهُ علٰى فضْلِ الخَاصِّ كأنَّهُ لرِفْعَتِهٖ جنسٌ آخرُ مُغَايِرٌ لِمَا قبْلَهُ .

وَمِنْهَا: ذكرُ العامِّ بعدَ الخَاصِّ ، كَقَولِهٖ تعالٰى "ربِّ اغْفِرْلِيْ ولِوَالِدىَّ ولِمَنْ دَخلَ بيْتِيَ مُؤمِنًا وللْمُؤمنِينَ والمُؤمناتِ"

وَمِنْهَا: الإيضَاحُ بعدَ الإبهامِ نحوُ "أَمدَّكُم بِمَا تَعْلَمُونَ أَمدَّكُمْ بِأنْعامٍ وبَنِينٍ"

وَمِنْهَا: التَّوشِيْعُ وهُوَ أنْ يُؤتىٰ فيْ آخِرِ الكلامِ بِمُثَنّٰى مُفَسَّر بإثْنَينِ كَقَولِهٖ ۔

أُمْسِي واُصبِحُ مِنْ تذْكَارِكُمْ وصِبًا
يَرثِيْ لِيَ المُشْفِقَانِ الأهلُ والوَلَدُ

اطناب کی قسمیں

اطناب بہت سے امور کے باعث ہوتا ہے، ان ہی میں سے عام کے بعد خاص کوذکر کرنا ہے، جیسے "اجتهدوا في دروسكم واللغة العربية" تم لوگ اپنے اسباق میں محنت کرواور عربی زبان میں۔ اوراس کا فائدہ خاص کی فضیلت پر متنبہ کرنا ہے، گویا کہ وہ اپنے بلندی کی وجہ سے دوسری جنس ہوگئی ہے، جواپنے ماقبل کے مغائر ہے۔

اوران ہی میں سے خاص کے بعد عام کا ذکر کرنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول

''ربَّ اغفرلی ولوالدي ولمن دخل بیتي مؤمناً وللمؤمنین والمؤمنات'' اے میرے رب مجھ کواور میرے ماں باپ کواور جومومن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کواور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کوبخش دیجئے۔

ان ہی میں سے ابہام کے بعد ایضاح ہے، جیسے ''أمدّکم بما تعلمون أمدّکم بأنعام وّبنین'' اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ایسی چیزوں سے جن کوتم جانتے ہواس نے تمہاری مدد کی چار پایوں اور فرزندوں سے۔

اوران ہی میں سے توشیع ہے اور توشیع یہ ہے کہ کلام کے آخر میں تثنیہ لایا جائے جن کی تفسیر دوافراد سے کی گئی ہو، جیسے شاعر کا شعر أمسی و أصبح ؎

میں شام کرتا ہوں اور صبح کرتا ہوں تمہاری یاد اور محبت میں، مجھ پر رحم کھاتے ہیں دومشفق یعنی اہل اور اولاد۔

تشریح: ایجاز کے اقسام سے فراغت کے بعد اب حضرات مصنّفین اطناب کے اقسام کی وضاحت فرمارہے ہیں، چناں چہ فرمایا کہ اطناب کئی طریقے سے ہوتا ہے، اس کے بعد ہر ایک طریقے کی مثال سے وضاحت فرمائی ہے۔

۱۔ ذکر الخاص بعد العام، یعنی عام شئ کو بیان کرنے کے بعد خاص شئ کو بیان کرنا، جیسے ''اجتهدوا في دروسكم واللغة العربية'' مثال مذکور میں ''دروس'' عام ہے جس کے تحت عربی زبان کا سبق بھی داخل ہے، مگر اس کے بعد ''اللغة العربية'' کو خاص طور پر ذکر کیا، یہی ذکر الخاص بعد العام ہے، قرآن کریم کی آیت ''حافظوا على الصلٰوة والصّلوٰات الوسطىٰ'' میں ''الصّلوات'' عام ہے اور ''الصّلوٰة الوسطىٰ'' خاص ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ خاص کی فضیلت پر تنبیہ ہوجاتی ہے گویا کہ وہ اپنی فضیلت اور بلندی کی وجہ سے دوسری جنس ہے جو پہلے کے مغایر ہے، اس لیے کہ خاص کا عطف کیا گیا ہے عام

پر اور عطف مغایرت کا تقاضہ کرتا ہے۔

۲ ذکر العام بعد الخاص: یعنی خاص شئ کو بیان کرنے کے بعد عام شئ کو بیان کرنا، جیسے "ربّ اغفرلي ولوالدي ولمن دخل بيتي مؤمنًا وللمؤمنين والمؤمنات" آیت کریمہ میں "المؤمنين والمؤمنات" عام ہے، جس میں وہ سب داخل ہیں، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی متکلم، والدین وغیرہ یعنی پہلے خاص کا تذکرہ کیا اس کے بعد عام کو لائے اور یہی ذکر العام بعد الخاص ہے۔

۳ الإيضاح بعد الإبهام: یعنی پہلے ایک مطلب کو مبہم ذکر کریں پھر اس کی توضیح کریں تاکہ سامع کے ذہن میں وہ مطلب خوب راسخ ہو جائے، جیسے "أمدّكم بما تعلمون امدّكم بأنعام وّبنين" اس آیت میں "ماتعلمون" میں ابہام تھا، دوسری آیت میں "بأنعام وبنين" سے اس کی توضیح کر دی گئی ہے۔

۴ التوشيع یعنی آخر کلام میں کوئی ایسا صیغۂ تثنیہ لایا جائے جس کی تفسیر بذریعہ عطف دو افراد سے کی جائے، جیسے شاعر کا شعر ؎

أمسي وأصبح من تذكاركم وصبا يرثي لي المشفقان الأهل والولد

لغات: ذَكَرَ يذْكُرُ ذِكرًا وتذْكَارًا (ن) یاد کرنا، تذکرہ کرنا، صبا يصْبُو صَباءً ا (ن) مشتاق ہونا، مائل ہونا، رَثَى لأحدٍ يرثي رثَاءً ا (ض) کسی پر رحم کھانا۔

ترکیب: أمسي فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ معطوف علیہ، أصبح فعل وفاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف، من جارہ "تذكار" مضاف "كم" مضاف الیہ، مضاف با مضاف الیہ معطوف علیہ، واو عاطفہ "صبا" معطوف، معطوف علیہ با معطوف مجرور، جار با مجرور متعلق بہ أمسي یا بہ أصبح، "يرثي" فعل، لي متعلق بہ يرثي، "المشفقان" مفسر، "الأهل والولد" معطوف علیہ و معطوف مفسّر،

مفسَّر بامفسِّر فاعل، فعل بافاعل ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔
شعر مذکور میں محل استشہاد "المشفقان الأهل و الولد" ہے "المشفقان" کلام کے آخر میں ہے تثنیہ کا صیغہ ہے اور "الأهل و الولد" سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔
واضح رہے کہ توشیع صرف تثنیہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بل کہ دو سے زائد میں بھی یہ صورت پائی جاسکتی ہے۔

ومِنهَا: التَّكرِيرُ لِغَرَضٍ كَطُولِ الفَصْلِ في قَولِه ؎

وَانَّ امْرَءً ا دَامَتْ مَوَاثِيقُ عهْدِهٖ　　علٰى مِثْلِ هٰذا إنَّهٗ لَكَرِيمُ

وَكَزِيَادَةِ التَّرغِيبِ في العَفْوِ في قولِهِ تعالٰى "إنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلادِكُم عَدُوًّا لكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ وإنْ تَعْفُوْا وتَصْفَحُوْا وتَغْفِرُوْا فإنَّ اللّٰهَ غفُورٌ رَّحِيمٌ" وكَتأكِيدِ الإنْذَارِ في قَولِهِ تعالٰى "كَلاَّ سَوفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلاَّ سَوفَ تَعْلَمُونَ"

وَمِنْهَا: الاعْتِراضُ وَهُوَ توَسُّطُ لَفْظٍ بينَ أجْزاءِ جُمْلةٍ أو بينَ جُمْلَتَينِ مُرْتَبِطَتَينِ مَعْنًى لِغَرَضٍ نحوُ ؎

إنَّ الثَّمانِينَ ـ وَبُلِّغْتَهَا ـ　　قَدْ اَحْوَجَتْ سَمْعِي إلٰى تَرْجُمان

ونحوُ قَولِهِ تعالٰى "ويَجْعَلُونَ لِلّٰهِ البَنَاتِ سُبْحَانَهٗ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ"

وَمِنْهَا: الإيغالُ وهُوَ خَتمُ الكلامِ بِمَا يُفِيدُ غرَضًا يَتِمُّ المَعْنٰى بِدُونِهِ كَالمُبَالغَةِ في قَولِ الخَنْساءِ ؎

وإنَّ صَخْرًا لَتَأتَمُّ الهُدَاةُ بهٖ　　كأَنَّهٗ علَمٌ فِيْ رأسِهٖ نَارٌ

ترجمہ: اور ان ہی میں سے کلام کو مکرر لانا ہے کسی مقصد کے لیے، جیسے کہ طول فصل شاعر کے شعر میں "وإن امرءاً دامت ؎
اور بلاشبہ ایسا شخص جس کے عہد و پیان اس جیسی چیز پر ہمیشہ رہے ہوں،

یقیناً وہ شریف ہے۔

اور جیسے کہ معافی کے سلسلے میں زیادتی ترغیب کے لیے اللہ تعالیٰ کے قول "إنّ أزواجكم وأولادكم عدوّاً لكم فاحذروهم وإن تعفوا وتصفحوا وتغفروا فإنّ اللّٰهَ غفور رَّحيمٌ" میں۔تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں سو تم ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کردو اور درگذر کر جاؤ اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور جیسا کہ ڈرانے کی تاکید اللہ تعالیٰ کے فرمان "كلاّ سوف تعلمُونَ ثمّ كلاّ سوف تعلمون" میں۔ ہر گز نہیں تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا، پھر ہر گز نہیں تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

اور ان ہی میں جملہ معترضہ کا آنا ہے، اور وہ (اعتراض) ایک جملے کے اجزاء یا دو معنی مربوط جملوں کے درمیان کسی لفظ کا آنا ہے کسی مقصد کے لیے، جیسے

إن الثمانين وبلّغتها ــــ

بے شک اسی برس کی عمر نے اور تم اس عمر تک پہنچائے جاؤ، میرے کانوں کو ایک ترجمان کا محتاج بنادیا ہے۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول "ويجعلون لله البنات سبحانه ولهم مايشتهون" وہ (کفار) اللہ تعالیٰ کے لیے لڑکیاں ٹھہراتے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں سے پاک ہے اور اپنے لیے جو چاہتے ہیں ٹھہراتے ہیں۔

ان ہی میں سے ایغال ہے اور وہ کلام کو ختم کرنا ہے ایسے لفظ سے جو کسی ایسے غرض کا فائدہ پہنچائے کہ معنی اس کے بغیر پورا ہو جائے، جیسے کہ مبالغہ حضرت خنساءؓ کے قول "وإنّ صخرًا" میں

بے شک صخر کی پیروی تمام رہبران قوم کرتے ہیں گویا کہ وہ پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر آگ جل رہی ہو۔

تشریح: اطناب کے بارہ طریقے مصنفینؒ نے بیان فرمائے ہیں جن

میں سے چار طریقوں کی وضاحت کر چکے، اب بقیہ طریقوں کی وضاحت فرمارہے ہیں، عبارت بالا میں اطناب کے تین طریقوں کی تشریح فرمائی ہے۔

(۵) تکریر یعنی کسی مقصد کے لیے کلام کو مکرر لانا، وہ مقاصد مختلف ہیں، چناں چہ انھیں مقاصد میں سے ایک مقصد طول فصل ہے یعنی کلام کے طویل ہو جانے کی وجہ سے کسی لفظ کو مکرر لانا اس اندیشے سے کہ یہ لفظ مخاطب کے ذہن سے نکل نہ گیا ہو، جیسے شاعر کے اس شعر میں ؎

وإنّ امرأ دامت مواثیق عهده علی مثل هٰذا إنّه لکریم

لغات: دَامَ یدُومُ دوَامًا (ن) ہمیشہ رہنا، مَوَاثِیقُ (واحد) مِیثَاقٌ، عہد و پیمان، کرِیمٌ (ج) کِرامٌ شریف۔

ترکیب: إنّ حرف مشبہ بہ فعل، "امرأ" موصوف، دامت فعل، "مواثیق عهده" مضاف با مضاف الیہ فاعل، "علی" حرف جار "مثل هٰذا" مرکب اضافی مجرور شدہ متعلق بہ دامت، فعل با فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ صفت، موصوف با صفت اسم إنّ، "إنّه لکریم" إنّ ثانی اپنے اسم و خبر سے مل کر خبرِ إنّ اول۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "إنّه" ہے، لفظ "إنّ" شعر کے شروع میں بھی آیا ہے مگر درمیان میں کلام طویل ہو گیا اور کافی فصل ہو گیا اس لیے "إنّ" کو دوبارہ لائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامع کے ذہن سے نکل گیا ہو جس کی وجہ سے اس کی نظر میں کلام غیر مربوط لگ رہا ہو۔

۶ چھٹا مقصد عفو و درگذر کرنے میں زیادہ رغبت دلانا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "إنّ من أزواجکم و أولادکم عدوّا لکم فاحذروهم، وإن تعفوا وتصفحوا وتغفروا فإنّ الله غفورٌ رَّحیمٌ" تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے دشمن ہیں، سو تم ان سے ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کر دو اور درگذر کر جاؤ

اور بخش دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

آیت کریمہ میں "تعفوا، تصفحوا، تغفروا" یہ سب ہم معنی افعال ہیں، ان کو مکرر لایا گیا ہے، مقصد اس سے معافی میں زیادہ رغبت دلانا اور اس حکم کو بجالانے پر مکلّف لوگوں کو آمادہ کرنا ہے۔

ے ساتواں مقصد انذار (ڈرانے اور دھمکی دینے) کی تاکید ہے، جیسے "كلّا سوفَ تعلمُونَ ثُمّ كلّا سوفَ تعلمُونَ" ہرگز نہیں تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا، پھر ہرگز نہیں تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔

آیت کریمہ میں "كلاسوف تعلمون" کو مکرر لایا گیا ہے، اور اس تکریر کا مقصد انذار کی تاکید ہے، اور یہ اس طریقے سے کہ "كلّا" حرف ردع ہے، جس سے مقصد دنیا میں جی لگانے سے باز رکھنا ہے اور امور دنیوی میں مشغول ہونے کی غلطی پر تنبیہ کرنا ہے اور "سوف تعلمون" سے ایسا نہ کرنے پر ڈرایا گیا ہے کہ اگر دنیا کو چھوڑ کر آخرت کی تیاری نہیں کرو گے تو نتیجہ بھیانک ہوگا۔

۸ الاعتراض اطناب کا آٹھواں طریقہ اعتراض ہے یعنی ایک جملے کے اجزاء یا ایسے دو جملوں کے درمیان کسی لفظ کا لانا جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور یہ جملہ معترضہ لانا کسی مقصد کے تحت ہو، جیسے

إنّ الثمانين — وبُلّغتها — قد أحوجت سمعي إلى ترجمان

لغات: ترجُمان وتُرجُمانٌ (ج) تَراجِمُ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے والا، أحوَجَ إحواجًا ضرورت مند بنانا۔

ترکیب: إنّ حرف مشبہ بہ فعل "الثمانين" اسم إنّ، قد أحوجت فعل بافاعل "سمعي" مفعول بہ إلى حرف جار ترجمان مجرور شدہ متعلق بہ "أحوجت"، فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر إنّ، بُلّغت فعل بافاعل ها مفعول، فعل بافاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ جملہ معترضہ۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "و بُلّغتها" ہے جو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں لایا گیا ہے اور مقصد مخاطب کو دعا دینا ہے، اور جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا قول "ویجعلون للّٰه البنات سبحانه ولهم مایشتهون" اور وہ (کفار) اللہ تعالیٰ کے لیے لڑکیاں ٹھہراتے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزوں سے پاک ہے اور اپنے لیے جو چاہتے ٹھہراتے ہیں۔

آیت کریمہ میں "سبحانه" جملۂ معترضہ ہے، جو "یجعلون للّٰه البنات" اور "ولهم مایشتهون" کے درمیان لایا گیا ہے، اور دونوں جملے معنیً مربوط ہیں۔

۹۔ اطناب کی نویں قسم ایغال ہے، یعنی کلام کو ایسے لفظ سے ختم کرنا جو کسی ایسے نکتے کا فائدہ دے جس کے بغیر بھی اصل مقصود پورا ہو جائے، جیسا کہ مبالغہ حضرت خنساءؓ کے شعر میں ۔

وإنّ صخرًا لتأتم الهداة به کأنّه علمٌ في رأسه نارٌ

لغات: "صخرٌ" ایک شخص کا نام ہے، ائتمّ یأتمُّ ائتمامًا (افتعال) اقتداء کرنا، علَمٌ (ج) أعلامٌ اونچا پہاڑ۔

ترکیب: واو مستانفہ "إنّ" حرف مشبہ بفعل، صخرًا اسم لام برائے تاکید، تأتمّ فعل، الهداة فاعل، به متعلق بہ تأتم فعل با فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر إنّ، کأنّ، حرف مشبہ بفعل ہُ اسم، علمٌ موصوف، في جارہ "راسه" مجرور متعلق بہ "ثابتٌ" شدہ خبر مقدم، نارٌ مبتدا مؤخر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ شدہ صفت، موصوف با صفت خبر کأنّ۔

شعر مذکور میں "في رأسه نارٌ" مبالغے کے لیے لایا گیا ہے، حالاں کہ اس کے بغیر بھی اصل مقصود حاصل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ "في رأسه نارٌ" کے ذریعے امتیاز اور بلندی کو بیان کرنا ہے جو "علم" کے معنی سے خود حاصل ہو رہا ہے، کیوں کہ پہاڑ میں بلندی ہوتی ہی ہے اور جو چیز بلند ہو وہ دوسری اشیاء سے ممتاز ہو جاتی

ہے، مطلب یہ ہے کہ صخر ایسا شخص ہے جس کی اقتداء رہنمایان قوم کیا کرتے ہیں، اس کی مثال اونچے پہاڑ کی سی ہے کہ جس طریقے سے پہاڑ کی بلندی دور سے ظاہر ہوتی ہے، ایسے ہی صخر کی رفعت شان اور علومرتبت صاف محسوس ہوتی ہے۔

وَمِنْهَا: التَّذْيِيلُ وهُوَ تعْقِيبُ الجُملَةِ بِأُخرىٰ تَشْتَمِلُ علىٰ مَعْنَاهَا تَأكِيدًا لهَا ، وهُوَ إمَّا أَنْ يكُونَ جَارِيًا مَجْرى المَثَلِ لِاسْتِقْلالِ مَعْنَاهُ واسْتِغْنَائِهِ عمَّا قَبْلَهُ كَقولِهِ تعالىٰ "جَاءَ الحَقُّ وَزَهَقَ البَاطِلُ إِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" وإمَّا أَنْ يكُونَ غيرَ جارٍ مَجْرى المَثَلِ لِعَدَمِ استِغْنَائِهِ عمَّا قَبْلَهُ كقَولِهِ تعالىٰ "ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وهَلْ نُجَازِيْ إلَّا الكَفُوْرَ".

وَمِنْهَا: الاحْتِراسُ وَهُوَ أَنْ يُؤتىٰ فِيْ كَلامٍ يُوهِمُ خِلافَ المَقْصُودِ بِمَا يدْفَعُهُ نحوُ ؎

فَسَقىٰ دِيَارَكَ غيرَ مُفْسِدِهَا صَوبُ الرَّبِيعِ ودِيمَةٌ تهْمِيْ

وَمِنْهَا: التَّكْمِيلُ وهُوَ أَنْ يُؤتىٰ بِفَضْلَةٍ تزِيدُ المَعْنىٰ حُسْنًا نحوُ "وَيُطْعِمُونَ الطَّعامَ علىٰ حُبِّهٖ" وذٰلِكَ أَبْلَغُ في الكَرمِ.

ترجمہ: اور ان ہی میں سے تذییل ہے اور وہ ایک جملے کے بعد دوسرے جملے کا لانا ہے، جو پہلے جملے کے معنی پر مشتمل ہو اس کی تاکید کے لیے اور یہ یا تو محاورے کے قائم مقام ہوگا اس کے معنی کے مستقل ہونے کی وجہ سے اور اپنے ماقبل سے مستغنی ہونے کی وجہ سے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "جاءَ الحقُّ وزَهَقَ البَاطِلُ ، إنَّ البَاطِلَ كانَ زَهُوقًا" حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔ اور یا تو مثل کے قائم مقام نہیں ہوگا، اس کے ماقبل سے مستغنی نہ ہونے کی وجہ سے، جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان "ذٰلكَ جزيناهم بما كفروا وهل نجازى إلَّا الكفور" ان کو یہ سزا ہم نے ان کی ناسپاسی کی وجہ سے دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں۔

اور ان ہی میں احتراس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کلام میں جس میں خلاف مقصود کا وہم ہوتا ہو ایسی چیز لائی جائے جو اس کو دفع کر دے، جیسے "فسقٰی دیارك غیر مفسدھا الخ"

موسم بہار کی بارش اور موسلا دھار مینہ تمہاری بستیوں کو سرسبز و شاداب کرے، دراں حالے کہ وہ بستی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچائے۔

اور ان ہی میں سے تکمیل ہے اور وہ یہ ہے کہ (کلام میں) زائد لفظ لایا جائے جو معنی کے حسن میں اضافہ کرے، جیسے "ویطعمون الطّعام علٰی حبه" اور وہ لوگ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت کے باوجود یعنی کھانے کی چاہت کے باوجود، اور یہ سخاوت کے سلسلے میں زیادہ بلیغ ہے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں حضرات مصنفینؒ نے اطناب کے بقیہ صورتوں کی وضاحت فرمائی ہے۔

۱۰ تذییل یعنی ایک جملے کے بعد دوسرا جملہ بغرض تاکید لایا جائے جو پہلے جملے کے معنی میں ہو۔

وھو إمّا أن یکون: یہاں سے مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ تذییل کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ دوسرا جملہ ضرب المثل کے قائم مقام ہو اور اس کا معنی مستقل ہو، یعنی پہلے والے جملے سے بالکل مستغنی ہو، جیسے جاءَ الحقُّ وزھق الباطل ، إنَّ الباطل کان زھوقًا یہاں سے دوسرا جملہ "إنَّ الباطل کان زھوقًا" پہلے جملے (زھق الباطل) کے ہم معنی ہے اور اس کی تاکید ہے اور ضرب المثل کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے۔

یہاں تو اگرچہ کفر و بت پرستی کے خاتمے کی خوش خبری کے لیے ہے مگر الفاظ میں عموم ہونے کی وجہ سے یہ کفر و بت پرستی ہی کے خاتمے تک محدود نہیں بل کہ باطل کے تمام انواع و اقسام کو عام ہے کہ باطل کے لیے بقا نہیں ہے، کبھی نہ کبھی وہ

مٹ ہی جائے گا۔

اردو میں جیسے ؎

واجب ہے ادائے حق مہماں
احساں کی جزا نہیں جز احساں

دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی تاکید ہے اور قائم مقام ضرب المثل ہے، چناں چہ لوگ کہتے ہیں جو تمہارے ساتھ احسان کرے تم بھی اس کے ساتھ احسان کرو۔

دوسرے یہ کہ دوسرا جملہ ضرب المثل کے قائم مقام نہ ہو، جیسے "ذلك جزيناهم بما كفروا ، وهل نجازي إلاَّ الكفور" ہم نے ان کو ان کے کفر کا بدلہ دیا اور اِس قسم کا خاص بدلہ ایسے لوگوں کو دیا کرتے ہیں جو کافر ہیں۔

یہاں دوسرا جملہ "هل نجازي إلاَّ الكفور" پہلے جملے کی تاکید تو ہے، لیکن ضرب المثل کے قائم مقام نہیں ہے، اس لیے کہ اس جملے کا سمجھنا پہلے والے جملے پر موقوف ہے کیوں کہ "هل نجازي إلا الكفور" میں مذکور جزاء سے وہ جزائے مخصوص مراد ہے جو قوم سبا کو پانی کا بند توڑ کر سیلاب کے ذریعے ان کے باغات کو تباہ و برباد کر کے دی گئی، جس کی تفصیل آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے، مطلق جزا مراد نہیں، اگر مطلق جزا مراد ہوتی تو پھر یہ آیت جاری مجری المثل کی مثال ہوتی۔

(۱۱) اطناب کی گیارہویں قسم احتراس ہے یعنی کسی ایسے کلام میں جس سے مقصود کے خلاف کا وہم ہو ایسا لفظ لانا جو اس وہم کو دور کر دے، جیسے: ؎

فسقٰى ديارك غير مفسدها
صوب الربيع و ديمة تهمي

لغات: سقٰى يسقِي سقيًا سیراب کرنا (ض) صابَ المطرُ يصُوبُ صوبًا بارش ہونا، دِيمَةٌ (ج) دِيَمٌ لگاتار بارش، همى الماء يهمي،

همیًا (ض) پانی جاری ہونا۔

ترکیب: فاتفسیریہ ''سقٰی'' فعل ''دیارَك'' مرکب اضافی ذوالحال ''غیر مفسدھا'' حال، ذوالحال باحال مفعول، ''صوب الربیع'' مرکب اضافی معطوف علیہ، واوحرف عطف، ''دیمة تهمي'' مرکب توصیفی شدہ معطوف، معطوف علیہ بامعطوف فاعل، فعل بافاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

شعر مذکور میں ''غیر مفسدھا'' کے لفظ نے اس وہم کو دور کردیا جو کلام کے پہلے حصے میں پایا جاتا تھا، یعنی یہ کہ جب اس قدر زوردار بارش ہوگی تو ساری بستیاں غرق ہوکر تباہ ہوجائیں گی، تو یہ بددعا کے قبیل سے ہوجاتا، مگر اس وہم کو ''غیر مفسدھا'' سے بایں طور دور کردیا کہ بارش ایسی ہو جس سے بستیوں کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

(۱۲) اطناب کی بارہویں اور آخری قسم تکمیل ہے یعنی ایسے کلام میں جس میں خلاف مقصود کا وہم نہ ہو کوئی لفظ کسی نکتے مثلاً مبالغہ کی وجہ سے بڑھادینا، جیسے ''ویطعمون الطعام علی حبّه'' اس آیت میں ''علی حبّه'' زائد ہے اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ باوجود طعام کی چاہت کے مسکین، یتیم، قیدی کو کھلانا زیادہ سخاوت اور ایثار معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت میں ''حبـه'' کی ضمیر کا مرجع ''اللّٰه'' کی جانب بھی لوٹانا درست ہے مگر اس صورت میں مبالغہ وغیرہ کسی نکتے کی وجہ سے معنی کے حسن میں اضافہ نہ ہوگا، اس لیے کہ جس اطعام میں حب الٰہی نہ ہو وہ قابل مدح ہی نہ ہوگا۔

الخَاتِمَةُ

فِيْ إِخْرَاجِ الكلامِ علٰى خِلَافِ مُقْتَضى الظَّاهِرِ

إِيْرادُ الكَلامِ علٰى حَسَبِ مَاتقدَّمَ مِنَ القَوَاعِدِ يُسَمّٰى إِخْرَاجَ الكَلامِ

علىٰ مُقْتَضَى الظَّاهِرِ ، وقَدْ تَقْتَضِي الأحوَالُ العُدُوْلَ عَن مُقتَضى الظَّاهِرِ ويُورَدُ الكلامُ علىٰ خِلاَفِهِ في أنوع مخصُوصةٍ .

١ ـ مِنهَا : تَنْزِيلُ العَالِمِ بِفَائِدَةِ الخَبَرِ أوْ لاَزِمِهَا مَنْزِلَةَ الجَاهِلِ بهما لَعَدَمِ جَرْيِهِ علىٰ مُوجَبِ عِلْمِهِ فيُلقىٰ إلَيهِ الخبَرُ كمَا يُلْقىٰ إلىٰ الجَاهِلِ ، كقَولِكَ لِمَنْ يُوذِيْ أباهُ "هٰذَا أبُوكَ"

٢ ـ وَمِنهَا : تَنزِيلُ غيرِ المُنْكِرِ منزِلةَ المُنكِرِ إذَا لاحَ عليهِ شيٌ مِنْ علاماتِ الإنكارِ فيُؤكّدُ لهٗ نحوُ ؎

جَاءَ شَقِيقٌ عارِضًا رُمْحَهٗ ‏ إنَّ بَنِي عمِّكَ فيهِمْ رِماحُ

وكقَولكَ للسَّائِلِ المُسْتَبعِدِ حُصُولَ الفرَجِ "إنَّ الفرجَ لقَرِيبٌ"

٣ ـ ومنها : تنزِيلُ المُنكرِ أو الشَّاكِّ منْزِلةَ الخَالِيْ إذَا كَانَ معَهٗ مِنَ الشَّوَاهِدِ مَا إذا تأمَّلهٗ زالَ إنكارُهٗ أو شكُّهٗ ، كقَولِكَ لِمَنْ يُنْكِرُ منفَعَةَ الطِّبِّ أو يشُكُّ فِيها "الطِّبُّ نافعٌ"

خاتمہ

کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف لانے کے سلسلے میں

کلام کو سابقہ قواعد کے مطابق لانے کو اخراج الکلام علیٰ مقتضی الظاہر کہتے ہیں، اور کبھی احوال مقتضائے ظاہر سے صرفِ نظر کا تقاضہ کرتے ہیں اور کلام کو مقتضائے ظاہر کے خلاف لایا جاتا ہے مخصوص قسموں میں۔

ان ہی مخصوص قسموں میں سے فائدۂ خبر یا لازم فائدہ خبر کے جاننے والے کو اس شخص کے درجے میں اتار لینا ہے جو اس کو (فائدہ خبر یا لازم فائدہ خبر کو) نہ جانتا ہو اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے، چناں چہ اس کے سامنے خبر ایسے ہی پیش کی جائے گی جیسا کہ نہ جاننے والے کے سامنے پیش کی جاتی ہے، جیسا کہ

تمہارا کہنا اس شخص سے جو اپنے باپ کو تکلیف دیتا ہو "هذا أبوك" یہ تمہارے باپ ہیں۔

اور ان ہی قسموں میں سے غیر منکر کو منکر کے درجے میں اتار لینا ہے جب اس کے سامنے انکار کی کوئی علامت ظاہر ہو، لہٰذا اس کے لیے کلام کو موکد لایا جائے گا، جیسے جاءَ شقيق ۔

شقیق آیا اس حال میں کہ وہ اپنے نیزے کو عرض میں رکھے ہوئے تھا (تو میں نے کہا) تحقیق کہ تمہارے چچازاد بھائیوں کے پاس بھی نیزے ہیں۔

اور جیسا کہ تمہارا کہنا اس سوال کرنے والے سے جو کشادگی کے حصول کو محال سمجھتا ہو "إن الفرج لقريب" بلاشبہ کشادگی بہت قریب ہے۔

اور انہیں انواع میں سے انکار کرنے والے یا شک کرنے والے کو خالی الذہن کے درجے میں اتار لینا جب کہ اس کے پاس ایسے دلائل ہوں کہ جب وہ ان دلائل میں غور کرے تو اس کا انکار یا شک زائل ہو جائے، جیسا کہ تمہارا کہنا اس شخص سے جو کہ علم طب کے فوائد کا انکار کرے یا اس میں شک کرے "الطب نافع" علم طب سودمند ہے۔

تشریح: ماقبل میں حضرات مصنفینؒ نے یہ بیان کیا تھا کہ ہم علم معانی کو آٹھ ابواب اور ایک خاتمے میں بیان کریں گے، آٹھوں ابواب سے فارغ ہونے کے بعد اب خاتمے میں علم معانی سے متعلق کچھ مزید باتیں بیان کررہے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ اگر گفتگو قواعد مذکورہ کے مطابق کی جائے تو اس کا نام "إخراج الكلام على مقتضى الظاهر" ہے یعنی کلام کو مقتضائے ظاہر کے مطابق بیان لانا، مگر کبھی کبھی احوال اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لایا جائے، چناں چہ مخصوص اوقات میں ایسے ہی کیا جاتا ہے، جن کو مصنفینؒ تفصیل سے بیان فرمارہے ہیں۔

منها تنزيل العالم: فرماتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت یہ ہے کہ جو شخص فائدۂ خبر یا لازم فائدہ خبر کو جانتا ہو، پھر بھی اپنے علم کے مطابق اس پر عمل نہ کرے تو اسے جاہل کے درجے میں اتار کر اس سے ایسے ہی کلام کیا جائے، جیسے کسی جاہل سے کلام کیا جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص اپنے والد کو تکلیف دے رہا ہو تو اس سے کہا جائے "هذا أبوك" یہ تمہارے باپ ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ خبر دینا مقصود نہیں ہے، اس لیے کہ وہ تو یہ جانتا ہی ہے کہ یہ میرے باپ ہیں؛ بل کہ مقصد عار دلانا ہے اور اس کی اس کمینگی پر اسے روکنا ہے کہ کیوں اپنے باپ کو تکلیف پہنچا رہے ہو؟ کہیں بیٹا بھی اپنے باپ کو تکلیف پہنچاتا ہے، یعنی تمہیں اس گندی حرکت سے باز آجانا چاہیے۔

ومنها تنزيل غير المنكر الخ: دوسری صورت مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی یہ ہے کہ غیر منکر کو منکر کے درجے میں اتار لیا جائے اس وقت جب کہ ایسے علامات ظاہر ہوں جن سے یہ گمان ہو کہ مخاطب خبر کا منکر ہے، حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہ ہو، ایسے شخص کے لیے کلام میں تاکید لائیں گے وجوبی طور پر، جیسے کہ کسی منکر کے لیے تاکید لائی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ غیر منکر میں دو قسم کے افراد آتے ہیں (۱) خالی الذہن (۲) متردد فی الحکم، قسم اول کی مثال، جیسے حجل بن نضلہ کا یہ شعر ؎

جاء شقيق عارضًا رُمحه   إنّ بني عمّك فيهم رماح

لغات: عَرَضَ العُودَ يعرِضُ عرضًا (ض) لکڑی کا چوڑائی میں رکھنا، رُمحٌ (ج) رِماحٌ نیزہ۔

ترکیب: جاء فعل، شقيقٌ ذو الحال، عارضًا صیغۂ صفت، ضمیر مستتر فاعل، رمحه مرکب اضافی ہو کر مفعول، صیغۂ صفت با فاعل ومفعول حال، ذو الحال با حال فاعل، فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ، إنّ حرف مشبہ بہ فعل، بني عمك مرکب

اضافی اس کا اسم، فیھم خبر مقدم، رماحُ مبتدا موخر، مبتدا با خبر جملہ خبر یہ شدہ خبر إنَّ

شعر مذکور میں محل استشہاد "إنَّ بني عمك الخ" ہے بایں طور کہ شقیق کی ایک قبیلے سے عداوت چل رہی تھی ایک مرتبہ شقیق اپنے دشمنوں کی جانب اس حال میں آرہا تھا کہ اس کا نیزہ دشمنوں کی جانب نہیں تھا بل کہ مقابل سمت میں کیے ہوئے تھا، جب کہ اسے معلوم تھا کہ اس کے دشمن مسلح ہیں مگر بے فکری کے ساتھ اس طریقے سے رانوں پر ٹیڑھا نیزہ رکھ کر آنا گویا اس بات کا انکار ہے کہ اس کے دشمنوں کے پاس ہتھیار ہیں، اس علامت کو منکر کے درجے میں قرار دیا گیا اور مخاطب نے تاکید کے ساتھ کلام کیا "إنَّ بني عمّك فيهم رماح" بلاشبہ تمہارے چچازاد بھائیوں کے پاس بھی نیزے ہیں۔ جب کہ ظاہر کا تقاضہ یہ تھا کہ شاعر صرف "في بني عمك رماحٌ" کہتا، یہی تاکید کے ساتھ کلام لانا گویا منکر کے درجے میں اتارنا ہے۔

اور متردد فی الحکم کی مثال، جیسے ایک شخص کسی مصیبت میں گرفتار اپنے سلسلے میں مایوس ہو کہ معلوم نہیں اسے اس مبتلا بہ مصیبت سے نجات ملے گی یا نہیں؟ یہ شخص بہ ظاہر متردد ہے مگر اس کے چہرے سے یہ علامت ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ نجات کا منکر ہے، اور آپ سے اس سلسلے میں سوال کرے تو آپ جواباً کہیں "إنَّ الفرج لقريب" بلاشبہ کشادگی قریب ہے، مثال مذکور میں "إنَّ" اور "لام" دو حروف تاکید ہیں۔

ومنها تنزيل المنكر: تیسری صورت مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی یہ ہے کہ خبر کا انکار کرنے والے یا شک کرنے والے شخص کو خالی الذہن کے درجے میں اتار لیا جائے، یہ اس وقت ہے جب کہ منکر یا شک کرنے والے کے پاس ایسے دلائل اور شواہد ہوں کہ جب وہ ان میں غور وفکر کرے، تو اس کا انکار یا شک جاتا رہے، جیسا کہ کوئی شخص علم طب کی منفعت کا منکر ہے، یا اس میں شک

کرنے والا ہے، اس سے کہا جائے ''الطب نافع'' علم طب نفع بخش ہے۔

مثال مذکور میں ''الطبّ نافع'' بغیر کسی تاکید کے کہا گیا ہے جب کہ مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ تاکید کے ساتھ ''إنَّ الطب نافع'' کہا جاتا، مگر ایسا نہیں کہا اس لیے کہ یہاں منکر اور شک کرنے والے شخص کو خالی الذہن کے درجے میں اتار لیا گیا ہے، اور ضابطہ یہ ہے کہ خالی الذہن کے سامنے بغیر تاکید کے کلام لایا جاتا ہے۔

٤۔ ومنهَا وضْعُ المَاضِيْ مَوضِعَ المُضَارِعِ لِغرَضٍ ، كالتَّنبِيهِ علىٰ تَحقُّقِ الحُصُولِ نحو ''أتىٰ أمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَستَعْجِلُوْهُ'' أوِ التَّفاؤلِ نحوُ ''إنْ شَفَاكَ اللّٰهُ اليومَ تَذْهَبْ مَعِيْ غدًا'' ؛ وعَكْسُهُ أيْ وضْعُ المُضَارِعِ موضِعَ المَاضِيْ لِغَرَضٍ كَاسْتِحْضَارِ الصُّورَةِ الغَرِيبَةِ فِيْ الخَيَالِ كَقَوْلِهٖ تعالىٰ ''وَاللّٰهُ الَّذِيْ أرسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا'' أيْ فأثَارَتْ ، وإفَادَةِ الاستِمرَارِ فِيْ الأوْقَاتِ المَاضِيَةِ نحوُ ''لو يُطِيْعُكُمْ فِيْ كثِيرٍ مِنَ الأمرِ لَعَنِتُّمْ'' أيْ لَوْ اسْتَمَرَّ علىٰ اِطَاعَتِكُمْ .

ترجمہ: اور ان ہی قسموں میں سے ماضی کو مضارع کی جگہ استعمال کرنا ہے کسی غرض کے لیے جیسے کہ کسی چیز کے حصول کے یقینی ہونے پر تنبیہ کرنا، مثلاً ''أتىٰ أمر اللّٰه فلا تستعجلوه'' اللہ تعالیٰ کا حکم آ چکا پس تم لوگ اس کے جلد آنے کے خواستگار نہ ہو۔ یا فال نیک کے لیے، جیسے ''إن شفاك اللّٰه اليومَ تذهب معي غدًا'' اگر اللہ تعالیٰ نے آج تجھے شفا بخش دی تو کل میرے ساتھ چلنا۔ اور اس کے برعکس یعنی مضارع کو ماضی کی جگہ استعمال کرنا کسی غرض کے لیے، جیسے اس عجیب وغریب صورت کو ذہن میں مستحضر کرنا جو خیال میں ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ''وهو الّذى أرسل الرِّياح فتثير سحابًا'' وہی خدا تو ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا پھر وہ ہوائیں بادل کو ادھر ادھر اڑا لے جاتی ہیں، یعنی ان ہواؤں نے

اڑایا، اور گذشتہ زمانوں میں استمرار کا فائدہ دینے کے لیے، جیسے "لو يطيعكم في كثيرٍ من الأمر لعنتّم" اگر رسول تمہاری بہت سی باتیں مان لیا کریں تو تم لوگ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ یعنی اگر وہ تمہاری باتیں برابر مانتے رہے۔

تشریح: عبارت بالا میں بھی حضرات مصنفینؒ نے انہیں مخصوص مواقع کی وضاحت کی ہے جہاں مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لایا جاتا ہے، چناں چہ فرمایا:

ومنها وضع الماضي: چوتھی جگہ یہ ہے کہ کسی مقصد کے تحت فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی کو استعمال کیا جائے، اور مقاصد مختلف قسم کے ہوتے ہیں مثلاً کبھی مقصد کسی چیز کے وقوع کے یقینی ہونے پر تنبیہ کرنا ہوتا ہے تو اس کے لیے فعل ماضی کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے کہ فعل ماضی کی دلالت ثبوت اور تیقن پر ہوتی ہے، جیسے "أتى أمر الله فلا تستعجلوه" اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا ہے پس تم اس کے جلد آنے کے خواستگار نہ ہو۔

آیت کریمہ میں مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ "يأتي" فعل مضارع لایا جاتا، اس لیے کہ ابھی "امر الله" کا وقوع نہیں ہوا ہے، مگر فعل ماضی سے تعبیر کیا، اس لیے کہ باری تعالیٰ کے قول کا وقوع ایسے ہی یقینی ہے جیسے کہ ماضی میں وہ چیز ہو چکی ہو۔

اور کبھی فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی استعمال کرتے ہیں فال نیک کے لیے، جیسے "إن شفاك الله اليوم تذهب معي غدًا" اگر اللہ تعالیٰ آج تمہیں شفا دیدے تو کل تم میرے ساتھ چلنا۔ مثال مذکور میں "شفى" فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے، جب کہ مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ "إن يشفك" کہا جاتا، اس لیے کہ اِن شرطیہ کے بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ "اِن" استقبال کے لیے آتا ہے اس لیے شرط و جزا دونوں فعل مضارع ہوں گے، مگر فعل ماضی استعمال کیا گیا تفاؤل کے لیے یعنی جو مراد ہے اور جس کے لیے ہم نے دعا کی ہے، وہی واقع ہوگی، اور گویا وہ ہو چکی۔

وعكسهٗ أي وضع المضارع الخ: فرماتے ہیں کہ جس طریقے سے فعل مضارع کی جگہ فعل ماضی کو استعمال کیا جاتا ہے ایسے ہی کبھی کبھی فعل ماضی کی جگہ فعل مضارع کا استعمال کرتے ہیں کسی مقصد کے تحت، مثلاً کسی عجیب وغریب منظر کی تصویر کشی مقصود ہو، جیسے باری تعالیٰ کے فرمان "**وهو الّذي أرسل الرياح فتثير سحابًا**" میں۔ وہی خدا تو ہے، جس نے ہواؤں کو بھیجا، پھر وہ ہوائیں بادل کو ادھر ادھر اڑا لے جاتی ہیں، یہاں بجائے "**فتثير**" کے "**فأثارت**" ہونا چاہئے تھا، مگر فعل مضارع کو استعمال کیا خیال میں عجیب وغریب صورت کو مستحضر کرنے کے لیے کہ اللہ رب العزت ہی وہ قادر مطلق ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ادھر ادھر لے جاتی ہیں، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ جس طرح چاہتا ہے انہیں فضائے آسمانی میں پھیلا دیتا ہے اور کبھی انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم مینہ کو اس بادل کے اندر سے نکلتا دیکھتے ہو، اللہ رب العزت نے اس میں صورت عجیبہ مذکورہ کو بجائے فعل ماضی کے مضارع سے تعبیر کیا جب کہ یہ چیز ہو چکی ہے، تاکہ مخاطب کو تنبیہ ہو جائے کہ یہ واقعہ ابھی ہو رہا ہے اور آپ کے لیے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ ممکن ہے، اس لیے کہ فعل مضارع ہی حال پر دلالت کرتا ہے اور زمانہ گذشتہ کے واقعے کو مستحضر کرنے کے لیے حال سے تعبیر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے لیے فعل مضارع ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے، اگر مقتضائے ظاہر کے مطابق "**فأثارت**" بصیغۂ ماضی تعبیر کیا جاتا تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

اسی طریقے سے کبھی فعل ماضی کی جگہ فعل مضارع اس لیے استعمال کرتے ہیں، تاکہ فعل مضارع گذشتہ زمانوں میں استمرار کا فائدہ دے، جیسے "**لو يطيعكم في كثير من الأمر لعنتّم**" بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے۔

آیت کریمہ میں "**لويطيعكم**" **لو استمرّ على إطاعتكم**" کے معنی

میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امور کثیرہ میں لوگوں کی اطاعت نہ کرنا زمانۂ ماضی میں کوئی ایک دو مرتبہ کا واقعہ نہیں بل کہ بارہا ہوتا آیا ہے، یہاں بھی اگر مقتضائے ظاہر کے مطابق ''أطاعکم'' کہا جاتا جیسا کہ ''لو'' کا ضابطہ ہے کہ اس کا دخول فعل ماضی پر ہوتا ہے، تو زمانہ ماضی میں استمرار فعل کا فائدہ حاصل نہ ہوتا۔

د۔ ومِنهَا وَضعُ الخَبَرِ مَوْضِعَ الإنْشَاءِ لِغَرَضٍ كَالتَّفاؤلِ ، نحوُ ''هَدَاكَ اللّٰهُ لِصَالِحِ الأعمَالِ'' وإظهَارِ الرَّغبَةِ نحوُ ''رزَقَنِيَ اللّٰهُ لِقَاءَ كَ'' والاحتِرَازِ عنْ صورَةِ الأمرِ تأدُّبًا كَقَولِكَ ''يَنْظُرُ مولاَيَ فِيْ أمْرِيْ'' وعكسُهُ أيْ وضعُ الإنشاءِ مَوضِعَ الخَبَرِ لِغَرَضٍ كَإظْهَارِ العِنَايَةِ بِالشَّيْئِ نحوُ ''قُلْ اَمَرَ رَبِّي بِالقِسطِ واَقِيْمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ'' لَمْ يَقُلْ وإقَامَةِ وُجُوهِكُمْ عِنَايَةً بأمرِ الصَّلٰوةِ ، والتَّحَاشِيْ عن مُوَازَاةِ اللّاحِقِ بِالسَّابِقِ نحوُ ''قَالَ إنِّيْ اُشْهِدُ اللّٰهَ واشهَدُوْا انِّيْ برِئٌ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ'' لَمْ يَقُلْ ''واُشْهِدُكُمْ'' تَحَاشِيًا عِنْ مُوَازَاةِ شَهَادَتِهِمْ بِشَهَادَةِ اللّٰهِ والتَّسْوِيَةِ نحو ''أنفِقُوْا طوعًا أو كرهًا لن يُتقبَّلَ مِنكُمْ''

ترجمہ: اور ان ہی مخصوص قسموں میں سے خبر کو انشا کی جگہ استعمال کرنا ہے کسی مقصد کے لیے، جیسے نیک فال مراد لینا مثلاً ''هداك الله لصالح الأعمال'' خدا تمھیں نیک اعمال کی توفیق بخشے، اظہار رغبت کے لیے، جیسے ''رزقني الله لقاءك'' اللہ تعالیٰ مجھے تیری ملاقات نصیب کرے، اور ادب کا لحاظ کرتے ہوئے صورتاً صیغۂ امر سے بچنا، جیسے ''ینظر مولاي في أمري'' میرے آقا میرے بارے میں غور فرمائیں گے، اور اس کے برعکس یعنی خبر کی جگہ انشا کا استعمال کرنا کسی مقصد کے لیے، مثلاً کسی چیز کی اہمیت ظاہر کرنا، جیسے ''قل أمر ربي بالقسط وأقيموا وجوهكم عند كلّ مسجد'' آپ کہہ دیجئے

میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کرنے کا، اور یہ کہ ہر نماز کے وقت تم اپنا رخ سیدھا رکھو "إقامة وجوهكم" نہیں کہا نماز کے حکم کے اہتمام کے لیے، اور جیسے لاحق وتابع کے سابق کے مقابل میں آنے سے بیزاری کے لیے، جیسے "قال إني اشهدو اللّٰهَ وأشهدوا أني بريئ ممّا تشركون" (حضرت ہود نے) فرمایا میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ "واشهدكم" نہیں کہا ان لوگوں کی شہادت کو اللہ کی شہادت کے مقابل کرنے سے بیزاری کے اظہار کے لیے، اور جیسے تسویہ، مثلاً "أنفقوا طوعًا أو كرهًا لن يتقبل منكم" آپ فرمادیجئے کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے کسی طرح قبول نہیں۔

تشریح: ومنها وضع الخبر حضرات مصنفین فرماتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ جملہ خبریہ کی جگہ جملہ انشائیہ استعمال کیا جائے کسی مقصد کی خاطر، جیسے فال نیک کے لیے، مثلاً "هداك اللّٰه لصالح الأعمال" خدا تمہیں نیک اعمال کی ہدایت دے، مثال مذکور "اللهم اهدك لصالح الأعمال" کے معنی میں ہے، مگر جملہ انشائیہ کے بجائے خبریہ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے کہ مقصد نیک فال لینا ہے، یعنی یہ کہ متکلم یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا تمہیں ہدایت دے دی۔

وإظهار الرَّغبة: اسی طریقے سے کبھی کبھی خواہش کے اظہار کے لیے جملہ انشائیہ کی جگہ جملہ خبریہ کا استعمال کرتے ہیں، جیسے "رزقني اللّٰه لقاءك" اللہ تعالیٰ مجھے تمہاری ملاقات نصیب کرے، یہاں مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ "يرزقني اللّٰه" کہا جاتا، مگر چوں کہ اظہار رغبت مقصود ہے، اور مستقبل میں یقین ہوتا نہیں ہے جب کہ مقصد یہ ہے کہ یقینی طور پر ملاقات ہو، اس لیے مقتضائے ظاہر کے خلاف فعل ماضی یعنی جملہ خبریہ استعمال کیا جو یقین پر دلالت کرتا ہے۔

والاحتراز عن صورة الأمر: فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ادب کالحاظ کرنے کے لیے صیغۂ امر کے استعمال سے بچنے کی غرض سے جملہ فعلیہ استعمال کرتے ہیں، اس لیے کہ صیغۂ امر سے حکم دینا مقصود ہوتا ہے، جو بڑے کے حق میں بے ادبی ہے، اگر چہ امر میں قرینے سے درخواست کرنے کا معنی بھی ہوتا ہے، مگر صورت چوں کہ امر ہی کی رہتی ہے اور مقصد امر کی صورت سے بھی احتراز کرنا ہے، اس لیے مقتضائے ظاہر کے خلاف جملہ فعلیہ استعمال کرتے ہیں، جیسے "**ینظر مولاي في أمري**" "**أنظر یا مولاي في أمري**" کی جگہ واقع ہے۔

وعکسه: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ جس طریقے سے خلاف مقتضائے ظاہر جملہ انشائیہ کی جگہ جملہ خبریہ کو استعمال کرتے ہیں، ایسے ہی کبھی کبھی اس کے برعکس بھی کرتے ہیں، یعنی جملہ خبریہ کی جگہ جملہ انشائیہ کو استعمال کرتے ہیں کسی مقصد کے تحت، مثلاً کسی چیز کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے، جیسے "**قُل أمر بالقسط وأقیموا وجوهکم عند کل مسجد**" آپ کہہ دیجئے میرے رب نے حکم دیا ہے انصاف کرنے کا اور یہ کہ ہر نماز کے وقت تم اپنا رخ سیدھا رکھو۔ مصنفینؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں کہ "**قل أمر ربّي بالقسط وإقامة وجوهکم**" نہیں کہا جب کہ اس صورت میں معطوف اور معطوف علیہ میں یکسانیت بھی ہورہی ہے، اس لیے کہ "**قسط**" اور "**إقامة**" دونوں مصدر ہیں؛ بل کہ جملہ انشائیہ استعمال کیا، اس لیے کہ مقصد لوگوں کو امر صلوٰۃ کی طرف توجہ دلانا ہے اور نماز کی تاکید کرنا ہے اور تاکید وحکم جملہ انشائیہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

والتحاشي: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی جملہ خبریہ کی جگہ جملہ انشائیہ کے لانے کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ بعد میں آنے والے کو پہلے کے برابر نہ قرار دیا جائے، (لاحق کو سابق کی برابری سے روک دیا جائے) جیسے "**قال إنّي أُشهد اللّٰه واشهدوا أنّي برئٌ ممّا تشرکون**" آیت کریمہ میں "**أُشهد اللّٰه**"

پہلے جملے کو تو خبریہ لایا گیا اور دوسرے جملے "واشهدوا" کو انشائیہ لایا گیا، تاکہ لوگوں کی شہادت باری تعالیٰ کی شہادت کے بالمقابل نہ ہونے پائے؛ اس لیے کہ اگر دوسرے جملے کو بھی خبریہ لایا جاتا اور "واُشهدُكم" کہا جاتا تو لوگوں کی شہادت اور باری تعالیٰ کی شہادت یکساں ہوجاتی اور مقصد اسی یکسانیت سے بچانا ہے کیوں کہ شہادت حق اور شہادت باطل میں کوئی یکسانیت نہیں، یہی مطلب ہے لاحق کے سابق کے مقابل میں آنے سے روکنے کا۔

والتّسوية: جن مقاصد کے لیے خبر کی جگہ انشا کا استعمال ہوتا ہے، ان میں سے ایک مقصد تسویہ یعنی دو چیزوں کے درمیان برابری ثابت کرنا ہے، جیسے "قل انفقوا طوعًا او كرهًا لن يتقبّل منكم" آپ فرمادیجئے خواہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے کسی طرح قبول نہیں۔

آیت مذکورہ میں "أنفقوا" جملہ خبریہ کی جگہ واقع ہے، مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ "أنفقتم" کہا جاتا، اس لیے کہ انفاق کا حکم دینا مقصود نہیں، لیکن چوں کہ مقصد یہ بتلانا ہے کہ صدقہ قبول نہ ہونے میں ان کی خوشی و ناخوشی دونوں حالتیں برابر ہیں اور اس طرح کے مواقع میں تسویہ کے لیے عموماً صیغۂ امر کا استعمال ہوتا ہے، اس لیے امر ہی لائے تو امر یہاں تسویہ کے لیے ہے اور "انفقتم" کی جگہ ہے۔

٦. ومِنهَا: الإضمَارُ في مقَامِ الإظْهارِ لِغرَضٍ كادِّعَاءِ أنَّ مَرجعَ الضَّمِيرِ دائمُ الحُضُورِ في الذِّهنِ كَقولِ الشَّاعِرِ:

اَبتِ الوِصَالَ مَخافَةَ الرُّقَباءِ
وأتَتْكَ تَحتَ مَدارِعِ الظَّلْماءِ

الفَاعِلُ ضَمِيرٌ لَمْ يَتقَدَّمْ لهُ مَرجعٌ فَمُقتَضَى الظَّاهِرِ الإظْهارُ، وتَمكِينِ مَا بعْدَ الضَّمِيرِ في نفسِ السَّامعِ تُشوِّقُهُ إليه أوّلًا نحوُ ع

"هِيَ النَّفسُ مَا حَمَّلتَها تَتحَمَّلُ"

وَ "هُوَ اللّٰهُ أحَدٌ" "نِعْمَ تِلْمِيذًا المؤدَّبُ"

وَعَكْسُهُ أي الإظْهارُ في مَقَامِ الإضْمَارِ لِغَرَضٍ كَتَقْوِيَةِ دَاعِي الامتثال كقولِكَ لِعَبْدِكَ "سَيِّدُكَ يأمُرُكَ بِكَذَا"

٧. وَمِنْهَا: الإلتِفاتُ وهُوَ نقْلُ الكَلامِ مِنْ حالَةِ التَّكلُّمِ أوِ الخِطَابِ أوِ الغَيبَةِ إلٰى حَالَةٍ أُخرىٰ مِنْ ذٰلِك فَالنَّقْلُ مِنَ التَّكلُّمِ إلَى الخِطَابِ نحوُ "وَمالِي لاأعبُدُ الَّذِىْ فَطَرَنِي وإلَيهِ تُرْجَعُونَ" أي أرْجِعُ، وَمِن التَّكلُّمِ إلَى الغيبَةِ نحوُ "إنَّا اَعْطَيْناكَ الكَوثَرَ فصَلِّ لِرَبِّكَ" ومِنَ الخِطابِ إلٰى التَّكلُّمِ كقولِ الشَّاعِرِ ؎

أتَطْلُبُ وَصْلَ رَبَّاتِ الجَمالِ
وَقَدْ سَقَطَ المَشِيْبُ علٰى قَذالِي

ترجمہ: اورانہیں میں سے اسم ظاہر کی جگہ ضمیر لانا ہے کسی مقصد کے لیے، جیسے کہ اس بات کا دعویٰ کرنا کہ ضمیر کا مرجع ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے جیسے کہ شاعر کا قول، أبت الوصال الخ ؎

وہ (محبوبہ) رقیبوں کے ڈر سے وصال سے باز رہی، حالاں کہ وہ تیرے پاس تاریکی کے پردوں کے آڑ میں آئی۔

شعر مذکور میں "أبت" اور "أتت" کا فاعل ضمیر ہے، جس کا مرجع پہلے مذکور نہیں ہے، تو مقتضائے ظاہر اسم ظاہر لانے کا تھا اور ضمیر کے مابعد کا سامع کے دل میں راسخ کرنے کے لیے کہ اولاً ہی مابعد کی طرف شوق دلادے، جیسے "هي النفس ماحمّلتها تتحمل" یہ نفس ہے جو اس پر بوجھ ڈالو گے وہ اٹھائے گا "هو الله احد" ــ وہ اللہ ایک ہے۔ "نعم تلميذ المؤدّب" ــ باادب طالب علم بہت اچھا ہے ــ اور اس کے برعکس یعنی اسم ظاہر لانا ضمیر کی جگہ میں کسی مقصد کے لیے جیسے کہ امتثال امر کے سبب کی تقویت کے لیے مثلاً تمہارا کہنا اپنے

غلام سے "سيدك يأمرك بكذا" تمہارا آقا تمہیں اس کام کا حکم دے رہا ہے۔

اور انہیں جگہوں میں التفات ہے اور وہ کلام کو حالت تکلم یا خطاب یا غیبت سے انہیں میں سے دوسرے حالت کی طرف منتقل کرنا ہے، پس تکلم سے خطاب کی طرف التفات، جیسے "وَمَالي لا أعبد الذي" اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں نہیں عبادت کرتا ہوں اس ذات کی جس نے مجھے پیدا کیا حالاں کہ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور تکلم سے غیبت کی طرف التفات، جیسے إنّا أعطيناك الكوثر 'ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا سو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھئے اور خطاب سے تکلم کی طرف نقل، جیسے شاعر کا شعر أتطلب وصل الخ ؎

اے نفس! کیا تو حسیناؤں سے وصال چاہتا ہے، حالاں کہ بڑھاپا میرے سر پر آ چکا ہے۔

تشریح: ومنها الإضمار فى مقام الإظهار الخ : جن مواقع میں مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لایا جاتا ہے انہیں میں ایک جگہ یہ ہے کہ اسم ظاہر کی جگہ ضمیر کا استعمال کیا جائے کسی مقصد کے تحت، مثلاً اس بات کا دعویٰ کرنے کے لیے کہ ضمیر کا مرجع متکلم کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے، خواہ اس کا ذکر کیا جائے، یا نہ کیا جائے ذہن اس مرجع خاص کے علاوہ دوسرے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے، جیسے شاعر کا شعر

اَبَتِ الوِصَالَ مَخافَةَ الرُّقَباءِ
وأتَتْكَ تَحتَ مَدارِعِ الظَّلْماء

لغات: أبٰى يأبٰى إباءً (ف) انکار کرنا، وصَلَ يصِلُ صِلةً وَوِصَالاً (ض) ملنا۔ رُقَبَاءُ (واحد) رقیبٌ نگراں۔ مدَارِعُ (واحد) مِدْرَعة کوٹ، جبہ، مراد پردہ ہے، ظَلْمَاء تاریکی۔

ترکیب: أبت فعل با فاعل الوصال مفعول بہ "مخافة الرقباء" مفعول

لہ، فعل بافاعل وبہ ہر دو مفعول جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف علیہ واو عاطفہ ''أتت'' فعل بافاعل، ''ك'' مفعول ''تحت'' مضاف ''مدارع الظلماء'' مرکب اضافی مضاف الیہ، مضاف بامضاف الیہ ظرف، فعل بافاعل ومفعول وظرف جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف، معطوف علیہ بامعطوف جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں ''أبت'' اور ''أتت'' دونوں کا فاعل ضمیر ہے جس کا مرجع ماقبل میں مذکور نہیں ہے، مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ اسم ظاہر لاکر کہا جاتا ''الحبیبة أبت الوصال'' اس لیے کہ ضمیر کا مرجع پہلے ہونا چاہئے، کیوں کہ نحو کا ضابطہ ہے کہ اضمار قبل الذکر جائز نہیں، مگر چوں کہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ ضمیر کا مرجع ایسا ہے جو ہر ایک کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہتا ہے، اس لیے اسم ظاہر کی جگہ ضمیر کا استعمال کیا گیا۔

وتمکین مابعد الضمیر: اسم ظاہر کی جگہ ضمیر استعمال کرنے کا ایک مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ ضمیر کے بعد والے اسم کو سامع کے ذہن میں راسخ کردیا جائے، اس لیے کہ جب ابتدا ہی میں اسم ظاہر کی جگہ ضمیر لائیں گے تو سامع کے ذہن میں اس کے مرجع کا شوق پیدا ہوگا اور شوق کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ نفس میں راسخ ہوجاتی ہے، پھر اس مقصد کے تحت لائی جانے والی ضمیر کبھی تو بارز ہوتی ہے اور کبھی مستتر، پھر ضمیر بارز کبھی شان ہوتی ہے اور کبھی ضمیر قصہ، ضمیر قصہ کی مثال، جیسے: ع ''هي النفس ما حمّلتها تتحمل''

مثال مذکور میں پہلے ''النفس'' کہنے کے بجائے ''هي'' ضمیر قصہ لے کر آئے، اور ضمیر شان جیسے ''هو الله احد'' اس آیت میں پہلے ''الله'' لانے کے بجائے ''هو'' ضمیر شان لائے تاکہ مابعد الضمیر ذہن میں راسخ ہوجائے، اور ضمیر مستتر کی مثال، جیسے ''نعم تلمیذاً المؤدب'' نعم میں ایک ضمیر پوشیدہ ہے وہی محل استشہاد ہے۔

وعکسه: حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف جس

طریقے سے یہ ہے کہ اسم ظاہر کی جگہ ضمیر کا استعمال کیا جائے ایسے ہی اس کے برعکس کرنا یعنی ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کا استعمال کرنا بھی مقتضائے ظاہر کے خلاف ہے اور ایسا کرنا کسی مقصد کے لیے ہوتا ہے، مثلاً حکم ماننے کے سبب کو پختہ کرنے کے لیے، جیسے کہ تمہارا کہنا اپنے غلام سے ''سیّدك یأمرك بكذا'' تمہارا آقا تمہیں اس کام کا حکم دیتا ہے، مثال مذکور میں مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ کہا جاتا ''أنا آمرك بكذا'' کیوں کہ یہ مقام تکلم ہے اور متکلم اپنے کو ہمیشہ ضمیر ہی میں پیش کرتا ہے، لیکن ضمیر کی جگہ لفظ ''سیّد'' کا استعمال کیا، تا کہ حکم ماننے کے سبب کی تقویت ہو جائے اور غلام کو اس کے کرنے کی رغبت ہو کیوں کہ آقا کا نام سنتے ہی غلام اس کا حکم بجالانے کی کوشش کرتا ہے، برخلاف ''أنا'' کہ اس میں وہ قوت نہیں ہے کیوں کہ ''أنا'' کا استعمال ہر متکلم کرتا ہے۔

ومنها الالتفات الخ: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت التفات ہے اور التفات نام ہے کلام کا تکلم یا خطاب یا غیبت کی حالت سے اسی جیسے دوسرے حالت کی طرف منتقل کرنے کا، گویا کہ التفات کی تین شکلیں ہیں (۱) تکلم سے خطاب کی طرف (۲) تکلم سے غیبت کی طرف (۳) خطاب سے تکلم کی طرف۔

بعدازاں حضرات مصنفینؒ نے ہر ایک شکل کی مثال دی ہے، پہلی قسم یعنی تکلم سے خطاب کی طرف کلام کو منتقل کرنے کی مثال جیسے ''**ومالی لا أعبد الّذی فطرنی وإلیه ترجعون**'' اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں نہیں عبادت کرتا ہوں اس ذات کی جس نے مجھے پیدا کیا اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آیت مذکورہ میں محل استشہاد ''أعبد'' اور ''ترجعون'' ہے بایں طور کہ پہلا فعل تو متکلم کے صیغے کے ساتھ ہے اور دوسرا خطاب کے ساتھ، جب کہ مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ یوں کہا جاتا ''وإلیه أرجع'' تا کہ دونوں فعلوں میں یکسانیت ہو جاتی

مگر "إليه ترجعون" میں کلام کی حالت کو تکلم سے خطاب کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

دوسری قسم یعنی تکلم سے غیبت کی طرف انتقال کی مثال جیسے "إنّا أعطيناك الكوثر فصلّ لربّك وانحر" ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا، سو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھیے۔

آیت کریمہ میں محل استشہاد "أعطينا" اور "لربّك" ہے اور التفات بایں طور ہے کہ "أعطيناك" میں کلام حالت تکلم میں ہے اور "لربّك" میں صیغہ غائب میں تبدیل ہو گیا ہے، اس لیے کہ "رَبٌّ" اسم ظاہر ہے اور اسم ظاہر غائب کے درجے میں ہوتا ہے، جب کہ مقتضائے ظاہر "فصلّ لنا" تھا۔

تیسری قسم یعنی خطاب سے تکلم کی طرف التفات کی مثال جیسے شاعر کا شعر ؎

اتطلب وصل ربّات الجمـال

وقد سقط المشيب على قذالي

لغات: طلبَ يطْلُبُ طلبًا (ن) چاہنا۔ سَقَطَ يَسْقُطُ سُقُوطًا (ن) گر پڑنا۔ مشيبٌ مصدر میمی ہے۔ شَابَ يشِيبُ شَيبًا وشَيبَةً (ض) سفید بالوں والا ہونا، بوڑھا ہونا۔ قَذَالٌ (ج) قُذُلٌ سر کا پچھلا حصہ، گدی۔

ترکیب: أ ہمزہ استفہام "تطلب" فعل، ضمیر مخاطب ذوالحال، "وقد سقط المشيب على قذالي" فعل فاعل و متعلق سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ شدہ حال، ذوالحال با حال فاعل، وصلَ مضاف "ربّات الجمال" مرکب اضافی مضاف الیہ، مضاف با مضاف الیہ مفعول، فعل با فاعل و مفعول جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

مثال مذکور میں محل استشہاد "أتطلب" اور "قذالي" ہے اور التفات بایں طور ہے کہ أتطلب میں شاعر نے اپنے نفس کو مخاطب بنایا ہے اور قذالی میں التفات کر کے اپنے آپ کو صیغہ تکلم میں پیش کیا ہے، حالاں کہ مقتضائے ظاہر قذالك تھا۔

شعر مذکور میں شاعر اپنے نفس کو متنبہ کر کے کہہ رہا ہے کہ اب تو تجھے وہ رنگ رلیاں ترک کر دینا چاہئے جس میں جوانی کے زمانی میں ملوث تھا اس لیے کہ اس چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اب سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، بڑھاپے میں جوانی جیسی مستیاں زیب نہیں دیتیں اس لیے ان سے باز آجانا چاہئے۔

٨۔ ومِنها: تجاهُلُ العَارِفِ وهو سَوقُ المَعْلُومِ مَساقَ غيرِهِ لِغَرَضٍ كالتَّوبيخِ نحوُ۔

أَيَا شَجَرَ الخَابُورِ مَالَكَ مُورِقًا　　كَأَنَّكَ لَمْ تَجْزَعْ عَلَى ابْنِ طَرِيْفِ

٩۔ ومِنهَا: أسْلُوبُ الحَكِيمِ وهُوَ تَلَقِّي المُخاطَبِ بِغيرِ مَا يَتَرَقَّبُهُ أوِ السَّائِلِ بِغَيرِ ما يَطْلُبُهُ تَنْبِيهًا على أنَّهُ الأَوْلٰى بالقَصْدِ.

فَالأوَّلُ يكُونُ بِحَمْلِ الكَلامِ علٰى خِلَافِ مُرَادِ قَائِلِهِ كَقَولِ القَبعْثَرِىٰ لِلْحَجَّاجِ وَقَدْ تَوعَّدَهُ بِقَوْلِهِ "لأحمِلَنَّكَ عَلَى الأدْهَمِ" مِثْلُ الأميرِ يَحْمِلُ علَى الأدهَمِ والأشهبِ فقَالَ الحَجَّاجُ: أرَدْتُ الحَديدَ فقَالَ القَبعْثَرىٰ: لأنْ يَكُونَ حَدِيدًا خيرٌ مِنْ أنْ يكونَ بلِيدًا. أرادَ الحَجَّاجُ بالأدهمِ القَيدَ وبِالحَدِيدِ المعْدِنَ المَخْصُوصَ وحَمَلَهَا القَبعْثرىٰ على الفَرَسِ الأدهمِ الَّذِي ليسَ بَليدًا.

والثَّانِي يكُونُ بتنزِيلِ السُّؤالِ منزِلَةَ سُؤَالٍ آخَرَ مُنَاسِبٍ لِحالَةِ السَّائِلِ كَمَا فِي قولِهِ تعالٰى "يَسْئَلُونكَ عنِ الأهِلَّةِ قُل هِىَ مَوَاقِيتُ للنَّاسِ والحَجِّ" سألَ بعضُ الصَّحابَةِ النَّبيَّ صلَّى اللّٰهُ عليهِ وسلَّمَ مابَالُ الهِلالِ يَبدُو دقِيقًا ثُمَّ يتزايَدُ حتّٰى يصيرَ بدرًا، ثُمَّ يتَنَاقَصُ حتّٰى يعُودَ كمَا بَدَأَ، فجَاءَ الجَوابُ عنِ الحِكْمةِ المُتَرتِّبَةِ علٰى ذٰلكَ لِأَنَّهَا أهمُّ لا سَّائِلِ فنزَّلَ سُؤالَهُمْ عنْ سَبَبِ الاخْتِلافِ منزِلَةَ السُّؤالِ عن حِكْمَتِهِ.

ترجمہ: اور انہیں اقسام میں سے تجاہل عارف ہے اور وہ معلوم کو غیر

معلوم کی جگہ لاتا ہے، جیسے کہ توبیخ، مثلاً أيا شجر الخابور ۔

اے نہر خابور کے درخت تو کیوں پتے دار اور سرسبز و شاداب ہو رہا ہے؟ ایسا لگتا ہے تو نے ابن طریف پر ماتم نہیں کیا۔

اور انہیں اقسام میں سے اسلوب حکیم ہے اور وہ مخاطب کو اس طرح جواب دینا ہے جس کی وہ توقع نہ رکھتا ہو، یا پوچھنے والے کو ایسا جواب دینا ہے جسے اس نے طلب نہ کیا ہو، اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ وہی مقصود کے لائق ہے، چناں چہ اول کلام کو اس کے قائل کی مراد کے خلاف حمل کرنے سے ہوتا ہے، جیسے قبعثریٰ کا قول حجاج بن یوسف سے جب کہ اس نے اپنے قول "لأحملنك على الأدهم" میں تجھے بیڑی پر چڑھادوں گا۔ سے دھمکی دی تھی " مثل الأمير يحمل على الأدهم والأشهب" امیر جیسا شخص ہی سیاہی مائل اور سفید مائل گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ تو حجاج بن یوسف نے اس سے کہا میں نے حدید (بیڑی) مراد لیا ہے، تو قبعثریٰ نے کہا "لأن يكون حديدًا خير من أن يكون بليدًا" البتہ حدید (ذہین) ہونا بہتر ہے بلید ہونے سے، حجاج نے ادہم سے "بیڑی" مراد لی اور حدید سے "معدن مخصوص" اور قبعثریٰ نے اس کو اس سیاہی مائل گھوڑے پر محمول کرلیا جو بلید اور کمزور نہ ہو۔

اور دوسرا، سوال کو کسی دوسرے سوال کے درجے میں اتارنے سے ہوتا ہے جو سائل کی حالت کے مناسب ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول "يسئلونك عن الأهلة الخ" میں، وہ لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ لوگوں اور حج کے لیے وقت پہچاننے کا ذریعہ ہے۔ بعض صحابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا چاند کا کیا معاملہ ہے، کہ باریک ظاہر ہوتا ہے، پھر بڑھتا رہتا ہے تاآنکہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، پھر گھٹتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پھر اسی حالت پر لوٹ آتا ہے، جیسا کہ ابتدا میں تھا، چناں چہ جواب دیا گیا

اس حکمت کے متعلق جو چاند کی حالت اختلاف پر مرتب ہوتی ہے، اس لیے کہ یہی سائل کے لیے زیادہ اہم ہے، چناں چہ ان کے سوال کو جو چاند کی اختلاف حالت کے سبب کے متعلق تھا، چاند کی حکمت کے سوال کے درجے میں اتار لیا گیا۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفینؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی صورتوں میں سے ایک صورت تجاہل عارف ہے، اور تجاہل عارف یہ ہے کہ کسی نکتے کے پیش نظر شئ معلوم کو غیر معلوم کے درجے میں اتار لینا یعنی جانتے ہوئے بھی انجان بن جانا، جیسے ؎

أيا شجــر الخابور مالك مورقا

كأنك لم تجزع على ابن طريف

لغات: أورَقَ الشَّجرُ يُورِق إيراقًا (افعال) درخت کا پتے دار ہونا، جزِعَ يجزَعُ جزَعًا (س) افسوس کرنا، بے صبری کرنا۔

ترکیب: أيا حرف ندا، شجر الخابور منادی، ندا با منادیٰ جملہ ندائیہ ہوا، ما بمعنی أي شئ مبتدا، لك محذوف سے متعلق ہو کر خبر "مورقاً" محذوف کی ضمیر سے حال ہے۔ كأن حرف مشبہ بہ فعل، ك اسم "لم تجزع" فعل بافاعل، على جارہ، ابن طريف مجرور، جار با مجرور متعلق بہ لم تجزع، فعل بافاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر كأن، كأنّ با اسم و خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور لیلیٰ بنت طریف کا ہے جو اس نے اپنے بھائی ولید بن طریف کے مرثیے میں کہا ہے۔ شعر مذکور میں تجاہل عارفانہ بایں طور ہے کہ ؎

شاعرہ جانتی ہے کہ شجر بے جان چیز ہے نہ تو وہ کوئی جواب نہیں دے سکتا ہے، اور نہ ہی کسی کے خطاب کا مخاطب بن سکتا ہے نیز یہ کہ بے جان چیز کسی پر ماتم نہیں کرتی ہے یہ کام تو ذوی العقول کا ہے، مگر پھر بھی جانتے ہوئے انجان بن کر محبت کی وارفتگی میں شجر کو مخاطب بنا دیا ہے۔

منها أسلوبِ الحکیم : مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک صورت اسلوب حکیم ہے، پھر اسلوب حکیم کی تعریف کی ہے اور اسے مثالوں سے واضح کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ اسلوب حکیم یہ ہے کہ مخاطب کے سامنے خبر کو اس طرح پیش کیا جائے جس کی وہ توقع نہ رکھتا ہو، یا سائل کو ایسا جواب دیا جائے جو اس کے مقصد کے خلاف ہو اور ایسا اس لیے کیا جاتا ہے، تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ مخاطب کے سامنے جو خبر پیش کی گئی ہے، یا سائل کو جو جواب دیا گیا ہے، وہی مقصد بننے کے زیادہ لائق ہے۔

فالأول: فرماتے ہیں کہ پہلی صورت یعنی مخاطب کے سامنے غیر متوقع خبر کو پیش کرنا بایں طور ہوتی ہے کہ قائل کی مراد کے خلاف اس کے کلام کو محمول کر لیا جائے، مثلاً قبعثریٰ کا وہ قول جو اس نے حجاج ابن یوسف سے کہا تھا۔ ”**مثل الأمیر یحمل علی الأدهم والأشهب**“ یہ قول قبعثریٰ نے حجاج ابن یوسف سے اس وقت کہا تھا جب اس نے قبعثریٰ کو ”**لأحملنك علی الأدهم**“ کہہ کر دھمکی دی تھی۔ یعنی میں تجھے بیڑی پر چڑھادوں گا، تو قبعثریٰ نے کہا ”**مثل الأمیر یحمل علی الأدهم والأشهب**“ امیر جیسا شخص ہی سیاہی اور سفیدی مائل گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، تو حجاج بن یوسف نے اس سے کہا میں نے ادہم سے حدید یعنی بیڑی مراد لیا ہے، تو قبعثریٰ نے کہا ”**لأن یکون حدیدًا خیر من أن یکون بلیدًا**“ البتہ حدید ہونا زیادہ بہتر ہے بلید ہونے سے۔

مثال مذکور میں دیکھئے کہ حجاج بن یوسف نے ادہم سے حدید یعنی لوہا اور بیڑی مراد لیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ میں تجھے بیڑی کی سزا دوں گا، مگر قبعثریٰ نے ادہم کو حجاج بن یوسف کی مراد کے خلاف اس ادہم پر محمول کر لیا جو عمدہ گھوڑے کے وصف کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اور اس کا قرینہ اشہب ہے اور یہ کہا کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ ادہم و اشہب پر سوار کیا جاؤں یہ تو صرف امیر اور امیر جیسوں کے

ہی شایان شان ہے، پھر حجاج نے قبعثریٰ سے کہا کہ میں نے ادہم سے حدید یعنی بیڑی مراد لی ہے، مگر قبعثریٰ نے اس کے قول حدید کو اس حدید پر محمول کر دیا جو تیز رو گھوڑے کے معنی میں ہے اور کہا "لأن يكون حديدًا خير من أن يكون بليدًا" یعنی وہ گھوڑا جس پر امیر کو سوار کیا جائے تیز رفتار ہو تو بہتر ہے اس سے کہ وہ بلید اور سست رفتار ہو۔

والثاني: اور دوسری صورت یعنی سائل کو خلاف مقصود جواب دینا اس طریقے سے ہوتی ہے کہ سائل کے سوال کو کسی ایسے دوسرے سوال کے درجے میں اتار لیا جائے، جو سائل کی حالت کے مناسب ہو پھر اس کو اسی دوسرے سوال ہی کا جواب دیا جائے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول "**يسئلونك عن الأهلة ، قل هي مواقيت للناس والحج**" میں۔

آیت کریمہ کی تشریح اس کے شان نزول کے ساتھ مصنفینؒ نے خود ذکر کی ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کے بارے میں دریافت کیا کہ چاند کا معاملہ کیا ہے؟ کہ ابتدا میں تو باریک رہتا ہے، پھر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ماہ کامل ہو جاتا ہے، پھر گھٹتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پھر اسی حالت پر آ جاتا ہے جیسا شروع میں تھا۔

حقیقت میں صحابۂ کرامؓ کا یہ سوال چاند کی حالت کے اختلاف اور روشنی کی کمی وزیادتی کے بارے میں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے اس سوال کا جواب نہیں دیا، بل کہ ان کے سوال کو دوسرے سوال کے درجے میں اتار کر اس دوسرے سوال کا جواب دیا "**قل هي مواقيت للناس والحج**" آپ فرما دیجئے کہ وہ لوگوں اور حج کے اوقات کے جاننے کا ذریعہ ہے، یعنی چاند کی اختلاف حالت کے بارے میں سوال کرنا بے معنی ہے اور اس سے تم سب کی کوئی غرض بھی وابستہ نہیں ہے اور نہ ہی ہر ایک کے بس کی ہی بات ہے۔ کہ وہ اختلاف کے اسباب کو

اچھی طرح آسانی سے سمجھ سکے۔ بل کہ تمہارے لائق یہ تھا کہ تم یہ سوال کرتے کہ چاند کے نکلنے کی حکمت کیا ہے؟ یہی وہ دوسرا سوال ہے جس کے درجے میں ان کے سوال کو اتارا گیا ہے اور اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ چاند کے نکلنے اور غروب ہونے میں حکمت یہ ہے کہ اس سے حج وغیرہ کی تاریخوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۰. وَمِنْهَا: التَّغْلِيبُ وهُوَ تَرْجِيحُ أَحَدِ الشَّيْئَيْنِ علَى الآخرِ فِي إِطْلاقِ لفْظِهِ عَلَيهِ كَتغْلِيبِ المُذَكَّرِ علَى المُؤَنَّثِ فِيْ قَولِهِ تعالٰى "وكَانَتْ مِنَ القَانِتِينَ" ومِنْهُ الأبوَانِ لِلأبِ والأمِّ، وكَتَغْلِيبِ المُذَكَّرِ والأخفِّ علٰى غيرِهِمَا نحوُ "القَمَرَينِ" أي الشَّمسِ والقَمَرِ و"العُمَرَينِ" أيْ أبِيْ بكْرٍؓ وعُمَرؓ، والمُخَاطَبِ علٰى غيرِهٖ نحوُ "لنُخرِجَنَّكَ ياشُعَيبُ وَالَّذِينَ آمَنُوْا معَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أو لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" أُدْخِلَ شُعَيبٌ بحُكْمِ التَّغْلِيبِ فِي "لَتَعُودُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا" مَعَ أَنَّهٗ لَمْ يكُنْ فِيهَا قطُّ حتّٰى يعودَ إلَيهَا وكَتَغْلِيبِ العَاقِلِ علٰى غيرِهٖ كقَولِهٖ تعالٰى "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ ربِّ العَالَمِينَ"

ترجمہ: اور انہیں اقسام میں سے تغلیب ہے اور وہ دو چیزوں میں سے ایک کو دوسرے پر راجح قرار دینا ہے، اس کے لفظ کے اس پر اطلاق کے سلسلے میں، جیسے کہ مذکر کی تغلیب مؤنث پر اللہ تعالیٰ کے قول "وكانت من القانتين" میں اور وہ بندگی کرنے والوں میں سے تھیں۔ اور اسی میں سے "الأبوان" ہے باپ اور ماں کے لیے اور جیسے کہ مذکر اور کم درجے والے کی تغلیب ان دونوں کے علاوہ پر، جیسے قمرین یعنی شمس وقمر اور عمرین یعنی ابوبکرؓ وعمرؓ اور مخاطب کی تغلیب اس کے غیر پر، جیسے "لنخرجنك ياشعيب الخ" البتہ ہم ضرور نکال دیں گے اے شعیب تم کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے تمہارے ساتھ اپنی بستی سے۔ حضرت شعیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو داخل کیا گیا تغلیب کے ساتھ "لتعودنّ في ملّتنا" میں باوجود ے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کفار کی ملت میں کبھی بھی نہیں تھے کہ

اب اس ملت کی طرف لوٹ کر جائیں۔

اور عاقل کی تغلیب غیر عاقل پر جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان "الحمد للہِ ربِّ العالمین" میں۔ تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفینؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ مقتضائے ظاہر کے خلاف کلام لانے کی ایک شکل تغلیب ہے اور تغلیب یہ ہے کہ دو ملی جلی اور مشابہ چیزوں میں سے ایک کو دوسرے پر غلبہ دے دیا جائے اس طریقے پر کہ ایک ہی لفظ کا دونوں چیزوں پر اطلاق ہوجائے مثلاً اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول "وکانت من القانتین" میں مذکر کو غلبہ دیا گیا ہے مونث پر اس طریقے سے کہ یہ آیت حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں ہے اور "وکانت" میں ضمیر کا مرجع حضرت مریم علیہا السلام ہی ہیں، اس لحاظ سے مقتضائے ظاہر یہ تھا کہ "وکانت من القانتات" صیغۂ تانیث کے ساتھ کہا جاتا مگر مذکر کی تغلیب کی وجہ سے "قانتین" کہا گیا۔

اسی طریقے سے "أبوین" میں بھی مذکر کو مؤنث پر غلبہ دے دیا گیا ہے، اس طریقے سے کہ ابوین کا اطلاق ماں اور باپ دونوں پر ہوتا جب کہ "أبٌ" کے معنی صرف باپ کے آتے ہیں تو "أبوان" کا ترجمہ دو باپ ہوا مگر تغلیباً دونوں کو ابوین کہا گیا ہے، اسی طریقے سے کبھی کبھی مذکر اور کم درجے والے کو غلبہ دے دیا جاتا ہے، ان دونوں کے علاوہ پر، جیسے قمرین بول کر چاند اور سورج دونوں مراد لیتے ہیں اور عمرین بول کر ابوبکرؓ وعمرؓ دونوں مراد لیتے ہیں، ایسے ہی کبھی کبھی مخاطب کو غلبہ دے دیا جاتا ہے غیر مخاطب پر، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول "لنخرجنك یاشعیب الخ" میں اس طریقے سے کہ یہ بات حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی کہ اے شعیب! ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے

اپنی بستی سے نکال دیں گے یا وہ ہمارے مذہب میں لوٹ آئیں۔

"عوذ" کے معنی عربی زبان میں آتے ہیں "پہلی حالت کی طرف لوٹنا" یہ معنی حضرت شعیب علیہ السلام کے ان ساتھیوں پر تو صادق آ سکتا ہے جو پہلے کافر تھے پھر انہوں نے اسلام قبول کیا، اس لیے کہ ان کا کفر کی طرف لوٹنا پہلی حالت کی طرف لوٹنا ہوگا مگر حضرت شعیب علیہ السلام پر تو کسی بھی درجے میں کبھی بھی صادق نہیں آ سکتا، اس لیے کہ آپ علیہ السلام تو کفر سے معصوم تھے، نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی، پھر ان کی ملت میں لوٹ کر جانے کیا سوال پیدا ہوسکتا ہے، اس لیے یقینی طور پر یہ حکم تغلیبی ہے، یعنی آپ کو جو مخاطب ہیں آپ علیہ السلام کے ساتھیوں یعنی غیر مخاطب پر غلبہ دے دیا۔

اسی طریقے سے کبھی کبھی عاقل کو غیر عاقل پر غلبہ دے دیا جاتا ہے، جیسے کہ باری تعالیٰ کے فرمان "الحمدللّٰہ ربِّ العالمین" میں اس طریقے سے کہ عالمین کو جمع مذکر سالم لایا گیا ہے باوجود یہ کہ جمع مذکر سالم عقلاء کے ساتھ خاص ہے اور عالم میں عاقل اور غیر عاقل سب داخل ہیں، مگر چوں کہ عاقل کو غیر عاقل پر فوقیت دے دی گئی ہے، اس لیے یہ جمع لانا صحیح ہے۔

عِلمُ البَيان

الْبيانُ علمٌ يُبحَثُ فيهِ عنِ التَّشبيهِ والمَجازِ والكِنايَةِ.

التَشبيهُ

التَّشبيهُ إلحَاقُ أَمرٍ بأَمرٍ فِيْ وصفٍ بِأَداةٍ لغَرَضٍ، والأَمرُ الأَوَّلُ يُسمّٰى المُشَبَّهَ، والثَّانِي المُشَبَّهَ به، والوَصفُ وجهَ الشَّبهِ، والأَداةُ الكَافُ أَو نحوُهَا، نحوُ "العِلمُ كالنُّورِ فيْ الهِدايَةِ" فَالعِلمُ مشبَّهٌ، والنُّورُ مُشبَّهٌ به، والهِدايَةُ وجهُ الشَّبهِ، والكَافُ أداةُ التَّشبيه، ويَتعلَّقُ بِالتَّشْبِيْهِ ثلاثَةُ مبَاحِثَ، الأَوَّلُ فيْ أَركانِهِ، والثَّانِيْ فِيْ أَقْسامِهِ، والثَّالِثُ فِيْ الغَرَضِ مِنهُ.

علم بیان

علم بیان وہ علم ہے جس میں تشبیہ، مجاز اور کنایہ کے متعلق بحث کی جائے۔

تشبیہ

تشبیہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ادات کے ذریعہ کسی صفت میں لاحق کرنا ہے کسی غرض کے لیے، امر اول کو مشبہ، دوسرے کو مشبہ بہ، اور وصف کو وجہ شبہ کہا جاتا ہے، اور ادات کاف ہے اور اس جیسے دوسرے حروف، مثلاً "العلمُ كالنُّورِ فيْ الهداية" علم رہنمائی میں روشنی کی طرح ہے، تو علم مشبہ ہے اور نور مشبہ بہ اور ہدایت وجہ شبہ اور کاف ادات تشبیہ ہے۔

تشبیہ کے ساتھ تین مباحث متعلق ہوتے ہیں، پہلی بحث تشبیہ کے ارکان کے سلسلے میں، دوسری بحث تشبیہ کے اقسام کے بیان میں اور تیسری بحث تشبیہ کی

غرض کے سلسلے میں۔

تشریح: علم معانی کے مباحث سے فارغ ہونے کے بعد اب مصنفینؒ علمِ بیان کا آغاز فرمارہے ہیں اس لیے کہ علم بلاغت میں جہاں احوال اور مقتضائے احوال کا جاننا ضروری ہے تاکہ کلام کو احوال کے مطابق لایا جاسکے اور یہ چیز علم معانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طریقے سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کلامِ فصیح کی دلالت معنیٰ مرادی پر کس قدر واضح ہے اور کلام کس درجہ خفاء معنوی (تعقید معنوی) سے پاک ہے، اور یہ چیز علم بیان سے معلوم ہوتی ہے۔

بیان کے لغوی معنیٰ ہیں واضح ہونا، ظاہر ہونا، اور اصطلاح میں علم بیان کی تعریف مصنفینؒ نے یہ کی ہے کہ بیان ایسا علم ہے جس میں تشبیہ اور مجاز و کنایہ سے بحث کی جائے، علم بیان کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے کہ علم بیان اس علم کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک مضمون کو کئی انداز سے ادا کرنے کا طریقہ معلوم ہو، دونوں تعریفوں کا ماحصل تقریباً ایک ہی ہے اس لیے کہ تشبیہ، مجاز اور کنایہ، یہ سبھی بیان کے طریقے ہیں، مگر تشبیہ انواع بلاغت میں سب سے اشرف شمار ہوتا ہے، اب مصنفینؒ ہر ایک کی تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

تشبیہ

حضرات مصنفینؒ تشبیہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تشبیہ نام ہے ایک شے کا دوسری شے کے ساتھ کسی ایسی صفت میں لاحق کرنا جو دونوں میں پائی جاتی ہو، پہلی شے جس کو دوسرے کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے، اس کا نام مشبہ ہے، اور دوسری شے جس کے ساتھ لاحق کیا جائے اس کا نام مشبہ بہ ہے اور وہ وصف جس میں دونوں چیزوں کو شریک کیا جائے اس کا نام وجہ شبہ ہے اور وہ حرف جس کے ذریعہ ایک شے کو دوسرے کے ساتھ لاحق کیا جائے اس کا نام حرف تشبیہ ہے

جیسے "العلم کالنور في الهداية" مثال مذکور میں چوں کہ علم کو روشنی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ہدایت میں، اس لیے علم مشبہ ہے، نور مشبہ بہ، ہدایت وجہ شبہ اور کاف حرف تشبیہ ہے۔

ويتعلق بالتشبيه: فرماتے ہیں کہ تشبیہ سے تین بحثیں متعلق ہیں، پہلی ارکانِ تشبیہ کے متعلق، دوسری بحث تشبیہ کی قسموں کے متعلق اور تیسری بحث کا تعلق تشبیہ کی غرض سے ہے۔

المبحَثُ الأوَّلُ فِيْ أركانِ التَّشبيهِ

أركانُ التَّشبِيهِ أربعةٌ: المُشَبَّهُ، والمُشبَّهُ بهِ (ويُسمَّيان طرَفَيِ التَّشْبيهِ) وَوَجْهُ الشَّبْهِ والأداةُ.

وَالطَّرفان إمَّا حِسِّيَّان نحوُ "الوَرَقُ كَالحَرِيرِ فِيْ النُّعُومَةِ" وإمَّا عَقلِيَّان نحوُ "الجهلُ كَالمَوتِ" وإمَّا مُختَلِفان نحوُ "خُلقُهُ كَالعِطْرِ".

ووَجْهُ الشَّبهِ هُوَ الوَصْفُ الخَاصُّ الَّذِيْ قصِدُ اشْتِرَاكُ الطَّرفَينِ فيهِ كَالهِدايَةِ فِيْ العِلمِ والنُورِ.

وَأداةُ التَّشْبِيهِ هِيَ اللَّفظُ الَّذِيْ يدُلُّ على معنَى المُشَابَهةِ كَالكَافِ وكَأَنَّ ومَافِيْ معنَاهُمَا والكافُ يلِيهَا المُشَبَّهُ بهِ بخِلافِ كأَنَّ فيلِيهَا المُشبَّهُ نحوُ

كَأَنَّ الثُّرَيَّا رَاحةٌ تَشْبُرُ الدُّجى
لِتَنْظُرَ طَالَ اللَّيلُ أمْ قَدْ تعرَّضَا

وكأَنَّ تُفِيدُ التَّشْبِيهِ إذَا كانَ خبَرُهَا جامِدًا والشَّكَّ إذَا كانَ خبرُهَا مُشْتَقًّا نحوُ "كَأنَّكَ فاهِمٌ"

وقَدْ يُذكَرُ فِعلٌ يُنبِئُ عنِ التَّشْبيهِ نحوُ قولِهِ تعالى "وَإذَا رَأيتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَنثُورًا" وَإذَا حُذِفَتْ أداةُ التَّشْبِيهِ ووَجْهُهُ يُسمَّى تَشْبِيهًا

بَلِيغًا ، نحوُ "وَجَعلْنَا اللَّيلَ لِبَاسًا" أيْ كَاللِّبَاسِ فِيْ السَّتْرِ .

پہلی بحث ارکان تشبیہ کے بیان میں

ارکان تشبیہ چار ہیں مشبہ، مشبہ بہ، (ان دونوں کو تشبیہ طرفین کہا جاتا ہے) وجہ شبہ اور ادات تشبیہ۔ اور دونوں طرف یا تو حسی ہوں گے، جیسے "الورق کالحریر في النعومة" چاندی ملائم اور باریکی میں ریشم کی طرح ہے، یا تو دونوں عقلی ہوں گے، جیسے "الجهل كالموت" جہالت مانند موت کے ہے۔ اور یا تو دونوں مختلف ہوں گے، جیسے "خلقه كالعطر" اس کے اخلاق عطر جیسے ہیں، اور وجہ شبہ وہ وصف ہے جس میں طرفین کی شرکت کا قصد کیا گیا ہو، جیسے کہ ہدایت علم اور نور دونوں میں مشترک ہے۔

اور ادات تشبیہ وہ لفظ ہے جو مشابہت کے معنی پر دلالت کرتا ہے، جیسے کاف، کأنّ اور وہ الفاظ جو ان دونوں کے ہم معنی ہیں، کاف اس کے بعد مشبہ بہ آتا ہے، برخلاف کأنّ کے کہ اس کے بعد مشبہ آتا ہے، جیسے کأن الثريا ...

گویا کہ ثریا ہتھیلی ہیں جو تاریکیوں کی پیائش کرتے ہیں، تاکہ تو دیکھے (پیائش کرے) کیا رات لمبی ہوگئی ہے یا ختم ہونے کے قریب ہے۔

اور کأنّ تشبیہ کا فائدہ دیتا ہے جب کہ اس کی خبر جامد ہو اور شک کا فائدہ دیتا ہے جب کہ اس کی خبر مشتق ہو، جیسے "كأنّكَ فاهمٌ" ایسا لگتا ہے کہ تم سمجھ رہے ہو۔

اور کبھی کبھی ایسا فعل ذکر کیا جاتا ہے جو تشبیہ کا معنی دیتا ہے، جیسے "وإذا رأيتهم حسبتهم لؤلؤاً منثورًا" اور جب تم ان دونوں کو دیکھو گے تو سمجھو گے کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔

اور جب ادات تشبیہ اور وجہ تشبیہ کو حذف کردیا جائے تو اس کو تشبیہ بلیغ کہتے ہیں، جیسے "وجعلنا الليل لباساً" اور ہم نے رات کو ستر بنایا، یعنی لباس کی طرح

بنایا ڈھانکنے میں۔

تشریح: بحث اول میں مصنفینؒ نے ارکان تشبیہ کی وضاحت فرمائی ہے کہ تشبیہ کے ارکان چار ہیں (۱) مشبہ (۲) مشبہ بہ (۳) وجہ شبہ (۴) حرف تشبیہ، مشبہ اور مشبہ بہ کو طرفین تشبیہ بھی کہا جاتا ہے اسی طریقے سے وجہ شبہ کو وجہ تشبیہ کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔

والطرفان إما حسيان الخ: فرماتے ہیں کہ طرفین (مشبہ، مشبہ بہ) کی باعتبارِ حسی اور عقلی ہونے کے تین قسمیں ہیں ۱۔ دونوں (مشبہ مشبہ بہ) حسی ہوں، اور حسی سے مراد وہ چیز ہے جس کو حواس خمسہ ظاہرہ میں سے کسی ایک کے ذریعہ معلوم کیا جاسکے، حواس خمسہ ظاہرہ سے مراد قوت باصرہ (دیکھنے کی قوت یعنی آنکھ) قوت سامعہ (سننے کی قوت یعنی کان) قوت شامہ (سونگھنے کی قوت یعنی ناک) قوت ذائقہ (چکھنے کی قوت یعنی زبان) قوت لامسہ (چھونے کی قوت یعنی ہاتھ) ہے مطلب یہ ہے کہ دیکھ کر یا سن کر یا سونگھ کر یا چکھ کر یا چھو کر جو چیز معلوم ہو وہ حسی ہے، جیسے "**الورق كالحرير في النعومة**" چاندی نرمی میں ریشم کی طرح ہے۔

مثال مذکور میں "**الورق**" مشبہ اور "**الحرير**" مشبہ بہ دونوں حسی ہیں جو حواس خمسہ میں سے قوت لامسہ کے ذریعہ معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

۲۔ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں عقلی ہوں اور عقلی سے مراد وہ چیز ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی کے ذریعہ معلوم نہ ہو بل کہ عقل کے ذریعہ معلوم ہو، جیسے "**الجهل كالموت**" جہالت موت کی طرح ہے۔

مثال مذکور میں "**الجهل**" مشبہ اور "**الموت**" مشبہ بہ دونوں عقلی ہیں، کیوں کہ حواس خمسہ کے ذریعے جہالت اور موت کو معلوم نہیں کیا جاسکتا بل کہ یہ چیز عقلاً سمجھ میں آتی ہے۔

۳۔ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مختلف ہوں یعنی مشبہ عقلی ہو اور مشبہ بہ حسی، یا مشبہ حسی ہو اور مشبہ بہ عقلی ہو، جیسے "**خلقه كالعطر**" اس کے اخلاق عطر کی طرح

ہیں، مثال مذکور میں ''خلقه'' مشبہ تو عقلی ہے اور ''العطر'' مشبہ بہ عقلی نہیں بل کہ حسی ہے اس لیے کہ عطر کو سونگھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۴ـ چوتھی صورت یعنی مشبہ حسی ہو اور مشبہ بہ عقلی، اس کی مثال حضرات مصنفینؒ نے نہیں دی ہے، اس چوتھی صورت کی مثال یہ ہے ''طبيب السوء كالموت'' برا طبیب مثل موت کے ہے، مثال مذکور میں ''طبيب السوء'' مشبہ تو حسی ہے مگر ''الموت'' مشبہ بہ عقلی ہے۔

ووجه الشبه: فرماتے ہیں کہ وجہ شبہ وہ وصف خاص ہے جس میں طرفین کے اشتراک کا قصد کیا جائے، جیسے ''العلم كالنور في الهداية'' علم ہدایت میں روشنی کی طرح ہے۔

مثال مذکور میں ''ہدایت'' وجہ شبہ ہے اس لیے کہ اس میں علم اور نور دونوں شریک ہیں، کیوں کہ دونوں کے ذریعے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

وأداة التشبيه: فرماتے ہیں کہ حرف تشبیہ وہ لفظ ہے جس کے ذریعے تشبیہ دی جائے، جیسے ''کاف'' اور ''کأنّ'' حضرات مصنفینؒ نے صرف ان دو حروف کو شمار کیا ہے مگر اس تشبیہ میں وہ تمام الفاظ مستعمل ہوتے ہیں۔ جو تشبیہ کا معنی دیتے ہیں، جیسے مثلٌ ، شبيهٌ ، مماثلٌ وغیرہ۔ البتہ اگر کسی جگہ حروف تشبیہ میں سے کاف کو استعمال کیا جائے تو اس کے بعد مشبہ بہ آئے گا اور اگر کأنّ کو استعمال کیا جائے تو اس کے بعد مشبہ آئے گا، جیسے شاعر کا شعر ؎

كأن الثريا راحة تشبر الدجى

لتنظر طال الليل أم قد تعرّضا

لغات: ثریا چند ستاروں کے مجموعے کو کہتے ہیں شَبَرَ يَشْبُرُ شبرًا (ن،ض) بالشت سے ناپنا، رَاحَة (ج) رَاحَاتٌ، ہتھیلی، دُجى (واحد) دُجيَةٌ، تاریکی۔ تَعَرَّضَ تَعَرُّضًا (تفعّل) چوڑا ہونا، مرادی ترجمہ ختم کے قریب ہونا۔

ترکیب: کأنّ حرف مشبہ بہ فعل "الثریّا" اسم "راحۃٌ" موصوف "تشبُرُ" فعل بافاعل "الدُّجٰی" مفعول بہ، لام تعلیلیہ جارہ "تنظر" فعل بافاعل "طال اللیل" فعل بافاعل معطوف علیہ، أم حرف عطف "قد تعرضا" فعل بافاعل جملہ خبریہ شدہ معطوف، معطوف علیہ با معطوف جملہ معطوفہ شدہ، محلاً منصوب بوجہ مفعولِ تنظر أي لتنظر طولَ اللیل و عرضہ، "تنظر" فعل بتاویل مصدر شدہ مجرور، جار با مجرور متعلق بہ تَشْبُرُ، جملہ صفتِ راحۃٌ، راحۃ باصفت خود خبرِ کأنّ۔

شعر مذکور میں "ثریا" کأنّ کے بعد ہے اس لیے مشبہ ہے اور اسے ایسا ہتھیلی سے تشبیہ دی گئی ہے جو تاریکیوں کی پیائش کرتی ہے۔

وکأنّ تفید التّشبیہ الخ: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کأنّ کی خبر اگر جامد ہو تو کأنّ سے تشبیہ کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اگر اس کی خبر جامد نہ ہو بل کہ مشتق ہو تو شک کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، جامد کی مثال جیسے "کأنّ زیدًا أسدٌ" یہاں زید کو شیر سے تشبیہ دی گئی ہے اور مشتق کی مثال جیسے "کأنّك فَاهِم" ایسا لگتا ہے تم سمجھ رہے ہو، یعنی تمہارا سمجھنا یقینی نہیں معلوم ہوتا ہے بل کہ شک ہے۔

وقد یذکر الخ: فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تشبیہ کے معنی کی ادائے گی کے لیے بجائے حرف تشبیہ لانے کے ایسا فعل لاتے ہیں جو تشبیہ کا معنی دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے "وإذا رأیتھم حسبتھم لؤلؤاً منثورًا" اے مخاطب اگر تو ان کو (غلمانِ جنت کو چلتے پھرتے) دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں۔

آیت مذکورہ میں محل استشہاد "حسبتھم" ہے جس سے تشبیہ کا معنی سمجھ میں آرہا ہے۔

وإذا حذفت أداۃ التشبیہ الخ: مطلب یہ ہے کہ اگر اداتِ تشبیہ اور وجہ شبہ کو حذف کردیا جائے تو ایسی تشبیہ کو "تشبیہ بلیغ" کہتے ہیں، جیسے "وجعلنا

اللّیل لباساً" اورہم نے ہی رات کو پردہ کی چیز بنایا۔

آیت مذکورہ میں "اللّیل" مشبہ ہے "لباسٌ" مشبہ بہ ہے اور حرف تشبیہ اور وجہ شبہ محذوف ہے، تقدیری عبارت یہ ہے "وجعلنا اللیل کاللباسِ في الستر" کاف حرف تشبیہ اور "الستر" وجہ شبہ ہے۔

المبحث الثانيُ فِيُ أقسامِ التّشُبيهِ

ينقسِمُ بِاِعْتِبارِ طرَفَيهِ إلٰى أربعةِ أقسامٍ .

(١) تشبيه مُفردٍ بِمُفرَدٍ نحوُ "هٰذا الشّئُ كَالمِسكِ فِيْ الرَّائِحةِ"

(٢) وتَشْبِيهُ مُرَكَّبٍ بِمُرَكَّبٍ بِأن يكُونَ كُلٌّ مّنَ المُشَبَّهِ و المُشَبَّهِ بهٖ هَيئَةً حَاصِلةً مِّنْ عدَّةِ أُمُورٍ كَقَولِ بشَّارٍ ؎

كَأنَّ مُثَارَ النَّقْعِ فوقَ رُؤُوسِنَا
وَأسْيَافَنَا ليلٌ تَهَاوىٰ كَوَاكِبُهُ

فَإنَّهُ شبَّهَ هَيْئَةَ الغُبَارِ وَفِيهِ السُّيُوفُ مُضْطَرِبَةٌ بِهيْئَةِ اللَّيلِ، وفِيهِ الكَواكِبُ تَتَسَاقَطُ فِيْ جِهَاتٍ مُّخْتَلِفةٍ .

(٣) وَتَشْبِيهُ مُفْرَدٍ بِمُرَكَّبٍ كَتَشْبِيهِ الشَّقِيقِ بِهَيْئَةِ أعْلامٍ يَاقُوتِيَّةٍ مَنْشُورَةٍ علىٰ رِمَاحٍ زَبَرْجَدِيَّةٍ .

(٤) وَتَشْبِيهُ مُرَكَّبٍ بِمُفْرَدٍ نحوُ قَولِهٖ ؎

يَا صَاحِبَيَّ تَقَصَّيَا نظَرَيكُما ۔۔۔ تَرَيَا وُجُوهَ الأرضِ كَيفَ تَصَوَّرُ
تَرَيَا نهَارًا مُشْمِسًا قَدْ شَابَهُ ۔۔۔ زَهْرُ الرُّبَا فَكَأنَّمَا هُوَ مُقْمِرُ

فَإنَّهُ شَبَّهَ هَيْئَةَ النَّهارِ المُشْمِسِ الَّـذِيْ اخْتَـلَطَتْ بهٖ أَزْهَارُ الرَّبَوَاتِ بِاللَّيلِ المُقْمِرِ .

دوسری بحث تشبیہ کے اقسام کے بیان میں

ترجمہ: تشبیہ اپنے طرفین (مشبہ اور مشبہ بہ) کے اعتبار سے چار قسموں کی طرف منقسم ہوتی ہے (۱) مفرد کی تشبیہ مفرد سے جیسے "هٰذا الشيئ كالمسك في الرائحة" یہ چیز خوشبو میں مشک کی طرح ہے۔

(۲) مرکب کی تشبیہ مرکب سے بایں طور کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں سے ہر ایک کی ایسی ہیئت ہو جو کئی چیزوں سے حاصل ہوئی ہو، جیسے کہ بشار بن برد کا شعر "كأنّ مثار النقع الخ" ۔

گویا (تیز رفتار گھوڑوں کے پیروں سے) اڑی ہوئی گرد ہمارے سروں پر ہے اور ہماری تلواریں ایک رات ہے جس کے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں۔

کیوں کہ شاعر نے غبار کی ہیئت کو جب کہ اس میں تلوار کوندر ہی ہو رات کی ہیئت سے تشبیہ دی ہے جب کہ اس رات میں ستارے مختلف جہتوں میں گر رہے ہوں

(۳) مفرد کی تشبیہ مرکب سے جیسے گلِ لالہ کی تشبیہ یاقوتی (سرخ) جھنڈیوں کی ہیئت سے جو زبرجدی (سبز) نیزوں پر لہرا رہی ہوں۔

(۴) مرکب کی تشبیہ مفرد سے، جیسے کہ ابوتمام شاعر کا شعر يا صاحبيَّ الخ۔

اے میرے دونوں ساتھیو غور سے دیکھو، تم دیکھو گے کہ زمین کے چہرے کس طرح رنگت بدلتے رہتے ہیں تم روشن وصاف دن کو دیکھو گے جس میں ٹیلوں کے پھول مخلوط ہو گئے ہوں ایسا لگتا ہے کہ وہ چاندنی رات ہے۔

کیوں کہ شاعر نے اس روشن دن کی ہیئت کو جس میں ٹیلوں کے پھول مخلوط ہو گئے ہوں چاندنی رات سے تشبیہ دی ہے۔

تشریح: بحث اول میں تشبیہ کے ارکان کو بیان کرنے کے بعد اس دوسری بحث میں تشبیہ کے اقسام کو بیان کر رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ طرفین یعنی

مشبہ اور مشبہ بہ کے مفرد اور مرکب ہونے کے اعتبار سے تشبیہ کی چار قسمیں ہیں (۱) مفرد کی تشبیہ مفرد سے ہو یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مفرد ہوں، اور مفرد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ چند چیزوں سے مل کر نہ بنے ہوں، جیسا کہ تشبیہِ مرکب ہوتا ہے جس کی تفصیل آرہی ہے، جیسے "هٰذا الشيءُ كالمسك في الرائحة" مثال مذکور میں "الشيء" مشبہ ہے اور "المسك" مشبہ بہ ہے اور دونوں مفرد ہیں، اس طرح مفرد کی تشبیہ مفرد سے ہوئی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مرکب کی تشبیہ مرکب سے ہو یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہوں اور مرکب سے مراد وہ ہیئت ہے جو کئی چیزوں سے مل کر بنے، اس طریقے سے کہ اگر ان میں سے کسی چیز کو علیحدہ کرلیا جائے تو تشبیہ کا فائدہ حاصل نہ ہو، جیسے کہ بشار بن برد کا شعر ؎

كأنّ مثار النقع فوق رؤوسنا
وأسيا فنا ليل تهاوى كواكبه

لغات: مُثار اسم مفعول کا صیغہ ہے، أَثَارَ إِثَارَةً النَّقْعَ گرد اڑانا، اور "نقع" کی طرف اس کی اضافت "إضافة الصفة إلى الموصوف" کے قبیل سے ہے، اصل عبارت ہے كَأَنَّ النَّقْعَ الْمُثَارَ فَوْقَ رُؤُوْسِنَا. نَقْعٌ (ج) نِقَاعٌ ونُقُوعٌ گرد، غبار، تهاوى تهاويًا گرنا كواكب (واحد) كوكبٌ ستارہ۔

شعر مذکور میں شاعر نے غبار کی اس ہیئت کو جس میں تلواریں ادھر ادھر ہل رہی ہوں مشبہ بنایا ہے اور رات کی اس ہیئت کو جس میں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں مشبہ بہ قرار دیا ہے، یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں میں ایسی ہیئت ہے جو کئی چیزوں سے مل کر بنی ہے اور یہی تشبیہ مرکب بالمرکب ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مفرد کی تشبیہ مرکب سے ہو یعنی مشبہ مفرد اور مشبہ بہ مرکب ہو، جیسے ؎

وَكَأَنَّ مُحْمَرَّ الشَّقِيقِ إِذَا تَصَوَّبَ أَو تَصَعَّدَ
أَعْلَامُ يَاقُوتٍ نُشِرْنَ عَلَى رِمَاحٍ مِنْ زَبَرْجَدَ

گل لالہ (بادنسیم کے جھونکوں سے) جب کبھی نیچے کی طرف جھکتا ہے یا اوپر کی طرف اٹھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یاقوتی جھنڈیاں زبرجدی نیزوں پر لہرا رہی ہوں۔

حضرات مصنفینؒ نے مثال میں اس شعر کو تو پیش نہیں کیا ہے البتہ اسی شعر کے مفہوم کو سمجھایا ہے شعر مذکور میں "شقیق" (گل لالہ) مشبہ ہے جو مفرد ہے اور مشبہ بہ ان یاقوتی (سرخ) جھنڈیوں کی ہیئت ہے جو زبرجدی (سبز) نیزوں پر لہرا رہی ہوں، اور یہ مرکب ہے۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ گل لالہ بادنسیم کے جھونکوں سے جب کبھی نیچے اور اوپر کی طرف جھکتے اور اٹھتے ہیں تو مجھ سے مت پوچھو کہ وہ کتنا حسین اور دل فریب منظر ہوتا ہے وہ اپنی سرخ رنگت میں جب ہری ڈالیوں کے ساتھ ہوا کے جھونکوں سے نیچے جھکتے اور اوپر اٹھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یاقوتی یعنی لال جھنڈیاں زبرجدی یعنی ہرے نیزوں پر لہرا رہی ہوں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مرکب کی تشبیہ مفرد سے ہو یعنی مشبہ مرکب ہو اور مشبہ بہ مفرد، جیسے ؎

يَا صَاحِبَيَّ تقصيا نظريكما   تريا وجوهَ الأرض كيف تصوَّرُ
ترِيا نهَارًا مُشمِسًا قد شابه   زهرُ الرُّبا فكأنَّمَا هُو مُقْمِرُ

لغات: تقصّی تقصّیا (تفعّل) مسئلہ کی تہ تک پہنچنا النظر بغور دیکھنا، أَشْمَسَ النَّهَارُ إشماسًا (إفعال) دن کا سورج والا ہونا۔ شَابَ يَشُوبُ شَوبًا (ن) ملنا ملانا۔ رُبَا (واحد) رَبْوَة ٹیلہ، اونچی زمین۔ أَقْمَرَ اللَّيْلُ إِقْمَارًا (افعال) چاندنی رات ہونا۔

ترکیب: یا حرف ندا، صاحبيّ منادیٰ، ندابا منادیٰ جملہ انشائیہ، ''تقصیا'' فعل امر ''نظریکما'' مفعول بہ ''تریا'' فعل بافاعل ''وجوہ الأرض'' مفعول بہ۔ ''تریا'' فعل بافاعل ''نهارًا'' موصوف ''مشمسا'' صفت اول ''قد شابه'' فعل ''زهر الرُّبا'' فاعل، فعل بافاعل جملہ خبریہ شدہ صفتِ ثانی، فا برائے تفسیر ''کأنما'' ملغی برائے تشبیہ، هو مبتدا مقمر خبر۔

شعر مذکور میں محل استشہاد دوسرا شعر ہے، شاعر نے دھوپ والے دن کی ہیئت کو جس میں ٹیلوں کے پھول مخلوط ہو گئے ہوں مشبہ بنایا ہے، جو مرکب ہے اور ''المقمر'' (چاندنی رات) کو مشبہ بہ قرار دیا ہے، جو مفرد ہے اور یہی تشبیہ المرکب بالمفرد ہے۔

وَيَنْقَسِمُ بِاعْتِبَارِ الطَّرَفَينِ أَيْضًا إِلٰى مَلْفُوفٍ ومَفْرُوقٍ ، فَالمَلْفُوفُ أَنْ يُؤتٰى بِمُشَبَّهَينِ أَوْ أَكْثَرَ ثُمَّ بِالمُشَبَّهِ بِهَا نحوُ ؎

كَأَنَّ قُلُوبَ الطَّيرِ رَطْبًا وَيَابِسًا　　لَدىٰ وَكْرِهَا العُنَّابُ وَالحَشَفُ البَالِي

فَإِنَّهُ شَبَّهَ الرَّطْبَ الطَّرِيَّ مِنْ قُلُوبِ الطَّيرِ بِالعُنَّابِ واليَابِسِ العَتِيقِ مِنْهَا بِالتَّمَرِ الرَّدِيْ .

وَالمَفْرُوقُ أَنْ يُوتٰى بِمُشَبَّهٍ وَمُشَبَّهٍ بِهِ ثُمَّ آخَرَ وآخَرَ نحوُ ؎

أَلنَّشرُ مِسْكٌ وَالوُجُوهُ دَنَا　　نِيرُ وَأَطْرافُ الأَكُفِّ عَنَمْ

وَإِنْ تَعَدَّدَ المُشَبَّهُ دُونَ المُشَبَّهِ بِهِ سُمِّيَ تَشْبِيهَ التَّسْوِيَةِ نحوُ: ؎

صُدْغُ الحَبِيبِ وحَالِيْ　　كِلاَهُمَا كَاللَّيَالِيْ

وَإِنْ تَعَدَّدَ المُشَبَّهُ بِهِ دُونَ المُشَبَّهِ سُمِّيَ تَشْبِيهَ الجَمْعِ نحوُ ؎

كَأَنَّمَا يَبْسِمُ عَنْ لُؤْلُؤٍ　　مُنَضَّدٍ أَو بَرَدٍ أَوْ أَقَاحِ

ترجمہ: اور تشبیہ طرفین ہی کے اعتبار سے ملفوف اور مفروق کی طرف بھی منقسم ہوتی ہے تو تشبیہ ملفوف یہ ہے کہ (کلام میں) دو مشبہ یا اس سے زائد

لائے جائیں پھران کا مشبہ بہ لایا جائے، جیسے امرء القیس کا شعر کأنَّ الطیر الخ
گویا کہ عقاب کے گھونسلے کے پاس پرندوں کے گرے پڑے تروتازہ اور خشک دل ایسے ہیں گویا وہ عناب اور خشک وردّی خرمے ہوں۔
کیوں کہ شاعر نے تروتازہ پرندوں کے کلیجے کو عناب سے اور پرانے وخشک کلیجے کو معمولی کھجور سے تشبیہ دی ہے۔
اور تشبیہ مفروق یہ ہے کہ کلام مشبہ اور مشبہ بہ لایا جائے پھر دوسرا مشبہ اور دوسرا مشبہ بہ لایا جائے، جیسے کہ شاعر کا شعر النشر مسك الخ ؎
(ان عورتوں کی) خوشبو مشک ہے اور چہرے دینار ہیں اور ان کی ہتھیلیوں کے سرانگشت عنم کے درخت ہیں۔
اور اگر مشبہ متعدد ہو نہ کہ مشبہ بہ تو اسے تشبیہ تسویہ کہتے ہیں، جیسے کہ شاعر کا شعر "صدغ الحبيب الخ" ؎
محبوبہ کی زلف اور میری حالت دونوں (سیاہی میں) راتوں کی طرح ہیں۔
اور اگر مشبہ بہ متعدد ہو مگر مشبہ نہ ہو تو اس کا نام تشبیہ جمع ہے جیسے کہ بحتری کا شعر "كأنما يبسم الخ" ؎
گویا وہ محبوب ایسے صاف وشفاف موتی سے مسکراتا ہے جو تہہ بہ تہہ ملے ہوئے ہیں یا چمک دار اولوں سے یا گلِ بابونہ سے (جو نہایت سفید ہوتا ہے)
تشریح: **وينقسم باعتبار الطرفين:** عبارت بالا میں مصنفینؒ نے طرفین یعنی مشبہ اور مشبہ بہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسموں کو بیان کیا ہے (۱) تشبیہ ملفوف (۲) تشبیہ مفروق، تشبیہ ملفوف کا مطلب یہ ہے کہ پہلے چند مشبہ ذکر کیا جائے اس کے بعد اسی طریقے سے چند مشبہ بہ لایا جائے، جیسے ؎
كأن قلوب الطير رطبا ويابسا لدى وكرها العناب والحشف البالي
لغات: رطبٌ تر۔ رَطَبَ رُطُوبَةً (ن) تر ہونا، یابسٌ خشک، یَبِس

يَيْبَسُ يُبْسًا (س) خشک ہونا۔ وَكْرٌ (ج) أو كارٌ گھونسلا عناب، ایک درخت ہے حشفٌ ردی کھجور بَلِيَ يَبلٰی بلیً (س) بوسیدہ ہونا، پرانا ہونا۔

ترکیب: كأن حرف مشبہ بہ فعل، قلوب الطير ذوالحال، رطباً ويابساً معطوف علیہ ومعطوف حال، ذوالحال با حال اسمِ كأنَّ "لدیٰ و كرها" مرکب اضافی ہوکر مفعول فیہ ہے "وقع" محذوف کا "العُنَابُ والحشف البالي" معطوف علیہ ومعطوف خبرِ كأنّ.

شعر مذکور کے پہلے مصرعہ میں شاعر نے "رَطْبٌ ويَابِسٌ" دومشبہ ذکر کیا ہے اور دونوں کو یکجا کیا ہے اسی طریقے سے دوسرے مصرعہ میں "عُنَّابٌ" اور "الحشف البالي" دومشبہ بہ ذکر کیا ہے یعنی مشبہ اور مشبہ بہ دونوں متعدد ہیں، شاعر نے رطب یعنی تروتازہ پرندے کے کلیجے کو "عناب" سے اور پرانے سوکھے کلیجے کو "الحشف البالي" یعنی معمولی کھجور سے تشبیہ دی ہے۔

شعر مذکور مشہور عربی شاعر امرء القیس کا ہے، اس شعر میں شاعر نے عقاب پرندے کے حال کو بیان کیا ہے کہ عقاب چوں کہ پرندوں کا روزانہ شکار کر کے کھاتا ہے اور دل چھوڑ دیتا ہے تو اس کے گھونسلے کے پاس پڑے ہوئے تازہ سیاہ دل تو عناب کی طرح لگتے ہیں اور پرانے دل سوکھ جانے کی وجہ سے ردی چھوارے کے مانند معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی گولائی اور سرخی میں فرق آجاتا ہے

والمفروق: تشبیہ مفروق کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک مشبہ لایا جائے پھر اس کا مشبہ بہ ذکر کیا جائے اس کے بعد دوسرا مشبہ لایا جائے پھر اس کا مشبہ بہ ذکر کیا جائے، جیسے مرقش الاکبر کا یہ شعر ؎

النشر مسك والوجوه دنا نير وأطراف الأكف عنم

لغات: نشرٌ عمدہ خوشبو، مِسكٌ (ج) مِسَكٌ مشک کستوری، أكف (واحد) كفٌّ ہتھیلی عَنَمٌ (واحد) عَنَمَةٌ ایک درخت ہے جس کے پھول سرخ

اورڈالیاں نرم ونازک ہوتی ہیں۔

ترکیب: النشر مبتدا،مسك خبر،الوجوه مبتدا،دنانیر خبر،أطراف الأکفُ مبتدا،عَنَمٌ خبر۔

شعر مذکور میں پہلے ایک مشبہ "النشر" لایا گیا پھر اس کا مشبہ بہ "مسك" ذکر کیا گیا،اس کے بعد دوسرا مشبہ "الوجوه" لایا گیا پھر اس کا مشبہ بہ "دنانیر" ذکر کیا گیا،اس کے بعد تیسرا مشبہ "أطراف الأکف" لایا گیا اور اس کا مشبہ بہ "عَنَمٌ" ذکر کیا گیا،گویا مشبہ اور مشبہ بہ کو تینوں جگہوں میں ایک ایک کرکے ذکر کیا گیا ہے اور یہی تشبیہ مفروق ہے۔

وإن تعدد المشبه: طرفین میں تعدد کے پائے جانے کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں (۱) تسویہ (۲) جمع۔تشبیہ تسویہ یہ ہے کہ مشبہ متعدد ہو اور مشبہ بہ ایک ہو،جیسے شاعر کا شعر ؎

صدغ الحبیب وحالي كلاهما كالليالي

لغات: صُدغ (ج) أصْدَاغ کنپٹی،کنپٹی کے بال،حبیب (ج) أحباء،دوست۔

ترکیب: "صدغ الحبیب" معطوف علیہ "حالي" معطوف،کلاهما مبتدا "کاللیالي" جار با مجرور مشبهان کے متعلق ہو کر خبر،مبتدا با خبر،خبر مبتدا اول شعر مذکور میں "صدغ" اور "حال" دو چیزیں مشبہ ہیں اور مشبہ بہ "اللیالي" ایک ہی ہے۔اور یہی تشبیہ تسویہ ہے۔

وإن تعدد المشبه به: فرماتے ہیں کہ اگر مشبہ بہ متعدد ہوں اور مشبہ ایک ہو تو اس کا نام تشبیہ جمع ہے،جیسے شاعر کا شعر ؎

كَأنّما یبسم عن لؤلؤ مُنضَّدأو برد أو اقاح

لغات: بسَمَ یَبْسِمُ بَسْمًا (ض) مسکرانا،لؤ لؤ (ج) لآلي موتی

نضّدَ تنْضِيدًا مرتب کرنا۔ بردٌ اولہ، برف کے وہ ٹکڑے جو بارش کے ساتھ گرتے ہیں أقاح (واحد) أقحوانة گل بابونہ۔

ترکیب: کأنّما، ملغی برائے تشبیہ''یبسم'' فعل بافاعل، عن حرف جار ''لؤلؤ مُنضَّد'' موصوف باصفت معطوف علیہ، أو حرف عطف''بردٍ'' معطوف علیہ معطوف أو حرف عطف''أقاح'' معطوف، معطوف علیہ اپنے تمام معطوف سے مل کر مجرور شدہ متعلق بہ''یبسم'' جملہ خبریہ۔

شعر مذکور میں مشبہ ایک ہے اور وہ محذوف ہے، یعنی''الأسنان'' (دانت) اور مشبہ بہ تین ہیں جو شعر میں مذکور ہیں''لؤلؤ ، بردٌ'' اور''أقاحٌ'' دانت کو ان تینوں چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میرے محبوب کے دانت غیر مرتب، بے رونق اور بد بودار نہیں؛ بل کہ موتیوں کی لڑی کی طرح باترتیب، اولے کی طرح صاف وشفاف اور گل بابونہ کی طرح خوشبودار ہیں، مسکراتے وقت کوئی اس کے دانتوں کو دیکھے تو اسے یہ سارے اوصاف نظر آئیں گے۔

وَيَنْقَسِمُ بِاِعْتِبَارِ وَجْهِ الشَّبْهِ إِلٰى تَمْثِيلٍ ، وغَيْرِ تَمْثِيلٍ، فَالتَّمْثِيلُ مَاكَانَ وجهُهُ مُنْتَزَعًا مِنْ مُتَعَدِّدٍ كَتَشْبِيهِ الثُّرَيَّا بِعُنْقُودِ العِنَبِ المُنَوَّرِ ، وَغَيْرُ التَّمْثِيلِ مَالَيسَ كَذٰلِكَ كَتَشْبِيهِ النَّجمِ بِالدِّرْهَمِ .

وَيَنْقَسِمُ بِهٰذَا الاِعْتِبَارِ أَيْضًا إِلٰى مُفَصَّلٍ ومُجْمَلٍ فَالأَوَّلُ مَاذُكِرَ فِيهِ وجْهُ الشَّبْهِ نحوُ ؎

وَثَـغْـرُهُ فِيْ صَفَـاءٍ　　وَأدمُـعِيُ كَـالآلِيْ

وَالثَّانِي مَا لَيسَ كَذٰلكَ نحوُ ''النحوُ فِيْ الكَلامِ كَالمِلْحِ فِيْ الطَّعَامِ''
وَيَنْقَسِمُ بِاِعْتِبَارِ أَدَاتِهِ إِلٰى مُؤَكَّدٍ وَهُوَ مَاحُذِفَتْ أَدَاتُهُ نحوُ ''هُوَ بَحْرٌ فِيْ الجُودِ'' وَمُرْسَلٍ، وَهُوَ مَالَيسَ كَذٰلِكَ نَحوُ ''هُوَ كَالبَحْرِ كَرَمًا''

وَمِنَ الْمُؤَكَّدِ مَاأُضِيفَ فِيهِ الْمُشَبَّهُ بِهِ إِلَى الْمُشَبَّهِ نحوُ ؎

وَالرِّيحُ تَعْبَثُ بِالْغُصُونِ وَقَدْ جرىٰ ذَهَبُ الأَصِيلِ عَلَى لُجَيْنِ الْمَاءِ

ترجمہ: اور تشبیہ وجہ شبہ کے اعتبار سے منقسم ہوتی ہے تمثیل اور غیر تمثیل کی طرف، تو تشبیہ تمثیل وہ تشبیہ ہے جس کی وجہ شبہ متعدد چیزوں سے اخذ کی گئی ہو، جیسے کہ ثریا کی تشبیہ غنچہ دار انگور کے گچھے سے، اور غیر تمثیل وہ تشبیہ ہے جو اس طرح نہ ہو، جیسے کہ ستارے کی تشبیہ درہم سے، اور اسی اعتبار سے تشبیہ کی تقسیم ہوتی ہے مفصل اور مجمل کی طرف، پس اول (تشبیہ مفصل) وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ مذکور ہو، جیسے "وثغره في صفاء" ؎

اس کے دانت اور میرے آنسو صاف وشفاف ہونے میں موتیوں کی طرح ہیں، اور دوسرا (تشبیہ مجمل) وہ تشبیہ ہے جو اس طرح نہ ہو، جیسے "النحو في الكلام كالملح في الطعام" علم نحو کلام میں جیسے نمک طعام میں۔

اور تشبیہ اپنے ادات کے اعتبار سے منقسم ہوتی ہے مؤکد کی طرف، مؤکد وہ تشبیہ ہے جس کے ادات کو حذف کر دیا گیا ہو، جیسے "هو بحر في الجود" وہ سخاوت میں سمندر ہے۔

اور مرسل کی طرف، مرسل وہ تشبیہ ہے جو اس طرح نہ ہو، جیسے "هو كالبحر كرمًا" وہ بخشش میں سمندر کی طرح ہے اور تشبیہ مؤکد میں سے وہ تشبیہ بھی ہے جس میں مشبہ بہ کی اضافت مشبہ کی طرف کی گئی ہو، جیسے "والريح تعبث الخ"

اور ہوا شاخوں سے کھیلتی ہے اس حال میں کہ شام کا سونا (زرد رنگ) پانی کی چاندی (سفیدی) پر بہہ پڑا۔

تشریح: وينقسم باعتبار وجه الشبه حضرات مصنفینؒ نے عبارت بالا میں وجہ شبہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسموں تشبیہ تمثیل اور تشبیہ غیر تمثیل کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ تشبیہ تمثیل اس تشبیہ کو کہتے ہیں جس میں وجہ شبہ کئی چیزوں سے

اخذ کی گئی ہو، جیسے ایک شاعر نے ثریا کو غنچہ دار انگور کے گچھے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا ہے۔

وقد لاح في الصبح الثريا كما ترى كعنقود ملاحيّة حين نورا

اور صبح کے وقت (آخر شب) ثریا ظاہر ہوا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اس طرح جیسے سفید بڑے بڑے انگور کا خوشہ جب وہ غنچہ دار ہو۔

شعر مذکور میں "الثریا" جو چند ستاروں کے مجموعے کا نام ہے جس میں متعدد شکلیں ہیں، مشبہ ہے، اسی طرح "خوشہ" جو مشبہ بہ ہے اس میں بھی سفید انگور کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور پھر ان سب کا "مجموعی طور پر خاص کیفیتوں کے ساتھ ظاہر ہونا" وجہ شبہ ہے جو متعدد چیزوں سے ماخوذ ہے۔

مصنفینؒ نے شعر مذکور کو پیش نہیں کیا ہے البتہ اسی شعر کے مفہوم کو واضح کیا ہے

وغير التمثيل ماليس: غیر تمثیل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہ شبہ متعدد چیزوں سے نہ اخذ کی گئی ہو، جیسے کہ ستارے کو درہم سے تشبیہ دیتے ہوئے کہنا "النجم كالدرهم" ستارہ درہم کی طرح ہے۔

مثال مذکور میں وجہ شبہ سفیدی ہے کیوں کہ چاندی کا درہم بھی سفید اور ستارہ بھی سفید ہوتا ہے اور سفیدی منتزع عن متعدد نہیں ہے، بل کہ صرف ایک چیز سے منتزع ہے۔

وينقسم بهذا الاعتبار: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ وجہ شبہ ہی کے اعتبار سے تشبیہ کی اور بھی دو قسمیں ہیں (۱) مفصل (۲) مجمل، یہ یاد رہے کہ پہلی دو قسمیں انتزاع اور عدم انتزاع کے اعتبار سے تھیں اور دونوں قسمیں وجہ شبہ کے ذکر و حذف کے اعتبار سے ہیں۔

تشبیہ مفصل اس تشبیہ کو کہتے ہیں جس میں وجہ شبہ مذکور ہو، جیسے ؎

وثغره في صفاء وأدمعي كاللآلي

لغات: ثغرٌ (ج) ثُغُورٌ، دانت۔ صَفَا يَصْفُوا صفَاءً (ن) صاف وشفاف ہونا، أدمع (واحد) دَمْعٌ آنسو۔

ترکیب: ثغره معطوف علیہ، واو عاطفہ، أدمعي معطوف، معطوف علیہ با معطوف مبتدا، کاللآلي کاف جارہ لآلي مجرور شدہ متعلق بہ مشابهٌ، في صفاء بھی مشابهٌ سے متعلق ہے صیغۂ صفت بہ ہر دو متعلق خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں "صفاء" وجہ شبہ ہے جو شعر میں مذکور ہے۔

تشبیہ مجمل اس تشبیہ کو کہتے ہیں جس میں وجہ شبہ مذکور نہ ہو، جیسے "النحو في الكلام كالملح في الطعام" مثال مذکور میں وجہ شبہ "الإصلاح و التلذيذ" "اصلاح کرنا اور لذیذ بنانا ہے" جو مثال میں مذکور نہیں ہے۔

وينقسم باعتبار أداته: یہاں سے مصنفینؒ ادات تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی قسمیں بیان فرما رہے ہیں کہ حرف تشبیہ کے اعتبار سے تشبیہ کی دو قسمیں ہیں (۱) تشبیہ مؤکد (۲) تشبیہ مرسل۔

تشبیہ مؤکد وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ محذوف ہو، جیسے "هو بحر في الجود" وہ سخاوت میں سمندر ہے۔

مثال مذکور میں حرف تشبیہ مذکور نہیں ہے اصل میں "هو كالبحر في الجود" ہے وراس تشبیہ کو موکد کا نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ حرف تشبیہ کے حذف کر دینے کی وجہ سے اس میں تاکید پیدا ہوگئی ہے۔

تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرف تشبیہ محذوف نہ ہو بل کہ مذکور ہو جیسے "هو كالبحر في الكرم" وہ سخاوت میں سمندر کی طرح ہے، مثال مذکور میں حرف تشبیہ (کاف) مذکور ہے، اس تشبیہ کو مرسل کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تاکید کا ارسال کر دیا جاتا ہے یعنی وجہ تاکید کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

ومن المؤكد: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ تشبیہ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ مشبہ بہ

کی اضافت مشبہ کی طرف کی جائے، یعنی مشبہ اور مشبہ بہ کو اضافت بیانی کی شکل دے دی جائے کیوں کہ اس سے بھی تاکید حاصل ہوتی ہے، جیسے ۔

والریح تعبث بالغصون وقد جری ذهب الأصیل علی لجین الماء

لغات: عَبِثَ یَعْبَثُ عَبَثًا (س) کھلواڑ کرنا، ذَهَبٌ سونا، أصیلٌ (ج) آصَالٌ عصر ومغرب کے درمیان کا وقت لُجَینٌ چاندی۔

ترکیب: واو مستانفہ، ''الریح'' مبتدا ''تعبث'' فعل، ضمیر مستتر فاعل ذوالحال ''بالغصون'' متعلق بہ تعبث، واو حالیہ ''جری'' فعل ''ذهب الأصیل'' فاعل، علی جارہ ''لجین الماء'' مجرور، جار با مجرور متعلق بہ جری فعل با فاعل ومتعلق جملہ خبریہ شدہ حال، ذوالحال با حال فاعلِ فعل، فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ خبر مبتدا، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''ذهب الأصیل'' اور ''لجین الماء'' دونوں ہیں ''ذهبٌ'' اور ''لجین'' دونوں مشبہ بہ ہیں اور ''الأصیل وماءٌ'' مشبہ ہیں، اور مشبہ بہ کی اضافت مشبہ کی طرف کی گئی ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہے ''الذهب الذي هو کالأصیل في الصفر علی الماء الذي هو کاللجین في البیاض''۔

المَبحَث الثّالث فِي أغرَاضِ التشبِيه

اَلغَرَضُ مِنَ التَّشْبِیهِ إمَّا بَیانُ إمْکانِ الْمُشَبَّهِ نَحْوُ ۔

فَإنْ تَفُقِ الأنَامَ وَأنْتَ مِنْهُمْ فَإنَّ المِسْكَ بَعْضُ دَمِ الغَزَالِ

فَإنَّهُ لَمَّا ادَّعٰی أنَّ المَمْدُوحَ مُبَائِنٌ لِأصْلِهِ بِخَصَائِصَ جَعَلَتْهُ حَقِیقَةً مُنْفَرِدَةً احْتَجَّ عَلٰی إمْکَانِ دَعْوَاهُ بِتَشْبِیهِهِ بِالمِسْكِ الَّذِي أصْلُهُ دَمُ الغَزَالِ.

وَأَمَّا بَيَانُ حَالِهِ كَمَا فِيْ قَوْلِهِ ؎

كَأَنَّكَ شَمْسٌ وَالْمُلُوكَ كَوَاكِبُ إِذَا طَلَعَتْ لَمْ يَبْدُ مِنْهُنَّ كَوْكَبٌ

وَإِمَّا بَيَانُ مِقْدارِ حَالِهِ نحوُ ؎

فِيهَا اثْنَتَانِ وَأَرْبَعُونَ حَلُوبَةٌ سُودًا كَخَافِيَةِ الغُرَابِ الأَسْحَمِ

شَبَّهَ النُّوقَ السُّودَ بِخَافِيَةِ الغُرابِ بَيَانًا لِمِقْدارِ سَوَادِهَا .

وَإِمَّا تَقْرِيْرُ حَالِهِ نحوُ ؎

إِنَّ القُلُوبَ إِذَا تَنَافَرَ وُدُّهَا مَثَلُ الزُّجَاجَةِ كَسْرُهَا لاَيُجْبَرُ

شَبَّهَ تَنَافُرَ القُلُوبِ بِكَسْرِ الزُّجَاجَةِ تَثْبِيتًا لِتَعَذُّرِ عَوْدَتِهَا إِلٰى مَاكَانَتْ عَلَيهِ مِنَ المَوَدَّةِ .

تیسری بحث تشبیہ کے مقاصد کے بیان میں

تشبیہ سے غرض یا تو مشبہ کے امکان کا بیان ہوتا ہے، جیسے "فإن تفق الخ" (اے میرے ممدوح سیف الدولہ) اگر آپ ساری مخلوق پر فائق ہوں حالاں کہ آپ انہی کی جنس سے ہو (تو کوئی ناممکن بات نہیں) کیوں کہ مشک بھی تو ہرن کا کچھ خون ہی تو ہے۔

کیوں کہ شاعر نے جب دعویٰ کیا کہ ممدوح اپنے اصل کے مبائن ہے چند ایسی خصوصیتوں کی وجہ سے جنہوں نے اس کو ایک علیحدہ حقیقت قرار دے دی ہے تو اپنے اس دعوے کو امکان پر استدلال کیا ممدوح کو مشک سے تشبیہ دے کر جس کی اصل ہرن کا خون ہے۔

اور یا تو مشبہ کے حال کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے "کأنك شمس الخ" گویا آپ آفتاب ہیں اور دوسرے بادشاہ ستارے ہیں جب سورج نکلتا ہے تو ان میں سے کوئی ستارہ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

اور یا تو مشبہ کے حال کی مقدار کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسے "فیھا اثنتان الخ" ۔

اس (خاندان) میں بیالیس دودھ دینے والی ایسی کالی کالی اونٹنیاں ہیں، جیسے کالے کلوٹے کوے کے پر۔

شاعر نے کالی اونٹنیوں کو کوے کے پر سے تشبیہ دی ہے اونٹنیوں کی سیاہی کی مقدار بیان کرنے کے لیے۔

اور یا تو مشبہ کے حال کو ثابت نا مقصود ہوتا ہے جیسے إن القلوب الخ ۔

جب دلوں کی محبت نفرت میں بدل جائے تو (وہ دل) اس شیشے کی مانند ہو جاتے ہیں جس کا ٹوٹا جڑ تا نہیں۔

شاعر نے دلوں کی نفرت کو شیشے کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے اس کے لوٹنے کے تعذر کو ثابت کرنے کے لیے سابقہ محبت کی جانب۔

تشریح: دوسری بحث میں اقسام تشبیہ کو بیان کرنے کے بعد اس تیسری بحث میں مصنفینؒ نے اغراض تشبیہ کو بیان کیا ہے کہ تشبیہ کس مقصد کی خاطر لائی جاتی ہے، عبارت مذکورہ میں چار غرض کی مصنفینؒ نے وضاحت فرمائی ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ تشبیہ کے اغراض کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ وہ اغراض جن کا تعلق مشبہ سے ہے۔ ۲۔ وہ اغراض جن کا تعلق مشبہ بہ سے ہے۔

قسم اول کی تعداد بہ نسبت قسم ثانی کے زیادہ ہے اس لیے قسم اول کو بیان کر رہے ہیں۔

(۱) إما بيان إمكان التشبيه: فرماتے ہیں تشبیہ لانے کا مقصد یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ مشبہ کا وجود ممکن ہے، جیسے ۔

فإن تفق الأنام وأنت منهم فإن المسك بعض دم الغزال

لغات: فَاقَ يَفُوقُ فَوقًا (ن) فوقیت لے جانا۔ أَنَامُ، مخلوق۔ دمٌ

(ج) دِمَاءٌ خون۔ غزالٌ (ج) غِزْلَانٌ ہرن۔

ترکیب: فا تفصیلیہ إن حرف شرط، تفق فعل ضمیر فاعل ذوالحال، الأنام مفعول بہ، واو حالیہ أنت مبتدا، منهم ثابتٌ سے متعلق ہوکر خبر، بعدازاں جملہ خبریہ شدہ حال، ذوالحال باحال فاعل، فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ شرط "فلا عَجَبَ فيه" جزا محذوف، شرط باجزا جملہ شرطیہ جزائیہ ہوا، فاتعلیلیہ "إن" حرف مشبہ بہ فعل، المسك اسم بعض مضاف، دم الغزال مرکب اضافی شدہ مضاف الیہ، مضاف با مضاف الیہ خبر إنّ.

یہ شعر شاعر مشہور متنبّی کا ہے، متنبّی نے اپنے ممدوح سیف الدولہ ہمدانی کو ساری مخلوق پر فائق قرار دیا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ سیف الدولہ میں ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں، جن کی وجہ سے وہ دیگر لوگوں سے بالکل منفرد اور جداگانہ ہے، حالاں کہ سیف الدولہ بھی انسان ہی کی جنس سے ہے اور پھر فائق ہونے کے اپنے اس دعوے کو اس طرح ممکن ثابت کیا ہے کہ اس کو مشک سے تشبیہ دے دی کہ جس طرح مشک ہرن کے خون کا ایک جزو ہونے کے باوجود بقیہ خون (جسم) پر فائق ہے اسی طرح آپ بھی انسان میں سے ہونے کے باوجود دیگر انسانوں پر فائق ہیں۔

(۲) وإما بيان حاله: تشبیہ لانے کا دوسرا مقصد مشبہ کا حال بیان کرنا ہوتا ہے، یعنی مخاطب مشبہ کے حال سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کو کسی مشہور چیز سے تشبیہ دے دیتے ہیں تاکہ مشہور مشبہ بہ کے حال سے مشبہ کے حال کو مخاطب بہ آسانی سمجھ لے، جیسے ؎

كأنك شمس والملوك كواكب إذا طلعت لم يبد منهن كوكب

لغات: مُلُوكٌ (واحد) مَلِكٌ بادشاہ۔ طَلَعَ يَطْلُعُ طُلُوعًا نکلنا، بَدَا يَبْدُوْ بُدُوًّا (ن) ظاہر ہونا۔

ترکیب: کأنّ حرف مشبہ بہ فعل، ك معطوف علیہ، واوحرف عطف ''الملوك'' معطوف، معطوف علیہ با معطوف اسم کأنّ'' شمس''معطوف علیہ واو عاطفہ کواکب معطوف، معطوف علیہ با معطوف خبر کأنّ، إذا حرف شرط، ''طلعت'' فعل با فاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ شرط'' لم یبد'' فعل ''منهن'' متعلق بہ لم یبد ''کوکبٌ'' فاعل، فعل با فاعل و متعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ جزا۔

شعر مذکور نابغہ ذبیانی کا ہے اس نے اپنے ممدوح نعمان کو آفتاب سے اور دوسرے بادشاہوں کو ستاروں سے تشبیہ دے کر مشبہ (ممدوح) کا حال بیان کیا ہے کہ جس طرح آفتاب کے سامنے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اسی طرح ممدوح کی سطوت کے سامنے دوسرے بادشاہوں کی سطوت ماند پڑ جاتی ہے۔

(۳) وإما بيان مقدار حاله: تشبیہ لانے کی غرض کبھی یہ ہوتی ہے کہ مشبہ کے حال کی مقدار بیان کر دی جائے یعنی قوت، ضعف، زیادتی اور نقصان کے اعتبار سے مشبہ کی حالت کیسی ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب مخاطب مشبہ کے حال سے تو واقف ہو مگر اس حال کی مقدار سے واقف نہ ہو اور اس کی مقدار معلوم کرنا چاہتا ہو، جیسے

فيها اثنتان وأربعون حلوبة سودا كخافية الغراب الأسحم

لغات: حلوبة دودھ دینے والی (ج) حلائِبُ حَلَبَ يَحْلِبُ حَلْبًا (ن،ض) دودھ دوہنا، سُودٌ، أسوَدُ اسم تفضیل کی جمع ہے، بہت سیاہ۔ خَافِيَةٌ (ج) خَوافِي، پرندوں کے بازو کے نیچے چھپے ہوئے سیاہ پر۔ غُرابٌ (ج) غِربَانٌ کوا۔ ''أسْحَمُ'' اسم تفضیل کا صیغہ ہے سَحِمَ يَسْحَمُ سَحَمًا (س،ن) کالا ہونا۔

ترکیب: فيها جار با مجرور محذوف سے متعلق ہوکر خبر مقدم، اثنتان وأربعون ممیّز، ''حلوبة'' موصوف، سودًا صفت اول، کاف جارہ ''خافية

الغراب الأسحم" مضاف با مضاف الیہ مجرور شدہ متعلق بہ مشابهة، صیغۂ صفت محذوف اپنے متعلق سے مل کر صفت ثانی، موصوف باہر دوصفت تمیز، ممیز باتمیز مبتدا مؤخر۔

شعر مذکور عنقرہ نامی شاعر کا ہے جس میں شاعر نے اپنی محبوبہ کے گھرانے کی مالداری کو بیان کیا ہے کہ میری محبوبہ کے گھرانے کے اونٹ اور اونٹنیوں کو شمار کرنا تو کسی کے بس میں نہیں، البتہ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف دودھاری اونٹنیوں کی تعداد بیالیس ہیں (اونٹ اور غیر دودھاری اونٹنیوں کا ذکر ہی کیا؟) پھر شاعر نے ان کالی اونٹنیوں کو کالے کوے کے پر سے تشبیہ دی ہے جس سے اونٹنیوں کی سیاہی کی مقدار بیان کرنا مقصود ہے کہ اونٹنیاں بہت سیاہ ہیں۔ واضح رہے کہ اونٹ کا رنگ جس قدر سیاہ ہوتا ہے اتنا ہی گراں قیمت اور بہتر ہوتا ہے۔

(۴) وإما تقرير حاله: کبھی تشبیہ کے ذریعہ مشبہ کا حال سامع کے ذہن نشیں کرانا مقصود ہوتا ہے یعنی مشبہ کے حال کو دوسری صورت میں ظاہر کر کے اس طرح بیان کرنا کہ مخاطب کے ذہن میں راسخ ہو جائے، جیسے ؎

إن القلوب إذا تنافر ودها مثل الزجاجة كسرها لايجبر

لغات: تَنَافَرَ تَنَافُرًا (تفاعل) باہم نفرت کرنا۔ وَدَّ يَوَدُّ وُدًّا (س) محبت کرنا۔ كَسَرَ يَكْسِرُ كَسْرًا (ض) توڑنا۔ جَبَرَ يَجْبُرُ جَبْرًا (ن) جوڑنا، درست کرنا۔

ترکیب: إِنَّ حرف مشبہ بہ فعل "القلوب" اسم "مثل الزجاجة" خبر، "کسرها" مبتدا "لايجبر" جملہ خبریہ شدہ خبر، إذا تنافر ودّها فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ شرط، جزا محذوف۔

شعر مذکور میں شاعر نے دل کی نفرت کو شیشے کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے تاکہ مشبہ کا حال خوب ذہن میں جم جائے کہ جس طرح شیشے کا ٹوٹا ہوا نہیں جوڑا

جا سکتا، اسی طریقے سے یہ ٹوٹے ہوئے دل بھی باہم نہیں ملائے جا سکتے گویا دونوں چیزیں محال ہیں۔

وَإِمَّا تَزْيِينُهُ نحوُ ؎

سَوْدَاءُ وَاضِحَةُ الجَبِينِ كَمُقْلَةِ الظَّبْيِ العَزِيزِ

شَبَّهَ سَوَادَهَا بِسَوَادِ مُقْلَةِ الظَّبْيِ تَحْسِينًا لهَا.

وَإِمَّا تَقْبِيْحُهُ نحوُ ؎

وَإِذَا أَشَارَ مُحَدِّثًا فَكَأَنَّهُ قِرْدٌ يُقَهْقِهُ أَوْ عَجُوزٌ تَلْطِمُ

وَقَدْ يَعُودُ الغَرَضُ إِلَى المُشَبَّهِ بِهِ إِذَا عُكِسَ طَرَفَا التَّشْبِيهِ نحوُ ؎

وَبَدَا الصَّبَاحُ كَأَنَّ غُرَّتَهُ وَجْهُ الخَلِيفَةِ حِينَ يُمْتَدَحُ

وَمِثْلُ هٰذَا يُسَمّٰى بِالتَّشْبِيهِ المَقْلُوبِ .

ترجمہ: اور یا تو مشبہ کی تزئین مقصود ہوتی ہے جیسے "سوداء واضحة الخ" ؎

وہ (میری محبوبہ) سیاہ اور روشن پیشانی والی ہے جیسے پیاری ہرن کی آنکھ کا ڈھیلا۔

شاعر نے اس کی سیاہی کو ہرن کی آنکھ کی سیاہی سے تشبیہ دی ہے اس کو حسین بنانے کے لیے۔

اور یا تو مشبہ کی تقبیح مقصود ہوتی ہے، جیسے "وَإِذَا أشار الخ" ؎

اور جب وہ بات کرتے ہوئے اشارہ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بندر ہو جو قہقہہ لگا رہا ہو یا کوئی بڑھیا ہو جو طمانچہ مار رہی ہو۔

اور کبھی غرض مشبہ بہ کی طرف واپس ہوتی ہے، جب تشبیہ کے دونوں طرف الٹ دیئے جائیں، جیسے "وَبَدَا الصَّبَاحُ" ؎

اور صبح ظاہر ہوئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روشنی بادشاہ کا چہرہ ہو جب ان کی مدح کی جائے۔

اور اس جیسی تشبیہ کو "تشبیہ مقلوب" کہتے ہیں۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں حضرات مصنفینؒ نے اغراض تشبیہ کی وضاحت کرتے ہوئے مزید دو غرضوں کی وضاحت فرمائی ہے، چناں چہ فرمایا:

(۵) وإما تزيينه: یعنی تشبیہ کا پانچواں مقصد یہ ہوتا ہے کہ مشبہ کو مزین اور خوب صورت بنا کر پیش کیا جائے تا کہ اس کی طرف لوگوں کی رغبت اور میلان ہو، جیسے ؎

سوداء واضحة الجبين كمقلة الظبي العزيز

لغات: وَضَحَ يَضِحُ وُضُوحًا (ض) واضح ہونا، ظاہر ہونا، جِبِينٌ (ج) أَجْبُنٌ پیشانی۔ مُقْلَةٌ (ج) مُقَلٌ آنکھ کا ڈھیلا۔ ظبي (ج) ظِبَاءٌ ہرن۔

ترکیب: هي مبتدا محذوف، ''سوداء'' خبر اول ''واضحة الجبين'' خبر ثانی، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ ''مثاله'' مبتدا محذوف کاف جارہ ''مقلة'' مضاف ''الظبي العزيز'' مرکب توصیفی ہو کر مضاف الیہ بعد ازاں مجرور شدہ متعلق بہ مشابهة ''مشابهة'' صیغہ صفت اپنے متعلق سے مل کر خبر۔

شعر مذکور میں شاعر نے محبوبہ کے رنگ کو ہرن کی آنکھ کے ڈھیلے سے تشبیہ دے کر یہ بتانا چاہا ہے کہ جس طریقے سے ہرنی کی آنکھ کا ڈھیلا گول اور سیاہ ہے اسی طریقے سے میری محبوبہ کا چہرہ بھی گول اور سیاہ ہے اور اس سے مقصود اس کی خوب صورتی کو بیان کرنا ہے۔

(۶) وإما تقبيحه: کبھی تشبیہ کا مقصد مشبہ کو بدصورت اور کریہہ بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے تا کہ لوگ اس سے نفرت کریں، جیسے شاعر کا شعر ؎

وإذا أشار محدثًا فكأنهُ قرد يقهقه أو عجوز تلطم

لغات: أَشَارَ إشارةً اشارہ کرنا۔ حَدَّثَ تَحْدِيثًا بیان کرنا۔ قِرْدٌ (ج) أقرادٌ بندر۔ قَهْقَهَ يُقَهْقِهُ قَهْقَهَةً (فعللة) قہقہہ لگانا، زور سے ہنسنا۔ عَجُوزٌ (ج) عَجائِزُ بڑھیا، لَطَمَ لَطْمًا (ض) طمانچہ مارنا۔

ترکیب: واومستانفہ ''اشار'' فعل، ضمیر ذوالحال ''محدثًا'' حال، ذوالحال باحال فاعل، فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ شدہ شرط، فاجزائیہ ''کأنّ'' حرف مشبہ بہ فعل، ہٗ اسم ''قردٌ'' موصوف ''یقهقه'' جملہ صفت، موصوف باصفت معطوف علیہ، أو عاطفہ ''عجوز تلطم'' معطوف شدہ خبرِ کأنّ، فعل ناقص بااسم وخبر جملہ خبریہ شدہ جزا، شرط باجزا جملہ شرطیہ جزائیہ۔

شعر مذکور میں شاعر متنبی نے اپنے مہجو (جس کی ہجو کی جائے، مراد اسحاق بن ابراہیم اعور) کو ایک خاص بندر سے جو قہقہہ لگا رہا ہو، اور اس بڑھیا سے تشبیہ دی ہے جو طمانچہ مار رہی ہو، اور مقصد یہ بتانا ہے کہ وہ نہایت ہی بدصورت اور کریہہ المنظر ہوتا ہے۔ جب بات کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسحاق بن ابراہیم کے زبان میں لکنت تھی اور لکنت والے آدمی کو بولنے میں پریشانی ہوتی ہے جو اس کے ہاتھ اور آنکھ وغیرہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

وقد یعود الغرض: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ تشبیہ کی ایک صورت یہ ہے کہ طرفین تشبیہ کو الٹ دیا جائے، یعنی مشبہ کو مشبہ بہ اور مشبہ بہ کو مشبہ بنا دیا جائے، اس جیسی تشبیہ کو ''تشبیہ مقلوب'' اور ''تشبیہ معکوس'' بھی کہتے ہیں، جیسے

وبدا الصباح کأن غرته وجه الخلیفة حین یمتدح

لغات: غرّةٌ (ج) غُرَرٌ چمک، امتدح امتداحاً (افتعال) تعریف کرنا

ترکیب: واومستانفہ ''بدا الصباح'' فعل بافاعل جملہ فعلیہ خبریہ، کأن حرف مشبہ بہ فعل ''غرّته'' اس کا اسم ''وجه الخلیفة'' خبر۔

شعر مذکور محمد بن وہیب حمیری کا ہے، جو اس نے خلیفہ مامون رشید کی مدح میں کہا ہے، شاعر نے ''وجہ الخلیفہ'' کو جو حقیقت میں ''مشبہ'' تھا ''مشبہ بہ'' بنا دیا اور ''غرّة'' جو ''مشبہ بہ'' تھا اس کو ''مشبہ'' بنا دیا اور اسی کا نام ''تشبیہ مقلوب'' ہے، یعنی خلیفہ کے چہرے کو صبح کی روشنی سے تشبیہ دینا چاہئے، مگر شاعر نے صبح کی روشنی

کو خلیفہ کے چہرے سے تشبیہ دی ہے، یہ وہ آخری غرض ہے جس کا تعلق مشبہ بہ سے ہے، بقیہ تمام اغراض کا تعلق مشبہ سے ہے۔

المجاز

هُوَ اللَّفْظُ الْمُسْتَعْمَلُ فِيْ غَيرِ مَاوُضِعَ لَهُ لِعَلاقَةٍ مَعَ قَرِيْنَةٍ مَانِعَةٍ مِنْ إرادَةِ المَعْنى السَّابِقِ كَالدُّرَرِ الْمُسْتَعْمَلَةِ فِيْ الكَلِمَاتِ الفَصِيحَةِ فِيْ قَولِكَ "فُلانٌ يَتَكَلَّمُ بِالدُّرَرِ" فَإنَّها مُسْتَعْمَلَةٌ فِيْ غَيْرِ مَاوُضِعَتْ لَهُ إذْقَدْ وُضِعَتْ فِيْ الأَصْلِ لِلّآلِيْ الحَقِيْقِيَّةِ ، ثُمَّ نُقِلَتْ إلى كَلِمَاتِ الفَصِيحَةِ لِعَلاَقَةِ الْمُشَابَهَةِ بينَهُمَا فِيْ الحُسْنِ ، وَالَّذِيْ يَمْنَعُ مِنْ إرادَةِ المَعْنَى الحَقِيْقِيِّ قَرِيْنَةُ "يَتَكَلَّمُ" وَ كَالأَصَابِعِ الْمُسْتَعْمَلَةِ فِي الأنامِلِ فِي قَوْلِهِ تعالٰى: "يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِمْ" فَإنَّها مُسْتَعْمَلَةٌ فِيْ غَيرِ مَاوُضِعَتْ لَهُ لِعَلاَقَةِ أَنَّ الأَنْمِلَةَ جُزْءٌ مِنَ الإِصْبَعِ ، فَاسْتُعْمِلَ الكُلُّ فِيْ الجُزْءِ وقَرِيْنَةُ ذٰلِكَ أَنَّهُ لَا يُمْكِنُ جَعْلُ الأَصَابِعِ بِتَمَامِهَا فِيْ الآذَانِ .

وَالمَجَازُ إنْ كَانَتْ عَلاَقَتُهُ الْمُشَابَهَةَ بَيْنَ المَعْنَى المَجَازِيِّ وَالمَعْنَى الحَقِيْقِيِّ كَمَا فِيْ المِثَالِ الأَوَّلِ يُسَمّٰى إسْتِعَارَةً، وَإلَّا فَمَجَازٌ مُرْسَلٌ كَما فِيْ المِثَالِ الثَّانِيْ .

مجاز

وہ ایسا لفظ ہے جس کو اس معنی کے علاوہ میں استعمال کیا جائے جس کے لیے اس کو وضع کیا گیا ہے کسی تعلق کی وجہ سے، کسی ایسے قرینے کے پائے جانے کے ساتھ جو معنیٰ سابق کے مراد لینے سے مانع ہو، جیسے لفظ "درر" جس کو استعمال کیا گیا ہے کلمات فصیحہ کے معنی میں تمہارے قول "فلان يتكلم بالدرر" میں،
17 کیوں کہ یہ غیر معنی موضوع لہٗ میں مستعمل ہے اس لیے کہ اصل میں یہ لفظ حقیقی

موتیوں کے لیے وضع کیا گیا ہے پھر فصیح کلمات کی طرف منتقل کر لیا گیا، خوب صورتی میں ان دونوں کے درمیان مشابہت کے تعلق کی وجہ سے، اور وہ چیز جو معنیٰ حقیقی کے مراد لینے سے مانع ہے "یتکلم" کا قرینہ ہے، اور جیسے کہ لفظ "أصابع" جس کو استعمال کیا گیا ہے "أنامل" کے معنی میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرمان "یجعلون أصابعهم فی آذانهم" میں، وہ لوگ اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں، کیوں کہ یہ بھی معنی غیر موضوع لہ میں مستعمل ہے اس تعلق کی وجہ سے کہ "أنملة" (سرانگشت) اصبع کا جز ہے پس کل جز کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ تمام انگلیوں کا کانوں میں ڈالنا ناممکن ہے۔

اور مجاز اگر اس کا رابطہ معنیٰ مجازی اور معنیٰ حقیقی کے درمیان مشابہت ہو جیسا کہ مثال اول میں تو اسے استعارہ کہتے ہیں، ورنہ تو وہ مجاز مرسل ہے جیسے کہ مثال ثانی میں۔

تشریح: علم بیان کے آغاز میں بات آچکی ہے کہ علم بیان وہ علم ہے جس میں تشبیہ مجاز اور کنایہ کے متعلق بحث کی جائے یعنی مافی الضمیر کی ادائے گی کے یہ تین طریقے ہیں جن میں سے تشبیہ کا بیان گذر چکا، اور اب دوسرے طریقے مجاز کی بحث کا آغاز فرما رہے ہیں، عبارت مذکورہ میں مصنفینؒ نے مجاز اور اس کی دو قسموں (استعارہ و مجاز مرسل) کی وضاحت فرمائی ہے، مجاز کی تعریف جاننے سے پہلے یہ جان لینا مناسب ہوگا کہ مجاز حقیقت کے بالمقابل ہے، اور حقیقت وہ کلمہ ہے جو معنیٰ موضوع لہ میں استعمال کیا جائے، یعنی لفظ بول کر اگر معنیٰ موضوع لہٗ مراد ہو تو وہ حقیقت ہے۔ حقیقت کی تعریف سمجھ لینے کے بعد سمجھئے کہ مجاز وہ لفظ ہے جو معنیٰ غیر موضوع لہٗ میں استعمال کیا جائے "لعلاقة" کہہ کر مصنفینؒ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مجاز کے لیے ضروری ہے کہ معنیٰ موضوع لہ (معنیٰ حقیقی) اور معنیٰ غیر موضوع لہ (معنیٰ مجازی) کے درمیان کوئی علاقہ اور تعلق ہو، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں کوئی

ایسا قرینہ بھی پایا جائے جو معنیٰ حقیقی مراد لینے سے مانع ہو، جیسے "فلان يتكلم بالدرر" فلاں کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں۔

مثال مذکور میں "درر" اپنے معنیٰ موضوع لہ (معنیٰ حقیقی) میں مستعمل نہیں ہے بل کہ کلماتِ فصیحہ اور عمدہ ودلچسپ باتوں وشیریں گفتاری کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو کہ معنیٰ مجازی ہے اس لیے کہ "درر" کا معنیٰ تو "موتیاں" ہے، اور معنیٰ حقیقی ومعنیٰ مجازی کے درمیان علاقہ مشابہت کا ہے، اس طور پر کہ جس طریقے سے موتی میں حسن ہوا کرتا ہے اسی طریقے سے شیریں گفتگو میں بھی حسن پایا جاتا ہے۔

والذي يمنع: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ وہ قرینہ جو معنیٰ حقیقی مراد لینے سے مانع ہے یہ ہے کہ مثال میں لفظ "يتكلم" موجود ہے جو یہ واضح کررہا ہے کہ اس سے مراد "موتیاں" نہیں بل کہ شیریں گفتگو ہے اس لیے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ منہ سے موتیاں نہیں بل کہ باتیں نکلتی ہیں۔

وكالأصابع المستعملة الخ: یہاں مصنفینؒ مجاز کی ایک دوسری مثال سے وضاحت فرمارہے ہیں، جس کی توضیح یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے فرمان "يجعلون أصابعهم في آذانهم" وہ لوگ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔ میں لفظ اصابع اپنے معنیٰ موضوع لہ "انگلیاں" میں مستعمل نہیں بل کہ "أنامل" (سرانگشت، پوروے) کے معنیٰ میں مستعمل ہے جو معنیٰ مجازی اور غیر موضوع لہ ہے، اور دونوں کے درمیان علاقہ کلیت اور جزئیت ہے، اس لیے کہ "پوروا" انگلی کا جز ہے، اور معنیٰ حقیقی مراد نہ لینے کا قرینہ یہ ہے کہ تمام انگلیوں کا کانوں میں ڈالنا ممکن نہیں ہے۔

والمجاز ان كانت: ماقبل میں مصنفین یہ بیان فرماچکے ہیں کہ معنیٰ مجازی مراد لینے کے لیے ضروری ہے کہ معنیٰ حقیقی اور معنیٰ مجازی کے درمیان کوئی علاقہ اور تعلق ہو، اب یہاں سے علاقے کے اعتبار سے مجاز کی دو قسمیں بیان

کررہے ہیں، فرماتے ہیں "والمجاز إن كانت علاقته المشابهة الخ" یعنی اگر معنیٔ حقیقی اور معنیٔ مجازی کے درمیان مشابہت کا علاقہ ہوتو اس مجاز کا نام استعارہ ہے اور اگر علاقۂ تشبیہ نہ ہو؛ بل کہ کوئی اور علاقہ ہوتو اس مجاز کا نام مجازِ مرسل ہے، پہلی مثال استعارہ کی ہے اور دوسری مجاز مرسل کی۔

خلاصہ گویا یہ ہوا کہ استعارہ وہ مجاز ہے جس میں تشبیہ کا علاقہ ہو اور مجازِ مرسل وہ مجاز ہے جس میں علاقۂ تشبیہ کے علاوہ کوئی دوسرا علاقہ ہو (مثلاً علاقۂ مسببیت یا علاقۂ سببیت یا علاقۂ جزئیت وکلیت یا علاقۂ لزوم وغیرہ) یعنی مسبب بول کر سبب مراد لیا جائے، یا سبب بول کر مسبب مراد لیا جائے یا جز بول کر کل یا کل بول کر جز مراد لیا جائے وغیرہ۔

اَلاستِعَارَةُ

اَلاستِعَارَةُ هِيَ مجَازٌ علاقَتُهُ المَشَابَهَةُ كَقَولِهِ تعالىٰ "كِتابٌ أنزَلنَاهُ إلَيكَ لِتُخرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إلَى النُّورِ" أيْ مِنَ الضَّلَالِ إلَى الهُدىٰ؛ فَقَدِ اسْتُعْمِلَتِ الظُّلُمَاتُ والنُّورُ فِيْ غيرِ معْنَاهُمَا الحَقِيْقِيِّ، وَالعِلاقَةُ المُشَابَهَةُ بَينَ الضَّلالِ والظَّلامِ والهُدىٰ والنُّورِ. والقَرِينَةُ مَاقبلَ ذٰلِكَ، وَأَصلُ الاستِعَارَةِ تشْبِيهٌ حُذِفَ أَحَدُ طَرَفَيهِ ووَجْهُ شِبْهِهِ وَأَدَاتُهُ.

وَالمُشَبَّهُ يُسَمّٰى مُسْتَعارًا لَهُ وَالمُشَبَّهُ بِهِ مُسْتَعارًا مِنْهُ. فَفِيْ هٰذا المِثَالِ المُسْتَعَارُ لَهُ هُوَ الضَّلالُ وَالهُدىٰ، وَالمُسْتَعارُ مِنْهُ هُوَ مَعْنَى الظَّلامِ والنُّورِ، ولَفْظُ الظُّلُمَاتِ والنُّورِ يُسَمّٰى مُسْتَعَارًا.

استعارہ

استعارہ وہ مجاز ہے جس کا علاقہ مشابہت ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا قول "كتاب انزلناه إليك لتخرج الناس من الظلمٰت إلى النور" یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی

کی طرف نکالیں۔ یعنی گمراہی سے ہدایت کی طرف تو ظلمات اور نور کو ان کے معنیٰ حقیقی کے علاوہ میں استعمال کیا گیا ہے اور "ضلال و ظلام" اور "ھدیٰ و نور" کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہے، اور قرینہ ماقبل یعنی لفظ کتاب ہے، اور استعارہ کی اصل وہ تشبیہ ہے جس کے دو طرف میں سے کسی ایک کو حذف کر دیا گیا ہو اور وجہ شبہ اور ادات شبہ کو بھی حذف کر دیا گیا ہو، مشبہ کو مستعار لہ اور مشبہ بہ کو مستعار منہ کہتے ہیں تو اس مثال میں مستعار لہ وہ "ضلال" اور "ھدی" ہے اور مستعار منہ وہ "ظلام" اور "نور" کا معنیٰ ہے، اور لفظ "ظلمات" اور "نور" کا نام مستعار رکھا جاتا ہے۔

تشریح: مجاز ہی کے بیان میں مصنفینؒ نے استعارہ کے بارے میں کچھ بیان کیا تھا اب یہاں سے استعارہ کی مکمل وضاحت فرما رہے ہیں کہ استعارہ وہ مجاز ہے جس میں تشبیہ کا علاقہ ہو، اور معنیٰ مجازی مراد لیتے وقت معنیٰ حقیقی مراد نہ لیے جانے پر کوئی قرینہ بھی موجود ہو، جیسے "کتابٌ أنزلناه إلیك لتخرج الناس من الظلمٰت إلی النور"

آیت مذکورہ میں "ظلمات" (تاریکیوں) سے مراد "ضلال" (گمراہی) ہے اور "نور" (روشنی) سے مراد "ہدایت" ہے جو کہ اس کا اصلی معنیٰ نہیں ہے بل کہ مجازی ہے، لیکن معنیٰ حقیقی اور معنیٰ مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہے، بایں طور کہ جس طریقے سے نور سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے اسی طریقے سے ایمان سے بھی ہدایت ملتی ہے اور جس طریقے سے "ظلمات" یعنی تاریکیوں سے رہنمائی حاصل نہیں ہو پاتی، اسی طرح ضلال یعنی گمراہی میں بھی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی، اس لیے "ضلال" کو "ظلمات" سے اور "ھدایت" کو "نور" سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہی استعارہ ہے۔

والقرینة ماقبل ذلك: فرماتے ہیں کہ معنیٰ حقیقی کو مراد لینے سے روکنے

والی چیز "من الظلمات إلی النور" سے پہلے کا ٹکڑا "کتاب انزلناہ" ہے اس لیے کہ کتاب کے ذریعہ ظاہری تاریکی سے روشنی کی طرف نکالا جائے ایسا نہیں ہوتا ہے یعنی اس معنی مین کتب مشہور و معروف بل کہ مقصود ہی نہیں ہے، ہاں یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے ذریعہ لوگ راہ یاب ہوجائیں یعنی کتاب کے لیے کفر وضلالت سے نکال کر ایمان وہدایت کے راستے پر گامزن کرنے کا معنی بالکل صادق ہے۔

وأصل الاستعارۃ : فرماتے ہیں کہ اصل استعارہ تو یہ ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں سے کسی ایک کو حذف کردیا جائے، اسی طرح وجہ شبہ اور حرف تشبیہ کو حذف کردیا جائے تاکہ جنس مشبہ بہ میں مشبہ کے دخول کا دعویٰ صحیح ہوجائے، استعارہ کے اس اصل کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

والمشبہ یسمی مستعارًا: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ استعارہ میں مشبہ کو "مستعارلہٗ" اور مشبہ بہ کو "مستعار منہ" کہتے ہیں، اسی طریقے سے وجہ شبہ کو "وجہ جامع" اور جس لفظ کے ذریعہ استعارہ کیا جائے یعنی جس لفظ کو معنیٔ حقیقی سے معنیٔ مجازی کی طرف منتقل کیا گیا ہو، اس کو "مستعار" کہتے ہیں مگر آخر کے دونوں کی تفصیل مصنفین نے نہیں بیان کی ہے۔

لہٰذا مثالِ مذکور میں "ضلال" اور "ھدی" مستعارلہ ہیں اور "ظلام" اور "نور" کے معنی مستعار منہ ہیں اور لفظ "الظلمات" اور "النور" مستعار ہیں۔

وَتَنْقَسِمُ الاِسْتِعَارَۃُ إِلٰی مُصَرَّحَۃٍ وَھِيَ مَاصُرِّحَ فِیْھَا بِلَفْظِ المُشَبَّہِ بِہٖ، کَمَا فِي قَوْلِہٖ ؎

فَأَمطَرَتْ لُؤْلُؤًا مِنْ نَرْجِسٍ وَسَقَتْ
وَرْدًا وعَضَّتْ علَی العُنَّابِ بالبَرَدِ

فَقَدْ اِسْتَعَارَ اللؤْلُؤَ وَالنَّرْجِسَ والوَرْدَ والعُنَّابَ والبَرَدَ للدُّمُوعِ

وَالعُيُونِ والخُدُودِ والأَنَامِلِ والأسْنَانِ .

وَإِلَى مَكْنِيَّةٍ وَهِيَ مَاحُذِفَ فِيهِ المُشَبَّهُ بِهِ ورُمِزَ إِلَيهِ بِشَيْءٍ مِنْ لَوَازِمِهِ كَقَولِهِ تعالى "واخفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ" فَقَدْ اِسْتَعَارَ الطَّائِرَ للذُّلِّ ثُمَّ حَذَفَهُ وَدَلَّ عَلَيهِ بِشَيْءٍ مِنْ لَوَازِمِهِ وهو الجناحُ، وإثباتُ الجَنَاحِ للذُّلِّ يُسَمُّونَهُ إِسْتِعَارَةً تَخْيِيلِيَّةً .

ترجمہ: اور استعارہ منقسم ہوتا ہے مصرحہ کی طرف، اور وہ ایسا استعارہ ہے جس میں لفظ مشبہ بہ کی تصریح کی گئی ہو، جیسے کہ شاعر کے شعر میں "فأمطرت لؤلؤاً الخ" چناں چہ اس نے (معشوقہ نے) نرگس (آنکھ) سے موتی برسائے اور گلاب (رخسار) کو پلایا اور عناب (پوروں) کو اولے (دانت) سے کاٹا۔

تو شاعر نے موتی، نرگس، گلاب، عناب اور اولے کا استعارہ کیا ہے آنسو، آنکھ، گال، انگلیوں کے پورے اور دانتوں کے لیے۔

اور استعارہ منقسم ہوتا ہے مکنیہ کی طرف، اور وہ ایسا استعارہ ہے جس میں مشبہ بہ کو حذف کر دیا گیا ہو، اور مشبہ بہ کی طرف اس کے لوازم میں سے کسی چیز کے ذریعے اشارہ کر دیا گیا ہو، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "واخفض لهما جناح الذل من الرحمة" اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا، چناں چہ اس میں "طائر" کا استعارہ ہے "ذُلّ" (عاجزی) کے لیے، پھر اسے (مشبہ بہ کو) حذف کر دیا اور اس پر مشبہ بہ کے لوازم میں سے ایک شئ سے دلالت کی گئی اور وہ "جناح" ہے اور "جناح" کو "ذل" کے لیے ثابت کرنے کو استعارۂ تخییلیہ کہیں گے۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفین نے طرفین (مستعار لہ اور مستعار منہ) کے ذکر کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں (۱) استعارہ مصرحہ (۲) استعار مکنیہ۔

مصرحہ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار منہ (مشبہ بہ) صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو، جیسے ؎

فأمطرت لؤلؤاً من نرجس وسقت

ورداً وعضت علی العناب بالبرد

لغات: أمطر إمطارًا بارش برسانا۔ نرجِسٌ (واحد) نرجِسَةٌ نرگس۔ عضّ یعَضُّ عضًا (س) کاٹنا۔

ترکیب: فا تفصیلیہ ''أمطرت'' فعل بافاعل ''لؤلؤاً'' مفعول بہ ''من نرجس'' جار بامجرور متعلق بہ أمطرت، فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ فعلیہ خبریہ شدہ معطوف علیہ۔ ''سقت ورداً'' فعل بافاعل ومفعول جملہ شدہ معطوف علیہ معطوف ''عضت'' فعل بافاعل ''علی العناب'' متعلق اول ''بالبرد'' متعلق ثانی، جملہ معطوف، معطوف علیہ باجمیع معطوفات جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں موتی، نرگس، گلاب، عناب اور اولے مستعار منہ (مشبہ بہ) ہیں جو صراحتاً مذکور ہیں اور یہی الفاظ اس شعر میں محل استشہاد ہیں، اور آنسو، آنکھ، گال، انگلیوں کے پورے اور دانت مستعار لہ (مشبہ) ہیں، شاعر نے آنسوؤں کو موتی سے، آنکھ کو نرگس کے پھول سے، رخسار کو گلاب کے پھول سے، انگلیوں کو عناب سے اور خوب صورت چمک دار دانت کو اولے سے تشبیہ دی ہے، اور شاعر نے جن الفاظ کو مشبہ بہ بنایا ہے شعر میں صراحت کے ساتھ ان کو بیان کر دیا ہے۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ میری محبوبہ کی آنکھوں سے نکلے ہوئے اشک ضائع نہیں ہوتے بلکہ نیچے اترتے ہوئے گلاب جیسے رخسار کو سیراب کر دیتے ہیں، اور افسوس میں جب وہ اپنی انگلی دانتوں میں دباتی ہے تو مہندی رچی ہوئی وہ سرخ انگلیاں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے عناب کا سرخ پھل ہو اور دانتوں کا تو ذکر ہی کیا! وہ تو بس اولے کی طرح صاف وشفاف نظر آتا ہے۔

استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے جس میں مستعار منہ (مشبہ بہ) کو ذکر نہ کیا گیا ہو مگر مستعار منہ کے لوازم اور خصوصیات میں سے کوئی چیز مستعار لہٗ (مشبہ جو کہ مذکور ہے) کے لیے اشارۃً ذکر کر دی گئی ہو، جیسے ''وَاخْفِضْ لَهُمَا جناحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحمَةِ''۔

آیت مذکورہ میں ''طائر'' مشبہ بہ مستعار منہ ہے، جس کو حذف کر دیا گیا ہے اور ''الذل'' مشبہ ''مستعار لہٗ'' ہے جو مذکور ہے، اور مشبہ بہ ''طائر'' کے خصوصیات ولوازم میں سے ''جناح'' (بازو) ہے جس کو ذکر کیا گیا ہے اور مستعار لہ ''الذل'' کے لیے ''جناح'' یعنی مستعار منہ کی خصوصیت کو ثابت کرنا استعارہ تخیلیہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ استعارہ مکنیہ وہ استعارہ ہے کہ متکلم ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اپنے دل ہی میں تشبیہ دے لے، اور ارکان تشبیہ میں سے سوائے مشبہ ''مستعار لہٗ'' کے کچھ اور ذکر نہ کرے، البتہ مشبہ بہ کے لوازم میں سے کسی لازم کو ذکر کر کے مشبہ بہ کی جانب اشارہ کر دے، جیسے کہ مثال مذکور میں ''جناح'' کو ذکر کر کے مشبہ بہ یعنی طائر کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور اگر مشبہ بہ کے لازم کی جانب صرف اشارہ ہی نہ کیا جائے بل کہ اس لازم کو مشبہ کے ساتھ ثابت بھی کر دیا جائے تو وہ استعارہ تخیلیہ ہو جائے گا جیسے کہ آیت کریمہ میں جناح کو ''ذل'' کے ساتھ ثابت بھی کیا گیا ہے، بایں طور کہ اضافت کے ساتھ ''جناح الذل'' کہا گیا ہے: اس لیے اب یہ استعارہ تخیلیہ ہو گیا۔

وتنقسمُ الاستعارةُ إلى أصليةٍ وَ هي ماكانَ فِيهَا المُستعارُ إسمًا غير مُشتقٍ كاستعارة الظَّلام للضَّلالِ والنُّورِ للهُدى، وإلى تبعيَّةٍ وهِيَ مَاكانَ فِيهَا المُستعارُ فِعلاً أو حرفًا أو إسمًا مُشتقًّا نحوُ "فُلانٌ رَكِبَ كتِفي غرِيمِه" أي لازمهُ مُلازمَةً شَدِيدَةً وقولهِ تعالى "أُولئِكَ على هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ" أي تمكَّنُوا مِنَ الحُصُولِ على الهِدايَةِ التَّامَّةِ ونحوُ قوله ؎

وَلَئِنْ نَطَقْتُ بِشُكْرِ بِرِّكَ مُفْصِحًا
فَلِسَانُ حَالِي بِالشِّكَايَةِ أَنْطَقُ

وَنحوُ "أَذَقْتُهُ لِبَاسَ المَوتِ" أَيْ أَلْبَسْتُهُ إِيَّاهُ.

ترجمہ: اور استعارہ منقسم ہوتا ہے اصلیہ کی طرف اور وہ ایسا استعارہ ہے جس میں مستعار اسم مشتق نہ ہو، جیسے کہ ظلام کا استعارہ ضلال کے لیے اور نور کا استعارہ ہدایت کے لیے۔ اور (منقسم ہوتا ہے) تبعیہ کی طرف، اور وہ ایسا استعارہ ہے جس میں مستعار فعل یا حرف یا اسم مشتق ہو، جیسے "فلان رکب کتفي غریمه" فلاں شخص اپنے قرض دار کے کندھوں پر سوار ہوگیا، یعنی اس کے ساتھ سختی سے چمٹ گیا، اور جیسے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان "اولئك علی هدی من ربهم" وہ لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ہدایت پر ہیں یعنی وہ لوگ مکمل ہدایت حاصل کرنے پر متمکن وفائز ہوگئے، اور جیسے کہ شاعر کا شعر "ولئن نطقت الخ" ؎

اور اگر میں کھل کر تیرے احسان کے شکر میں گویا ہوں (تب بھی لاحاصل ہے) کیوں کہ میری زبانِ حال شکایت کے ساتھ زیادہ ناطق ہے۔

اور جیسے "أذقته لباس الموت" میں نے اس کو موت کا مزہ چکھادیا، یعنی اس کو وہ چیز پہنادی۔

تشریح: عبارت بالا میں لفظ مستعار کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) استعارہ اصلیہ (۲) استعارہ تبعیہ، اور ان دونوں قسموں کی مثال سے وضاحت کی گئی ہے، چناں چہ فرمایا کہ: استعارہ اصلیہ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار اسم جنس ہو، اسم مشتق نہ ہو، جیسے "ظلام" (تاریکی) کا استعارہ "ضلال" (گمراہی) کے لیے اور "نور" (روشنی) کا استعارہ "ہدی" (ہدایت) کے لیے، کیوں کہ "ظلام" اور "نور" دونوں مستعار ہیں اور اسم جنس ہیں

اور ضلال اور ہدیٰ مستعار لہٗ ہیں۔

استعارہ تبعیہ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار فعل یا حرف یا اسم مشتق ہو، جیسے "فَلانٌ رَكِبَ كَتِفَي غَرِيمِهِ أي لازَمَهُ مُلازَمَةً شَدِيدَةً" اس مثال میں "رکب" مستعار ہے جو فعل ہے اور "ملازمة" (چمٹ جانا، پیچھے پڑ جانا) مستعار لہٗ ہے یعنی قرض دار کے پیچھے پڑ جانے کو تشبیہ دی گئی ہے اس کے کندھے پر سوار ہونے سے، اور وجہ جامع دونوں کے درمیان یہ ہے کہ جس طرح سوار سواری پر اپنی پکڑ مضبوطی سے جمائے رکھتا ہے اسی طریقے سے قرض خواہ نے قرض دار پر اپنی گرفت جما رکھی ہے۔

اور مستعار حرف ہو، جیسے "أولئك على هدى من ربهم، أي تمكنوا من الحصول على الهداية التامة" آیت کریمہ میں "على" مستعار ہے جو حرف ہے اور "التمكن من الحصول على الهداية" (ہدایت کے حصول پر متمکن ہو جانا) مستعار لہٗ (مشبہ) ہے یعنی مہدی اور ہدیٰ کے درمیان مطلق ارتباط کو تشبیہ دی گئی ہے مستعلی اور مستعلیٰ علیہ کے درمیان مطلق ارتباط سے، اور وجہ جامع دونوں کے درمیان تمکن ہے کہ جس طریقے سے چھت وغیرہ کسی بلند چیز پر چڑھا ہوا شخص اس پر متمکن ہوتا ہے، اسی طریقے سے ہدایت یافتہ متقی شخص بھی ہدایت تامہ پر متمکن ہے، مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے حاصل کرنے پر فائز ہو جانے کو تشبیہ دی گئی ہے ہدایت پر ہونے سے۔

اور مستعار اسم مشتق ہو، جیسے ؎

ولئن نطقت بشكر برِّك مفصحا فلسان حالي بالشكاية أنطق

لغات: نطَقَ يَنطِقُ نُطْقًا (ض) بولنا، گفتگو کرنا۔ بِرّ حسن سلوک، عطیہ برَّ يبِر برًّا (ض) اطاعت کرنا، حسن سلوک کرنا۔ أفْصَحَ إفْصَاحًا (افعال) فصاحت سے بولنا۔

ترکیب: واو مستانفہ، لام برائے تاکید، إن شرطیہ "نطقت" فعل، ضمیر فاعل ذوالحال، باجارہ "شکر برّك" مجرور شدہ متعلق بہ "نطقت" "مفصحاً" حال ذوالحال باحال فاعل، جملہ شرط "فلاشيء حاصلٌ" جزا محذوف، فاتعلیلیہ "لسان حالي" مبتدا، بالشکایة "أنطق" سے متعلق ہوکر خبر، مبتدا باخبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور میں "أنطق" مستعار ہے جو اسم مشتق ہے، اور "الدلالة" یعنی شکایت کو بتلانا مستعارلہٗ ہے، کیوں کہ "انطق" "ادلُّ" کے معنی میں ہے، پھر مستعار لہ کو حذف کر کے اس کے لازم "نطق" کو ذکر کر دیا، اور نطق ودلالت کے درمیان وجہ جامع "فهم المقصود من كل" (مکمل طریقے سے مقصود کو سمجھ جانا) ہے، اور جیسے "أذقته لباس الموت أي ألبسته إياه" اس مثال میں "اذاقت" (چکھانے) کو "الباس" (اوڑھانے) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور "الباس" کو اذاقت کے لیے مستعار بنایا گیا ہے لہٰذا "الإذاقة" مستعارلہٗ ہے، اور "إلباسٌ" مستعار ہے، پھر مستعار کو حذف کر کے اس کے لازم "لباس" کو ذکر کر دیا۔

وَتَنْقَسِمُ الاسْتِعَارَةُ إِلٰى مُرَشَّحةٍ وَهِيَ مَاذُكِرَ فِيهَا مُلاَئِمُ المُشَبَّهِ بِهِ نحوُ "أُولٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلاَلَةَ بِالهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِجارَتُهُمْ" فالإِشْتِراءُ مُسْتَعَارٌ لِلاِسْتِبْدَالِ، وذِكْرُ الرِّبحِ والتِّجارَةِ تَرْشِيحٌ.

وَإِلٰى مُجرَّدَةٍ وَهِيَ الَّتِي ذُكِرَ فِيهَا مُلاَئِمُ المُشبَّهِ نحوُ "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الجُوعِ وَالخَوفِ" اُسْتُعِيرَ اللِّبَاسُ لِمَا غَشِيَ الإِنسانَ عِنْدَ الجُوعِ والخوفِ والإذاقَةُ تَجْرِيدٌ لِذٰلِكَ.

وَإِلٰى مُطْلَقَةٍ وَهِيَ الَّتِي لَمْ يُذْكَر مَعَهَا مُلاَئِمٌ نحوُ "يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ" ولاَيُعْتَبَرُ التَّرشِيحُ وَالتَّجرِيدُ إِلاَّ بَعدَ تَمامِ الإِسْتِعَارَةِ بِالقَرِينَةِ.

ترجمہ: اور استعارہ منقسم ہوتا ہے مرشحہ کی طرف اور وہ ایسا استعارہ ہے جس

میں مشبہ بہ ''مستعار منہ'' کے مناسب کوئی لفظ ذکر کر دیا جائے، جیسے "اولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدى فما ربحت تجارتهم" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی تو ان کی تجارت سود مند نہ ہوئی۔ تو اشتراء ''خریدنا'' مستعار ہے استبدال ''بدلنے'' سے، اور ربح اور تجارت کا ذکر ترشیح ہے۔

اور (منقسم ہوتا ہے) مجردہ کی طرف اور وہ ایسا استعارہ ہے جس میں مشبہ ''مستعارلہ'' کے مناسب کوئی لفظ ذکر کر دیا جائے، جیسے ''فأذاقها الله لباس الجوع و الخوف'' اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔ لباس کا استعارہ کیا گیا ہے اس چیز سے جو انسان کو بھوک اور خوف کے وقت ڈھانپ لیتی ہے اور اذاقت اس کی تجرید ہے۔

اور (استعارہ منقسم ہوتا ہے) مطلقہ کی طرف اور وہ ایسا استعارہ ہے جس کے ساتھ کوئی مناسب لفظ ذکر نہ کیا جائے، جیسے ''ينقضون عهد الله'' وہ لوگ اللہ کے معاہدے کو توڑ دیتے ہیں، اور ترشیح و تجرید کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے مگر استعارہ بالقرینہ کے پورا ہونے کے بعد۔

تشریح: عبارت بالا میں مناسبات اور متصلات کے اعتبار سے استعارہ کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) مرشحہ (۲) مجردہ (۳) مطلقہ۔

استعارہ مرشحہ وہ استعارہ ہے جس میں صرف مشبہ بہ یعنی مستعار منہ کے مناسبات ذکر کئے گئے ہوں، جیسے ''اولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدى فما ربحت تجارتهم''

آیت کریمہ میں منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جنہوں نے ایمان کا کفر کے ذریعہ تبادلہ کیا اور اس تبادلے میں انہیں خسارے ہی کا منہ دیکھنا پڑا، آیت میں لفظ ''اشتراء'' مستعار منہ (مشبہ بہ) ہے اور ''استبدال'' مستعارلہ (مشبہ) ہے اور ''ربح'' (نفع) اور ''تجارۃ'' کے الفاظ مستعار منہ (اشتراء) کے مناسب ہیں

اوراسی مناسب کے ذکر کرنے کا نام ترشیح ہے۔

استعارہ مجردہ وہ استعارہ ہے جس میں صرف مستعار لہ ''مشبہ'' کے مناسبات ذکر کئے گئے ہوں، جیسے ''فأذاقها الله لباس الجوع والخوف''

آیت مذکورہ میں ''اللباس'' مستعار ہے اور ''أثر الجوع والخوف المحيط بهم عند الجوع والخوف'' بھوک اور خوف کا وہ اثر جواُن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یعنی مصائب اور سختیاں یہ مستعارلہ ''مشبہ'' ہے اور ''إذاقة'' اسی سے تجرید ہے، اور یہ اس طریقے سے کہ بھوک اور خوف یعنی مصیبت کے وقت انسان کو کسی نہ کسی قسم کا مزہ ملتا ہے خواہ اچھا یا خراب، اور اس مزہ کے مناسب لفظ ''إذاقة'' ہے۔

استعارہ مطلقہ وہ استعارہ ہے جس میں مستعارلہ اور مستعار منہ میں سے کسی کے مناسبات ذکر نہ کئے گئے ہوں، جیسے ''ينقضون عهد الله'' وہ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔

آیت کریمہ میں ''ابطال عہد'' کا استعارہ کیا گیا ہے ''نقض عہد'' سے، یعنی ''عہد کے توڑنے'' کو ''رسی کے دھاگوں کے کھولنے'' سے تشبیہ دی گئی ہے مگر نہ تو ''ابطال عہد'' (مستعارلہ) کا کوئی مناسب ہے اور نہ ہی ''نقض'' ''مستعار منہ'' کا

ولايعتبر الترشيح: فرماتے ہیں کہ ترشیح وتجرید کا اعتبار اسی وقت ہوگا جب کہ استعارہ قرینے کے ذریعے تام ہو چکا ہو۔

المَجَازُ المُرسَلُ

هُوَ مَجَازٌ عَلاَقَتُهُ غيرُ المُشَابَهَةِ .

(۱) كالسَّببيَّةِ فِيْ قولِكَ ''عظُمَتْ يَدُ فُلان'' أيْ نِعمَتُهُ الَّتِيْ سببُهَا اليَدُ

(۲) والمُسَبَّبِيَّةِ فِيْ قَولِكَ ''أَمطَرَتِ السَّمَاءُ نبَاتًا'' أَيْ مَطَرٌ يَتَسَبَّبُ

عَنْهُ النَّبَاتُ .

(۳) والجُزْئِيَّةِ فِيْ قَوْلِكَ "أُرْسِلَتِ العُيُونُ لِتَطَّلِعَ عَلٰى أَحْوَالِ العَدَدِ" أَيِ الجَوَاسِيْسُ .

(٤) والكُلِّيَّةِ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى "يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِمْ" أَيْ أَنَامِلَهُمْ

(٥) واعْتِبَارِ مَاكَانَ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى "وآتُوا اليَتَامٰى أَمْوَالَهُمْ" أَيِ البَالِغِينَ .

(٦) واعْتِبَارِ مَا يَكُونُ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى "اِنِّيْ أَرَانِيْ أَعْصِرُ خَمْرًا" أَيْ عِنَبًا

(٧) والمَحَلِّيَّةِ نحوُ "قَرَّرَ المَجْلِسُ ذٰلِكَ" أَيْ أَهْلُهُ .

(٨) وَالحَالِيَّةِ فِيْ قَوْلِهِ تَعَالٰى "فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" أَيْ جَنَّتِهِ.

مجاز مرسل

وہ ایسا مجاز ہے جس میں علاقۂ تشبیہ نہ ہو، جیسے کہ سببیت کا علاقہ تمہارے قول "عظمت ید فلان" میں۔فلاں کے ہاتھ بڑے ہو گئے۔یعنی اس کے انعام واکرام زیادہ ہو گئے جن کا سبب ہاتھ ہے

اور مسببیت کا علاقہ تمہارے قول "أمطرت السماء نباتا" میں، آسمان نے سبزہ اگایا۔یعنی ایسی بارش جس کا سبب سبزہ ہے۔

اور جزئیت کا علاقہ تمہارے قول "ارسلت العیون" میں، لوگوں کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے آنکھیں بھیج دی گئی ہیں یعنی جاسوس۔

اور کلیت کا علاقہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قول "یجعلون أصابعهم فی آذانهم" میں۔وہ لوگ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔یعنی پوروں کو۔

اور "ماکان" کا اعتبار، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "وآتُوا اليَتَامٰى أَمْوَالَهُمْ" میں، (اور تم یتیموں کے اموال ان کے حوالے کردو۔یعنی بالغین کو ان کا مال دے دو۔

اور ''مایکون'' کا اعتبار اللہ تعالیٰ کے قول ''إني اراني اعصر خمراً'' میں۔ میں اپنے کو خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں، یعنی انگور۔

اور ''محلیت'' کا علاقہ، جیسے ''قرّر المجلس ذٰلك'' مجلس نے اس کو منظور کردیا یعنی مجلس والوں نے۔

اور ''حالیت'' کا اعتبار اللہ تعالیٰ کے قول ''ففي رحمة الله هم فيها خالدون'' میں۔ تو اللہ کی رحمت میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی اس کی جنت میں۔

تشریح: ماقبل میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علاقہ کے اعتبار سے مجاز کی دو قسمیں ہیں (۱) استعارہ (۲) مجاز مرسل، اگر معنیٔ حقیقی اور معنیٔ مجازی کے درمیان علاقۂ تشبیہ ہو تو استعارہ ہے اور اگر تشبیہ کا علاقہ نہ ہو تو مجاز مرسل ہے، پہلی قسم کا بیان ہو چکا ہے۔ اب یہاں سے دوسری قسم مجاز مرسل کا بیان فرمارہے ہیں کہ مجاز مرسل وہ مجاز ہے جس میں تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، بل کہ اس کے علاوہ کوئی اور علاقہ ہو، اور کسی ایسے قرینے کا ہونا تو ضروری ہی ہے جو معنیٔ حقیقی مراد لینے سے مانع ہو۔

معنیٔ حقیقی ومجازی کے درمیان پائے جانے والے تعلقات تو بہت ہیں مگر مصنفینؒ نے آٹھ کو شمار کیا ہے۔

(۱) سببیت کا علاقہ، یعنی سبب بول کر مسبب مراد لینا، جیسے ''عظمت يدُ فلان'' فلاں کے ہاتھ بڑے ہوگئے۔ اس مثال میں ''ید'' کا معنیٔ حقیقی تو ''ہاتھ'' ہے مگر یہاں معنیٔ مجازی (نعمت) مراد ہے اور دونوں معنوں کے درمیان سببیت کا علاقہ ہے۔ اس لیے کہ ہاتھ ہی سے نعمتیں عطا کی جاتی ہیں گویا ہاتھ سبب ہے اور انعامات مسبب ہیں، اور سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے، اور قرینہ لفظ ''عظُمتْ'' ہے اس لیے کہ ہاتھ کے عظیم ہونے کا کوئی معنی نہیں عظیم تو وہ احسان اور انعام ہے جس کا سبب ہاتھ ہے۔

(۲) مسببیت کا علاقہ یعنی مسبب بول کر سبب مراد لینا، جیسے ''أمطرت السماء

نباتًا'' آسمان نے سبزہ برسایا۔ مثال مذکور میں ''نبات'' سے مراد ''پانی'' ہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ آسمان پانی برساتا ہے نہ کہ سبزہ، البتہ پانی سبزہ اگنے کا سبب ہے، اس لیے اس مثال میں ''نبات'' مسبب ہے اور ''پانی'' سبب، اور مسبب (نبات) بول کر سبب (پانی) مراد لیا گیا ہے گویا کہ دونوں معنوں کے درمیان مسببیت کا علاقہ ہے اور قرینہ لفظ ''أمطرت'' ہے کہ ''امطارِ ماء'' تو ہوتا ہے مگر ''امطارِ نبات'' عادۃً متعذر ہے۔

(۳) جزئیت کا علاقہ یعنی جز بول کر کل مراد لینا، جیسے ''أُرسِلَتِ العُیُونُ لِتَطَّلِعَ عَلٰی أَحْوَالِ العَدَدِ'' لوگوں کے حالات سے باخبر ہونے کے لیے جاسوس بھیج دیے گئے ہیں۔ مثال مذکور میں ''عیون'' کا معنی حقیقی تو ''آنکھ'' ہے مگر یہاں معنی مجازی یعنی جاسوس مراد لیا گیا ہے اس لیے کہ جاسوس اپنے اعضاء میں سے عام طور سے آنکھ ہی کے ذریعہ لوگوں کے احوال سے باخبر ہوتا ہے اور آنکھ اس کا ایک جز ہے، اور جز بول کر کل مراد لیا گیا ہے اس لیے دونوں معنوں کے درمیان علاقہ جزئیت ہے، اور قرینہ لفظ ''أرسلت'' ہے کہ صرف آنکھوں کا بھیجنا ناممکن ہے۔

(۴) کلیت کا علاقہ یعنی کل بول کر جز مراد لینا، جیسے ''یجعلون اصابعهم فی آذانهم'' وہ لوگ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔ مثال مذکور میں ''أصابع'' سے مراد ''أنامل'' (پورو ے) ہیں، اصابع کا معنی حقیقی مراد لینا دشوار ہے اس لیے کہ کوئی انسان اپنی پوری انگلی کان میں نہیں ڈال سکتا، گویا کہ آیت کریمہ میں کل بول کر جز مراد لیا گیا ہے، لہٰذا دونوں معانی میں کلیت کا علاقہ ہے۔

(۵) ماکان کا علاقہ، یعنی زمانۂ گذشتہ کا اعتبار، جیسے ''واتوا الیتامی أموالهم'' اور تم یتیموں کے اموال ان کے حوالے کردو۔ آیت کریمہ میں ''یتامی'' سے مراد ''بالغ لوگ'' ہیں کیوں کہ یتیم لغت میں اس کم سن بچے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا انتقال ہوگیا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے کم سن بچے کو مال سپرد کردینے سے وہ مال

ضائع ہو جائے گا، اس لیے اس کو مال دینے کا حکم غیر معقول ہے؛ بل کہ حقیقت میں اللہ رب العزت کا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو پہلے یتیم تھے مگر اب وہ سن رشد کو پہنچ چکے ہیں، یہی مطلب ہے "اعتبار ما کان" کا، اور قرینہ لفظ "اتوا" ہے کہ ایتاء مال کا حکم حالتِ یتم میں چوں کہ ممنوع ہے اس لیے یقینی طور پر یہاں یتیم سے مراد بالغ ہوگا۔

(٦) ما یکون کا علاقہ، دو معنوں میں کبھی ما یکون کا علاقہ ہوتا ہے، یعنی زمانۂ آئندہ کا اعتبار، جیسے "إني أراني اعصر خمرًا" میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں، اس آیت "خمر" (شراب) سے مراد "عنب" (انگور) ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خمر کو نہیں نچوڑے گا اس لیے کہ خمر تو خود نچوڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، البتہ انگور کو نچوڑ کر خمر بنایا جاتا ہے تو چوں کہ زمانۂ مستقبل میں وہ عنب خمر ہی بن جاتا ہے، اس لیے ما یکون کا اعتبار کرتے ہوئے "عنب" کو "خمر" کہہ دیا گیا، اور قرینہ "اعصر" ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے عرف عام میں طالب علم کو لوگ "مولانا صاحب" کہتے رہتے ہیں، اس لیے کہ بعد میں چل کر وہ مولانا ہی ہونے والا ہے۔

(٧) محلیت کا علاقہ، یعنی محل بول کر حال مراد لینا، جیسے "قرر المجلس ذلك" مجلس نے اس کی منظوری دے دی، یہاں مجلس سے مراد اہل مجلس ہیں اس لیے مجلس تو اس جگہ کا نام ہے جہاں لوگ اکٹھا ہوں، ظاہر ہے اس مجلس کے کسی چیز کو منظور کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا: بل کہ مراد وہ لوگ ہیں جو مجلس میں ہوں گویا محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے، لہٰذا دونوں کے درمیان علاقۂ محلیت ہے۔

(٨) حالیت کا علاقہ، یعنی حال بول کر محل مراد لینا، جیسے "ففي رحمة الله هم فيها خالدون" تو اللہ کی رحمت میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ آیت کریمہ میں "رحمت" سے مراد جنت ہے، اس لیے کہ انسان رحمت میں نہیں رہتا ہے بل

کہ رحمت کی جگہ میں رہتا ہے گویا کہ یہاں ''رحمت'' سے ''مکان رحمت'' مراد ہے، اور وہ جنت ہے یعنی حال بول کر محل مراد لیا گیا ہے اور یہی علاقۂ حالیت ہے، اور قرینہ "هم فيها خالدون" ہے بایں طور کہ دائمی اقامت کسی محل ہی میں ممکن ہوگی نہ کسی حال میں۔

المَجَازُ المُرَكَّبُ

اَلمُرَكَّبُ إِن استُعْمِلَ فِيْ غيرِ مَاوُضِعَ لهٗ ، فإنْ كَانَ لِعَلاقَةٍ غيرِ المُشَابِهَةِ سُمِّيَ مَجازًا مُركَّبًا كَالجُمَلِ الخَبرِيَّةِ إذَا اسْتُعمِلَتْ فِيْ الإِنْشَاءِ نحوُ قَولِهٖ ؎

هَوَايَ مَعَ الرَّكْبِ أليَمَانِينَ مُصْعِدٌ جَنِيبٌ وَجُثْمَاني بِمَكَّةَ مُوثَقُ

فلَيسَ الغَرَضُ مِنْ هٰذَا البيتِ الإِخْبارَبَلْ إظْهارُ التَّحزُّنِ والتَّحسُّرِ، وإنْ كَانَتْ عَلاقَتُهُ المُشَابَهةَ سُمِّيَ اسْتَعَارَةً تَمْثِيلِيَّةً كَمَا يُقالُ لِلْمُتَرَدِّدِ فِيْ أَمْرٍ "أَرَاكَ تُقَدِّمُ رِجْلاً وَتُؤخِّرُ اُخرٰى".

مجاز مرکب

مرکب، اگر اس کو استعمال کیا گیا ہو غیر موضوع لہٗ میں، پس اگر یہ استعمال تشبیہ کے علاوہ کسی اور علاقہ کی وجہ سے ہو تو اس کا نام مجاز مرکب ہے، جیسے جملہ خبریہ، جب ان کا استعمال انشاء میں ہو، مثلاً شاعر کا شعر هواي الخ ؎

میرا محبوب یمنی قافلے کے ساتھ روانہ ہو رہا ہے ان کا تابع ہو کر اور میرا جسم مکہ میں مقید ہے۔

اس شعر کا مقصد خبر دینا نہیں ہے بل کہ غم اور حسرت کا اظہار ہے۔

اور اگر مجاز کا علاقہ تشبیہ ہو تو اس کا نام استعارۂ تمثیلیہ ہے، جیسے کہ اس شخص

سے جو کسی کام میں متردد ہو، کہا جائے "أراك تقدم رجلا وتؤخر أخرى" میں تمہیں دیکھ رہا ہوں تم ایک پیر آگے بڑھاتے ہو اور دوسرا پیر پیچھے سمیٹتے ہو۔

تشریح: ماقبل میں مجاز مفرد کا بیان گذر چکا ہے، استعارہ کے جن اقسام کا بیان ہو چکا ان سب کا تعلق مجاز مفرد سے ہے اور اب یہاں مصنفینؒ مجاز مرکب کو بیان فرمارہے ہیں کہ مجاز مرکب وہ جملہ ہے جس کو معنیٔ غیر موضوع لہٗ میں استعمال کیا گیا ہو، اور دونوں معنوں کے درمیان تشبیہ کا علاقہ نہ ہو، جیسے کہ وہ جملہ خبریہ جس کو انشاء کے معنی میں استعمال کیا جائے، مثلاً شاعر کا شعر ؎

هواي مع الركب اليمانين مصعد جنيب وجثماني بمكة موثق

لغات وترکیب ماقبل میں گذر چکے ہیں۔

شعر مذکور کو اس کے معنیٔ حقیقی میں نہیں استعمال کیا گیا ہے کہ اس سے مقصد لوگوں کو محبوب کی روانگی اور اپنے آپ کے مقید ہونے کی خبر دینا مقصود ہو، بل کہ مقصد رنج وغم کا اظہار ہے اور یہ انشاء ہے۔

اور اگر دونوں معنوں کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہو تو اس کا نام استعارۂ تمثیلیہ ہے لیکن اس میں یہ بھی شرط ہے کہ معنیٔ حقیقی مراد لینے سے کوئی مانع موجود ہو، جیسے "أراك تقدم رجلاً وتؤخر أخرى"۔

مثال مذکور ایک لفظ مرکب (جملہ) ہے جس کا معنیٔ حقیقی پیر کا آگے بڑھانا اور پیچھے ہٹانا ہے، مگر یہاں معنیٔ حقیقی میں مستعمل نہیں ہے؛ بل کہ یہ جملہ کسی امر میں تردد کے موقع پر بولا جاتا ہے، اور یہاں یہی دوسرا معنی مراد ہے، اور دونوں معنوں میں تشبیہ کا علاقہ ہے اس لیے کہ متردد آدمی کی حالت بھی ایسے ہی رہتی ہے، گویا "هيئة المتردد في أمر" مشبہ ہے اور "هيئة المتردد المقدم رجلا والمؤخر أخرى" مشبہ بہ ہے۔

اَلمَجَازُ العَقْلِيُّ

هُوَ إِسْنَادُ الفِعلِ أَوْ مَا فِيْ مَعْنَاهُ إِلٰى غَيرِ مَاهُوَلَهُ عِنْدَ التَّكَلُّمِ فِيْ الظَّاهِرِ لِعَلاَقَةٍ نحوُ قَولِهِ ؎

أَشَابَ الصَّغِيرَ وَأَفْنَى الكَبِيرَ كَرُّ الغَدَاةِ وَمَرُّ العَشِيِّ

فَإِنَّ إِسْنَادَ الإِشَابَةِ وَالإِفْنَاءِ إِلٰى كَرِّ الغَدَاةِ وَمُرُورِ العَشِيِّ إِسْنَادٌ إِلٰى غَيرِ مَاهُوَ لَهُ إِذِ المُشِيبُ والمُفْنِي فِيْ الحَقِيقَةِ هُوَاللّٰهُ تَعَالٰى .

وَمِنَ المَجَازِ العَقْلِيِّ إِسْنَادُ مَابُنِيَ لِلفَاعِلِ إِلٰى المَفْعُولِ نحوُ "عِيشَةٌ رَاضِيَةٌ" وعَكْسُهُ نحوُ "سَيْلٌ مُفْعَمٌ" والإِسنَادُ اِلَى المَصْدَرِ، نحوُ "جَدَّجِدُّهُ" وَإِلَى الزَّمَانِ نحوُ "نَهَارُهُ صَائِمٌ" وَإِلَى المَكَانِ نحوُ "نهرٌ جارٍ" وإِلَى السَّبَبِ نحوُ "بنَى الأَمِيرُ المَدِينَةَ" ويُعلَمُ مِمَّا سبَقَ أَنَّ المَجازَ اللُّغَوِيَّ يكُونُ فِيْ اللَّفْظِ والمَجازَ العَقْلِيَّ يكُونُ فِيْ الإِسنَادِ .

مجاز عقلی

وہ فعل یا معنی فعل کی نسبت کرنا ہے غیر ماہولہ کی طرف تکلم کے وقت، ظاہر حال کے اعتبار سے کسی رابطے کی وجہ سے، جیسے کہ شاعر کا شعر، أشاب الصغير الخ ؎

چھوٹے کو بوڑھا بنا دیا اور بڑے کو فنا کر دیا صبح کے بار بار آنے اور شام کے گذر جانے نے۔

کیوں کہ جوان کرنے اور فنا کرنے کی نسبت صبح کے بار بار آنے اور شام کے گذرنے کی طرف کرنا اس چیز کے علاوہ کی طرف نسبت کرنا ہے جس کے لیے وہ ہے، اس لیے کہ جوانی عطا کرنے والا اور فنا کرنے والا درحقیقت اللہ رب العزت ہے۔

اور مجاز عقلی ہی میں سے فعل معروف کی نسبت کرنا ہے مفعول کی طرف، جیسے

"عيشة راضية" خوش حال زندگی، اور اس کے برعکس کرنا، جیسے "سيلٌ مفعم" بھرا ہوا سیلاب، اور مصدر کی طرف نسبت کرنا، جیسے "جدّ جدّه" اس کی کوشش کامیاب ہوگئی۔ اور زمان کی طرف جیسے "نهاره صائم" اس کا دن روزے دار ہے، اور مکان کی طرف جیسے "نهر جار" بہتی نہر، اور سبب کی طرف جیسے "بني الأمير المدينة" امیر نے شہر بنوایا، اور سابقہ بحث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مجاز لغوی لفظ میں ہوتا ہے اور مجاز عقلی اسناد میں ہوتا ہے۔

تشریح: اب تک جو بحث بھی مجاز کے متعلق گذری اس کا تعلق مجاز لغوی سے تھا، عبارت بالا میں مصنفینؒ نے مجازِ عقلی کی وضاحت فرمائی ہے مجاز لغوی میں کلام یا لفظ سے بحث ہوتی ہے اور مجاز عقلی میں اسناد سے۔ فرماتے ہیں کہ مجاز عقلی نام ہے فعل یا معنیٔ فعل کی نسبت کرنا غیر ما ہولہ کی طرف کسی علاقے کی وجہ سے، یعنی یہ نسبت جس چیز کی طرف ہو رہی ہے محض ظاہر کے اعتبار سے ہو حقیقت میں نہ ہو جیسے شاعر کا شعر ؎

أشاب الصغير وأفنى الكبير　　كرّ الغداةِ ومر العشي

لغات: أشاب إشابة (افعال) بوڑھا بنا دینا، أفنى إفناءً فنا کر دینا، كرّ الليل والنهار يكُرُّ كرًّا (ن) رات دن کا باری باری آنا۔

ترکیب: "أشاب" فعل "الصغير" مفعول بہ "كرّ الغداة ومرّ العشي" معطوف ومعطوف علیہ مل کر فاعل، فعل با فاعل ومفعول جملہ خبریہ شدہ معطوف علیہ "أفنى الكبير" معطوف، معطوف علیہ با معطوف جملہ معطوفہ خبریہ ہوا۔

شعر مذکور میں "إشابة" اور "إفناء" کی نسبت "كرّ الغداة" اور "مرّ العشي" کی طرف کرنا اسناد غیر حقیقی ہے، اس لیے کہ ایک مومن کا یہی عقیدہ ہے کہ جوانی عطا کرنے والا اور انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے والا حقیقت میں اللہ رب العزت ہی ہے، واضح رہے کہ مجاز عقلی اور اسناد مجازی دونوں ایک ہی ہیں۔

ومن المجاز العقلي: حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ مجاز عقلی کے پائے جانے کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ مبنی للفاعل یعنی فعل معروف کی نسبت بجائے فاعل کے مفعول کی طرف کی جائے، جیسے ''عیشة راضیة'' خوش حال زندگی۔ مثال مذکور میں محل استشہاد ''راضیة'' ہے جو مبنی للفاعل ہے؛ کیوں کہ رضيَ یرضٰی کا اسم فاعل ہے اور اسم فاعل فعل معروف ہی کے حکم میں ہوتا ہے اور ''راضیة'' کی اسناد اس ضمیر کی طرف ہو رہی ہے جو اس میں مستتر ہے جس کا مرجع ''عیشة'' ہے جو حقیقت میں مفعول بہ ہے، اس لیے کہ ''عیشة'' کے معنی ''زندگی'' کے ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ زندگی خوش حال نہیں ہوتی ہے، بل کہ صاحب زندگی خوش حال ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ ''عیشة راضیة'' حقیقت میں ''عیشة مرضیة'' ہے، یعنی مبنی للمفعول ہے اور ''راضیة'' کی نسبت ''عیشة'' کی طرف کرنا اسناد مجازی ہے۔

وعکسه الخ: فرماتے ہیں کہ اسناد مجازی ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ پہلی صورت کے برعکس ہو یعنی بجائے مبنی للفاعل کے مبنی للمفعول، جس کا مطلب یہ ہے کہ فعل مجہول کی نسبت بجائے مفعول کے فاعل کی طرف کی جائے، جیسے ''سیلٌ مفعمٌ'' اس مثال میں محل استشہاد ''مُفْعَمٌ'' ہے جو مبنی للمفعول ہے اس لیے کہ مفعول حقیقت میں فعل مجہول ہی ہوا کرتا ہے، یہاں بھی ''مفعم'' کی اسناد اس ضمیر کی طرف ہو رہی ہے جو اس میں مستتر ہے جس کا مرجع ''سیل'' ہے، تو گویا ''سیلٌ مفعمٌ'' کے معنی ہو گئے ''بھرا ہوا سیلاب'' اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ سیلاب بھرا ہوا نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ وہ زمین بھری ہوئی ہوتی ہے جہاں سیلاب کا پانی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ''مفعمٌ'' کا مفعول گویا ''الوادي'' ہے مگر اسے حذف کر کے ''مفعم'' کی اسناد سیل کی طرف کر دی گئی اور ''مفعمٌ'' کی نسبت ''سیلٌ'' کی طرف کرنا ہی اسناد مجازی ہے۔

والإسناد إلى المصدر: مجازِ عقلی ہی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ فعل کی نسبت مصدر کی طرف کی جائے جیسے "جدَّ جِدُّہ" اس کی کوشش کامیاب ہوگئی۔

مثالِ مذکور میں "جدَّ" کی فعل کی نسبت "جِدُّ" مصدر کی طرف کی گئی ہے جس کا ترجمہ ہے، اس کی کوشش کامیاب ہوگئی، حالاں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کوشش کامیاب نہیں ہوتی ہے، بل کہ صاحب جد یعنی کوشش والا کامیاب ہوتا ہے، اس لحاظ سے گویا اصل عبارت "جدّ صاحب الجد" تھی، مگر فاعل کو حذف کر کے "جدَّ" فعل کی نسبت "جِدٌّ" مصدر کی طرف کر دی گئی اور یہی اسناد الی غیر ما ھو لہٗ ہے جس کو اسنادِ مجازی کہتے ہیں۔

وإلى الزمان: اسی طریقے سے مجازی عقلی کی ایک قسم یہ ہے کہ فعل یا معنیٰ فعل کی نسبت زمان کی طرف ہو، جب کہ اس کی نسبت فاعل کی طرف ہونی چاہئے، جیسے "نهاره صائم" اس کا دن روزے سے ہے، یہاں "صائم" کی اسناد "نهار" کی طرف کی گئی ہے حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ زمان (دن) روزہ نہیں رکھتا ہے؛ بل کہ دن میں روزہ رکھا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اصل عبارت "زيدٌ صائم في النهار" ہے۔ زید دن میں روزہ رکھنے والا ہے۔ فاعل یعنی "زید" کو حذف کر کے صائم کی نسبت نہار یعنی زمان کی طرف کر دی گئی اور یہی اسنادِ مجازی ہے۔

وإلى المكان: اسنادِ مجازی کی ایک صورت یہ ہے کہ فعل یا معنیٰ فعل کی اسناد بجائے فاعل کے مکان اور جگہ کی طرف کر دی جائے جو معنی غیر ما ھو لہٗ ہے، جیسے "نهرٌ جارٍ" بہنے والی نہر۔ مثالِ مذکور میں محلِ استشہاد "جار" ہے جو فاعل کا مقتضی ہے اور اس کا فاعل اصل میں "ماءٌ" ہے، اس لیے کہ نہر بہنے والی نہیں ہوتی؛ بل کہ نہر کا پانی بہنے والا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ تقدیری عبارت "الماء جارٍ في النهر" ہے فاعل کو حذف کر کے "جارٍ" کی اسناد مکان یعنی "نهر" کی طرف کر دی، اور یہی اسنادِ مجازی ہے۔

والی السبب: مجازِ عقلی کی ایک قسم یہ ہے کہ فعل یا معنیٔ فعل کی اسناد بجائے فاعل کے سبب کی طرف ہو، جیسے "بنى الأمير المدينة" امیر نے شہر تعمیر کیا، اس مثال میں "بنى" کی نسبت جو امیر کی طرف کی گئی ہے وہ مجازاً ہے، اس لیے کہ حقیقت میں تعمیر کرنے والے کاری گر اور مزدور ہیں، امیر صرف سبب ہے کیوں کہ امیر نے تعمیر کا صرف حکم دیا ہے۔

ویعلم من هذا: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ ماقبل کی تشریح سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ مجاز لغوی لفظ میں ہوتا ہے اور مجاز عقلی اسناد میں ہوتی ہے۔

اَلْكِنَايَةُ

هِيَ لَفْظٌ أُرِيدَ بِهِ لَازِمُ مَعْنَاهُ مَعَ جَوازِ إرَادَةِ ذٰلِكَ المَعْنٰى نحوُ "طَوِيلُ النِّجاد" أيْ طَوِيلُ القَامَةِ.

وَتَنْقَسِمُ بِاعْتِبَارِ المَكْنِيِّ عَنْهُ إلٰى ثَلٰثَةِ أقسَامٍ.

اَلأوَّلُ: كِنَايَةٌ يكُونُ المَكْنِيُّ عَنْهُ فِيهَا صِفَةً كقَوْلِ الخَنسَاءِ ؎

طَوِيلُ النِّجَادِ رَفِيعُ العِمَادِ   كَثِيــرُ الرَّمَـادِ إذَا مَا شَتَا

تُرِيدُ أنَّهُ طَوِيلُ القَامَةِ سيِّدٌ كَرِيمٌ.

وَالثَّانِي: كِنَايَةٌ يَكُونُ المَكْنِيُّ عَنْهُ فِيهَا نِسْبَةً نحوُ "المَجْدُ بَيْنَ ثَوبَيهِ وَالكَرَمُ تحتَ رِدَائِهِ" تُرِيدُ نِسْبَةَ المَجْدِ وَالكَرَمِ إلَيهِ.

الثَّالِثُ: كِنَايَةٌ يَكُونُ المَكْنِيُّ عَنْهُ فِيهَا غيرَ صِفَةٍ وَلَانِسْبَةٍ كَقَوْلِهِ ؎

أَلضَّارِبِينَ بِكُلِّ أبيَضَ مِخْذَمٍ   وَالطَّاعِنِينَ مَجَامِعَ الأضْغَانِ

فَإنَّهُ كَنٰى بِمَجَامِعِ الأضْغَانِ عَنِ القُلُوبِ.

کنایہ

وہ ایسا لفظ ہے جس کے ذریعہ اس کے معنی کے لازم کو مراد لیا گیا ہو اس معنی

(موضوع لہ) کو مراد لینے کے ساتھ، جیسے "طویل النجاد" لمبے پڑتلے والا یعنی طویل القامت۔

اور کنایہ مکنی عنہ کے اعتبار سے تین قسموں میں منقسم ہوتا ہے۔

پہلی قسم: وہ کنایہ ہے جس میں مکنی عنہ صفت ہو جیسے حضرت خنساءؓ کا قول "طویل النجاد" ہے

(میرا بھائی) لمبی قامت والا اونچے ستون والا ہے راکھ کا انبار والا (دریا دل) ہے جب موسم سرما آجائے۔

تمہاری مراد یہ ہو کہ وہ (ممدوح) لمبی قامت والا، سردار اور بخشش کرنے والا ہے۔

دوسری قسم: وہ کنایہ ہے جس میں مکنی عنہ نسبت ہو، جیسے "المجد بین ثوبیه والکرم تحت ردائه" بزرگی ممدوح کے دونوں کپڑوں کے درمیان ہے اور بخشش اس کی چادر کے نیچے ہے، تمہارا مقصد ممدوح کی طرف مجد وکرم کی نسبت ہے۔

تیسری قسم: وہ کنایہ ہے جس میں مکنی عنہ نہ صفت ہو اور نہ نسبت، جیسے شاعر کا قول "الضاربین الخ" ہے

میرے نزدیک قابل مدح ہیں وہ بہادر جو (مدمقابل کو) ہر چمک دار تیز تلوار سے مارنے والے ہیں اور وہ لوگ بھی جو نیزہ مارنے والے ہیں حسد اور کینوں کے جمع ہونے کی جگہ (دل) میں۔

تشریح: ادائیگی مافی الضمیر کے جو تین طریقے ماقبل میں بیان کیے گئے تھے، تشبیہ، مجاز، کنایہ، ان میں دو طریقے تشبیہ اور مجاز عقلی کی تشریح کرنے کے بعد اب یہاں سے حضرات مصنفینؒ تیسرے طریقے کنایہ کی وضاحت کر رہے ہیں، پہلے کنایہ کے تعریف کی ہے بعد ازاں کنایہ کے اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے، چناں چہ فرمایا "الکنایة هي لفظ أريد به لازم معناه الخ" کنایہ وہ لفظ ہے

جس سے اس کا لازمی معنیٰ مراد لیا جائے اور اس کے ساتھ اس کے معنیٰ ملزوم (اصل معنیٰ) کا مراد لینا بھی درست ہو، اسی تعریف سے مجاز اور کنایہ کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مجاز میں معنیٰ حقیقی مراد لینا متعذر رہوتا ہے جب کہ کنایہ میں معنیٰ حقیقی مراد لینا ممکن ہی نہیں بل کہ مقصود بھی ہوتا ہے، جیسے "طویل النجاد" لمبے پڑتلے والا، یہ اس کا معنیٔ اصلی اور معنیٔ لازم ہے، اور ہر لمبے پڑتلے والے کے لیے لمبا قد ہونا لازم ہے، چناں چہ یہاں یہی معنیٔ لازم "طویل القامت" ہی مراد ہے اور معنیٔ اصلی بھی مراد لینا درست ہے، اس لیے کہ عرب کا یہ دستور تھا کہ وہ ہر وقت اپنے سینے پر تلوار لٹکا کر مسلح رہتے تھے اور ہر شخص کی تلوار اس کے سینے کے مطابق ہوا کرتی تھی اور اسی کے مطابق اس کی میان بھی رہتی تھی، اس لیے یقینی طور پر جس کی تلوار اور تلوار کا پڑتلہ لمبا ہوگا وہ شخص خود بھی طویل القامت ہوگا۔

(نوٹ) یہاں یہ جان لینا چاہئے کہ کنایہ میں جو معنیٰ مراد ہوتے ہیں اس کو "مکنی عنہ" کہتے ہیں، مکنی عنہ کے اعتبار سے کنایہ کی تین قسمیں ہیں۔

قسم اول: وہ کنایہ جس میں مکنی عنہ صفت ہو، جیسے حضرت خنساءؓ کا قول ؎

طویل النجاد رفیع العماد كثير الرّماد إذا ماشتا

لغات: نِجَادٌ پڑتلہ، عِمَادٌ (ج) أعْمِدَةٌ ستون۔ رَمَادٌ (ج) أرمِدَةٌ راکھ۔ شَتَا. يشتُوْا شتوًا (ن) موسم سرما میں داخل ہونا۔

ترکیب: **هو** مبتدا محذوف "**طويل النجاد، رفيع العماد، كثير الرماد**" تینوں مرکب اضافی ہوکر خبر "**إذا ما شتا**" جملے کا تعلق کثیر الرماد سے ہے اور اسی کا ظرف ہے۔

شعر مذکور میں مکنی عنہ "**طويل النجاد، رفيع العماد، كثير الرماد**" تینوں ہیں اور سب صفت واقع ہیں "**طول النجاد**" سے مراد "طویل القامت" اور "**رفيع العماد**" سے مراد "سردار" اور "**كثير الرماد**" سے مراد "سخی" ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ممدوح دراز قد، سردار اور دریا دل آدمی ہے جس کے یہاں مہمانوں کی ضیافت کے لیے اتنے کھانے پکتے ہیں اور اتنی لکڑیاں جلتی ہیں کہ اس کے گھر پر راکھ کا انبار لگا رہتا ہے خواہ موسم سرما ہی کیوں نہ ہو، جب کہ دن چھوٹے ہوتے ہیں، مگر میرا ممدوح تو ایسا ہے کہ اس کے یہاں دن کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے مہمان نوازی کے لیے وقت کی تنگی کا عذر نہیں ہے۔

قسم ثانی: وہ کنایہ جس میں مکنی عنہ نسبت ہو، جیسے ''المجد بین ثوبیه، والکرم تحت ردائه'' مثال مذکور میں بزرگی و فیاضی کو کپڑے اور چادر میں ثابت کرکے اس بات کی طرف کنایہ کیا گیا ہے کہ یہ دونوں اوصاف ممدوح کی طرف منسوب ہیں۔

قسم ثالث: وہ کنایہ جس میں مکنی عنہ نہ تو صفت ہو اور نہ ہی نسبت ہو؛ بل کہ موصوف ہو، جیسے ؎

الضاربین بکل أبیض مخذم　　والطاعنین مجامع الأضغان

لغات: الضاربین منصوب علی المدح ہے، أبیض کا موصوف محذوف ہے اصل میں سیف أبیض ہے، مخذم اسم آلہ، خذَمَ یخذِمُ خذمًا (ض) جلدی سے کاٹنا۔ مجامعُ، مجمعٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں جمع ہونے کی جگہ اور اضغانٌ، ضِغنٌ کی جمع ہے جس کے معنی کینہ اور بغض کے ہیں، لہٰذا مجامع الاضغان کے معنی ہوئے کینہ اور بغض کے جمع ہونے کی جگہ، یہاں مراد قلوب ہیں۔

ترکیب: أمدح فعل محذوف ''الضاربین'' صیغۂ صفت، باجارہ کل مضاف ''سیفٌ'' موصوف محذوف ''ابیض'' اور ''مخذم'' ہر دو صفت، موصوف با صفت مضاف الیہ مجرور، جار با مجرور متعلق بہ ''الضاربین'' معطوف علیہ، واو عاطفہ ''الطاعنین'' صیغۂ صفت ''مجامع الأضغان'' مفعول، صیغۂ صفت با مفعول معطوف، معطوف علیہ با معطوف مفعول امدح۔

شعر مذکور میں محل استشہاد یہی "مجامع الأضغان" اور مکنی عنہ "قلوب" ہے جو نہ صفت ہے اور نہ ہی نسبت؛ بل کہ موصوف ہے اور "مجامع الأضغان" اس کی صفت ہے اس لیے کہ دل ہی کینہ اور بغض کے جمع ہونے کی جگہ ہے۔

وَالكِنَايَةُ إنْ كَثُرَتْ فِيهَا الوَسَائِطُ سُمِّيَتْ تَلْوِيحًا نحوُ ، هُوَ كَثِيرُ الرَّمَادِ أيْ كَرِيمٌ ، فإنَّ كَثْـرَةَ الرَّمَادِ تَسْتَلْزِمُ كَثْرَةَ الإحْرَاقِ ، وَكَثْرَةُ الإحراقِ تَسْتَلْزِمُ كَثْرَةَ الطَّبْخِ والخُبْزِ وكَثْرَتُهُمَا تَسْتَلْزِمُ كَثْرَةَ الآكِلِينَ ، وَهِيَ تَسْتَلْزِمُ كَثْرَةَ الضِّيفَانِ ، كَثْرَةُ الضِّيفَانِ تَسْتَلْزِمُ الكَرَمَ .

وإنْ قَلَّتْ وَخَفِيَتْ سُمِّيَتْ رَمْزًا نحو "هُوَ سَمِينٌ رِخْوٌ" أيْ غَبِيٌّ بَلِيدٌ.

وَإنْ قَلَّتْ فِيهَا الوَسَائِطُ أَوْ لَمْ تكُنْ وَوَضَحَتْ سُمِّيَتْ إيْمَاءً وَإشَارَةً نحوُ ؎

أوَ مَا رَأيتَ المَجدَ ألقَى رِحْلَهُ فِيْ آلِ طَلْحَةَ ثُمَّ لَمْ يَتَحَوَّلِ

كِنَايَةً عَنْ كَونِهِمْ أمْجَادًا .

وَهُنَاكَ نَوْعٌ مِنَ الكِنَايَةِ يُعْتَمَدُ فِيْ فَهْمِهِ علَى السِّيَاقِ يُسَمَّى تَعْرِيضًا وَهُوَ إمَالَةُ الكَلَامِ إلَى عرْضٍ أيْ نَاحِيَةٍ كَقَولِكَ لِشَخْصٍ يَضُرُّ النَّاسَ "خيرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُهُمْ"

ترجمہ: اور کنایہ میں اگر وسائط کی کثرت ہو تو اس کا نام تلویح ہے، جیسے "هو كثير الرماد" وہ بہت زیادہ راکھ والا ہے، یعنی سخی ہے، کیوں کہ راکھ کی کثرت آگ جلانے کی کثرت کو مستلزم ہے اور آگ جلانے کی کثرت، پکانے اور روٹی کی زیادتی کو مستلزم ہے اور کھانے اور روٹی کی کثرت، کھانے والوں کی کثرت کو مستلزم ہے اور یہ مہمانوں کی کثرت کو مستلزم ہے اور کثرتِ مہمان سخاوت کو مستلزم ہے۔

اور اگر واسطے (کنایہ میں) کم اور مخفی ہوں تو اس کا نام رمز ہے۔ جیسے "ھو

سمین رخو" وہ موٹا نرم ہے، یعنی غبی نادان ہے۔

اور اگر کنایہ میں وسائط کم ہوں اور واضح ہوں، یا وسائط بالکل نہ ہوں تو اس کا نام ایماء اور اشارہ ہے، جیسے أو ما رأیت الخ ۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ بزرگی نے اپنا کجاوہ طلحہ کے خاندان میں ڈال رکھا ہے پھر وہ ہٹی نہیں۔

کنایہ ہے ان لوگوں کے بزرگ ہونے سے۔

اور اس جگہ کنایہ کی ایک اور قسم ہے جس کا سمجھا جانا سیاق کلام پر موقوف ہے، اس کا نام تعریض ہے اور وہ کلام کا کسی عرض یعنی گوشے کی طرف مائل کر دینا ہے، جیسے تمہارا کہنا اس شخص سے جو لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہو "خیر الناس من ینفع الناس" لوگوں میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفینؒ نے کنایہ کے چار اقسام کی وضاحت کی ہے (۱) تلویح (۲) رمز (۳) ایماء و اشارہ (۴) تعریض۔

تلویح: وہ کنایہ ہے جس میں واسطے بہت ہوں، جیسے "ھو کثیر الرماد" وہ بہت زیادہ راکھ والا ہے۔ کنایہ ہے مرد سخی سے، مگر اس معنی کی طرف ذہن کئی واسطوں سے منتقل ہوتا ہے، کیوں کہ "بہت زیادہ راکھ والا" اس سے ذہن اولاً تو اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کے یہاں لکڑیاں بہت جلتی ہیں، پھر دوبارہ ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کے یہاں کھانا بہت پکتا ہے، پھر سہ بارہ ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کے یہاں مہمان بہت آتے ہیں پھر مہمانوں کی آمد سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ بہت سخی ہے اتنے واسطوں کے بعد اس کی سخاوت سمجھ میں آئی۔

رمز: وہ کنایہ ہے جس میں واسطے کم ہوں اور اس میں کچھ پوشیدگی اور خفا ہو، جیسے "ھو سمین رخوٌ" وہ موٹا اور نرم ہے، یعنی کند ذہن اور نادان ہے، اس

مثال میں "سمين رخو ، غبيٌّ وبليدٌ" کے معنی میں ہے اس لیے کہ موٹا ہونا مستلزم ہے کاہلی اور غباوت کو، اور نرم وکمزور ہونا بھی مستلزم ہے ذہنی قوت کی کمزوری کو گویا یہ دونوں ذہن کی کمزوری اور انسان کی بے وقوفی کا سبب ہیں تو یہاں بھی واسطہ ہوا، مگر صرف ایک اور وہ بھی مخفی ہے جس کا سمجھنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔

ایماء واشارہ: وہ کنایہ ہے جس میں واسطے کم ہوں اور واضح ہوں، یا وسائط بالکل ہی نہ ہوں، جیسے ؎

أو ما رأيت المجدَ ألقى رحله في آل طلحة ثم لم يتحوّل

لغات: مجد (ج) أمجاد عزت، بزرگی، شرافت، ألقى إلقاءً (افعال) ڈالنا رَحْلٌ (ج) رِحال کجاوہ، تحوَّلَ تَحَوُّلاً (تفعل) ہٹنا، جدا ہونا۔

ترکیب: أ حرف استفہام، ما رأيت فعل با فاعل، المجد مفعول بہ، جملہ استفہامیہ انشائیہ ہوا، ألقى رحله فعل فاعل ومفعول، في آل طلحة، جار با مجرور متعلق بہ ألقى، جملہ خبریہ معطوف علیہ، ثمَّ عاطفہ، لم يتحول جملہ معطوف۔

شعر مذکور کا مطلب یہ ہے کہ اہل خاندان طلحہ بزرگی اور شرافت سے کلی طور پر متصف ہیں حتی کہ خود شرافت وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی محل استشہاد "المجد ألقى رحله" ہے، جس سے کنایہ کیا جاتا ہے کسی کے صاحب شرافت ہونے سے، یہاں واسطہ صرف "المجد" ہے اور خفاء بالکل نہیں ہے، کیوں کہ ہر شخص سنتے ہی یہ سمجھ جائے گا کہ شرافت کے کجاوہ ڈالنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ لوگ شریف ہیں، کیوں کہ "مجد" ایک ایسی صفت ہے جو کسی مکان مثلاً خیموں وغیرہ میں پڑاؤ ڈال کر رہنے والی نہیں ہے بل کہ کسی صالح انسان کے ساتھ ہی پائی جاسکتی ہے۔

تعریض: وہ کنایہ ہے جس میں کلام کو کسی ایک جانب مائل کر دیا جائے یعنی اس میں اشارہ ایک جانب ہو اور مراد دوسری جانب، اس تعریض کو سمجھنے کے لیے حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ سیاق کلام کا سہارا لینا پڑے گا، جیسے کسی ایسے شخص

سے جو لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہو یہ کہا جائے "خير الناس من ينفع الناس" بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔

مثال مذکور سے قائل کا مقصد یہ ہے کہ تم بہترین آدمی نہیں ہو، اس لیے کہ تم لوگوں کو نفع نہیں پہنچاتے ہو مگر وضاحت کے ساتھ یہ نہیں کہا؛ بل کہ کلام کا رخ ایک جانب کر کے دوسری جانب سے مقصد کو واضح کر دیا اسی کا نام تعریض ہے۔

عِلمُ البَدِيعِ

اَلْبَدِيعُ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهٖ وُجُوهُ تَحْسِينِ الْكَلَامِ الْمُطَابِقِ لِمُقْتَضَى الْحَالِ وَهٰذِهِ الْوُجُوهُ مَا يَرْجِعُ مِنْهَا إِلٰى تَحْسِينِ الْمَعْنٰى يُسَمّٰى بِالْمُحَسِّنَاتِ الْمَعْنَوِيَّةِ وَمَا يَرْجِعُ مِنْهَا إِلَى تَحْسِينِ اللَّفْظِ يُسَمّٰى بِالْمُحَسِّنَاتِ اللَّفْظِيَّةِ .

علم بدیع

علم بدیع وہ علم ہے جس کے ذریعہ اس کلام کو خوبصورت بنانے کے طریقے معلوم ہوں جو (کلام) مقتضائے حال کے مطابق ہو، اور ان طریقوں میں سے جو معنی کی تحسین کی طرف راجع ہوں ان کا نام محسنات معنویہ رکھا جاتا ہے اور جو لفظ کی تحسین کی طرف راجع ہوں ان کا نام محسنات لفظیہ رکھا جاتا ہے۔

تشریح: علم معانی اور علم بیان سے فراغت کے بعد اب حضرات مصنفینؒ علم بدیع کو بیان فرمارہے ہیں، بدیع مشتق ہے بَدَعَ يَبْدَعُ بَدْعًا (ف) سے جس کے معنی ہیں بغیر نمونے کے کوئی چیز بنانا، لہٰذا بدیع کے لغوی معنی ہوئے انوکھی چیز بنانے والا، اور بلاغت کی اصطلاح میں علم بدیع اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے وہ طریقے معلوم ہوں جن سے کلام کو مزین اور خوب صورت بنایا جاتا ہے مگر مطلق کلام نہیں؛ بل کہ وہ کلام جس میں مقتضائے حال کی رعایت کی گئی ہو اور

اس کی دلالت معنیٔ مقصود پر بالکل واضح ہو، یعنی ایسا کلام جس میں مذکورہ دونوں علوم (معانی اور بیان) کی رعایت کی جاچکی ہو، بایں طور کہ علم معانی کی رعایت کے نتیجے میں وہ مقتضائے حال کے مطابق ہو اور علم بیان کی رعایت کے نتیجے میں معنیٔ مرادی پر واضح الدلالت ہو، اسی تفصیل سے ان علوم ثلاثہ کی حیثیت بھی معلوم ہوگئی کہ علم معانی اور بیان کا اثر کلام کے معنیٔ مرادی کی تحسین پر ذاتی طور سے ہوتا ہے، اور علم بدیع کا اثر عارضی طور پر ہوتا ہے کہ کلام پہلے مطابق مقتضائے حال اور واضح الدلالت ہو پھر علم بدیع اسے لفظی یا معنوی اعتبار سے مزید مزین وآراستہ کرے گا۔

وهذه الوجوه: حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ کلام کو مزین کرنے کے دو طریقے ہیں (١) وہ طریقے جن کا تعلق معنی سے ہے یعنی جن سے کلام کے معنی میں حسن وجمال پیدا ہوتا ہے (٢) وہ طریقے جن کا تعلق لفظ سے ہے یعنی جن سے لفظ میں حسن وجمال پیدا ہوتا ہے، پہلی قسم کا نام محسنات معنویہ اور دوسری قسم کا نام محسنات لفظیہ ہے۔

مُحسِّناتٌ معنوِيَّةٌ

(١) التَّورِيَةُ : أنْ يُذْكَرَ لَفْظٌ لَهُ مَعْنيَانِ قَرِيْبٌ يَتبادَرُ فَهْمُهُ مِنَ الكَلامِ ، وَبعِيدٌ هُوَ المُرادُ بِالإفادَةِ لِقَرِينَةٍ خَفِيَّةٍ نَحوُ "وَهُوَ الَّذِى يَتوَفّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعلَمُ مَاجَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ" أرادَ بِقَولِهِ "جَرَحْتُمْ" معناهُ البَعِيدَ وَهُوَ اِرْتِكَابُ الذُّنُوبِ وكَقَولِهِ ؎

يَا سَيِّدًا حَازَ لُطفًا لَهُ البَرَايَا عَبِيْدُ
أنْتَ الحُسَيْنُ ولٰكِنْ جَفَاكَ فِينَا يَزِيدُ

مَعْنٰى يَزِيدُ القَرِيبُ أنَّهُ عَلَمٌ وَمَعْنَاهُ البَعِيدُ المَقْصُودُ أنَّهُ فِعْلٌ مُضَارِعٌ مِنْ زَادَ

(٢) الإِيْهَامُ إِيْرَادُ الكَلامِ مُحْتَمِلاً لِوَجْهَيْنِ مُتَضَادَّيْنِ نَحْوُ ؎

بَارَكَ اللّٰهُ لِلْحَسَنِ وَلِبُوْرَانَ فِيْ الخَتَنِ
يَا إِمَامَ الهُدٰى ظَفِرْ تَ وَلٰكِنْ بِبِنْتِ مَنْ

فَإِنَّ قَوْلَهُ "بِبِنْتِ مَنْ" يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ مَدْحاً لِعَظْمَةٍ وَأَنْ يَكُوْنَ ذَمّاً لِدَنَاءَة.

محسنات معنویہ

۱؎ توریہ یہ ہے کہ (کلام میں) ایسا لفظ ذکر کیا جائے جس کے دو معنی ہوں، ایک قریب، جس کو کلام سے بہت جلد سمجھ لیا جائے، دوسرا بعید وہ ایسا معنی ہے جو فائدہ پہنچانے کے لیے مقصود ہو کسی مخفی قرینے کی وجہ سے، جیسے "وھو الذی الخ" وہ ایسا ہے جو رات میں تمہاری روح کو یک گونہ قبض کر دیتا ہے اور جو کچھ دن میں کرتے ہو اس کو جانتا ہے، اپنے قول "جرحتم" سے اس کا معنیٰ بعید مراد لیا ہے اور وہ گناہوں کا ارتکاب کرنا ہے اور جیسے کہ شاعر کا شعر یا سیداً الخ ؎

اے آقا! جنہوں نے بھلائی اکٹھا کر رکھی ہے (جو الطاف وعنایات کے جامع ہیں) جن کی ساری مخلوق غلام ہے۔ آپ حسین ہی ہیں لیکن آپ کی بے رخی ہمارے سلسلے میں بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

یزید کا معنیٰ قریب علم ہے اور اس کا معنی بعید جو اس سے مقصود ہے، وہ "زاد" کا فعل مضارع ہے۔

۲؎ ایہام کلام میں ایسا لفظ لانا ہے جو دو متضاد وجہوں کا احتمال رکھتا ہو، جیسے شاعر کا شعر بارك الله ؎

اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے حسن اور بوران کے حق میں رشتۂ ازدواج کے سلسلے میں۔ اے ہدایت کے امام! آپ تو بامراد ہو گئے لیکن کس کی صاحبزادی کے ساتھ؟

کیوں کہ شاعر کا قول "ببنت من" احتمال رکھتا ہے کہ یہ عظمت کے اعتبار سے مدح ہو اور کمینگی کے لحاظ سے ذم ہو۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفینؒ نے محسنات معنویہ میں سے دو قسموں (توریہ، ایہام) کی وضاحت کی ہے چناں چہ فرماتے ہیں کہ توریہ یہ ہے کہ ایک لفظ بولیں جس کے دو معنی ہوں ایک معنیٰ قریب، کہ لفظ بولتے ہی وہ معنی ذہن میں آجائے۔ اور دوسرے بعید کہ جو فوراً ذہن میں نہ آئے؛ بل کہ اس میں کچھ غور وفکر کی ضرورت پڑے اس بنیاد پر کہ قرینہ مخفی اور غیر واضح ہے، جیسے "وهو الذی يتوفكم بالليل ويعلم ماجرحتم بالنار"

آیت کریمہ میں محل استشہاد "جرحتم" ہے جس کے دو معنی ہیں (۱) زخمی کرنا، زخمی ہونا (۲) گناہوں کا مرتکب ہونا، یہاں دوسرا معنیٰ "ارتکابِ ذنوب" ہی مراد ہے، کیوں کہ ذہن اول وہلہ میں زخمی والے معنی کی طرف جاتا ہے دوسرے معنی کی طرف نہیں جاتا؛ بل کہ غور وفکر کے بعد جاتا ہے، اور دوسری مثال شاعر کا شعر

يا سيد احاز لطفا لـه البرايا عبيد

انت الحسين ولكن جفاك فينا يزيد

لغات: حازَ يحُوزُ حَوزًا (ن) اکٹھا کرنا، جمع کرنا، بَرایا (واحد) بَرِيَّةٌ، مخلوق۔ عَبِيدٌ واحد، عبْدٌ غلام۔ جَفَا يَجْفُوْا جَفَاءً (ن) اعراض کرنا، بدسلوکی سے پیش آنا۔

ترکیب: یا حرف ندا قائم مقام ادعو فعل کے، سیدًا موصوف "حاز لُطْفًا" فعل بافاعل ومفعول جملہ شدہ صفت، موصوف باصفت منادی شدہ جملہ انشائیہ، البرايا مبتدا "عبيد له" خبر "أنت الحسين" مبتدا وخبر جملہ شدہ معطوف علیہ، ولكن عاطفہ "جفاك" مبتدا "يزيد فينا" جملہ شدہ خبر، مبتدا با خبر معطوف شدہ جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "یزید" ہے جس کے دو معنی ہیں (۱) علم، یعنی حضرت معاویہؓ کا بیٹا یزید (۲) زاد کا فعل مضارع، زاد یزید زیادة بڑھنا، زیادہ ہونا، یہاں دوسرا معنی ہی مراد ہے۔

یہاں یہ جان لینا خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ توریہ کی دو قسمیں ہیں (۱) مجردہ (۲) مرشحہ، مجردہ وہ توریہ ہے جس میں معنی قریب کا کوئی مناسب مذکور نہ ہو، جیسے کہ پہلی مثال میں "جرح" کا کوئی مناسب مذکور نہیں اور مرشحہ وہ توریہ ہے جس میں معنیٔ قریبی کا کوئی مناسب بھی مذکور ہو، جیسے کہ دوسری مثال میں "یزید" کا مناسب "حسین" مذکور ہے، پہلی مثال توریہ مجردہ کی ہے اور دوسری مثال مرشحہ کی

۲۔ الایہام ایراد الکلام: فرماتے ہیں کہ محسنات معنویہ کی دوسری قسم ایہام ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں ایسا لفظ لایا جائے جس میں دو متضاد وجہوں کا احتمال ہو، جیسے

بارك الله للحسن ولبوران في الختن

يا إمام الهدى ظفر تَ ولكن ببنت من؟

لغات: بارك مباركة برکت عطا فرمانا۔ خَتَنٌ (ج) أختان عورت کی طرف سے رشتہ، خَتَنَ يَخْتُنُ خُتُونًا (ن) داماد بننا، ظَفِرَ يَظْفَرُ ظَفْرًا (س) کامیاب ہونا۔

ترکیب: بارك الله فعل فاعل "للحسن" جار با مجرور معطوف علیہ، لبوران معطوف ہر دو متعلق بہ بارك، في الختن متعلق ثانی، فعل با فاعل و ہر دو متعلق جملہ فعلیہ خبریہ ہوا، یا إمام الهدیٰ ندا با منادی جملہ ندائیہ انشائیہ، ظفرت فعل با فاعل جملہ معطوف علیہ، لکن عاطفہ، ببنت من مضاف با مضاف الیہ مجرور شدہ متعلق بہ ظفرت محذوف، معطوف شدہ جملہ معطوفہ ہوا۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "ببنت من؟" ہے جس میں دو متضاد وجہوں کا

احتمال ہے، ایک یہ ہے کہ عظمت کو بیان کر کے تعریف مقصود ہے، یعنی یہ کہ کامیابی کا سہرا۔ اس وجہ سے ملا کہ یہ حسن بن سہل کی صاحبزادی تھی، یہ معنی حسن بن سہل کی مدح پر دلالت کرر ہا ہے، دوسرے یہ کہ کمینگی کے اعتبار سے مذمت مقصود ہے یعنی یہ کہ حسن بن سہل جیسوں کی لڑکی کے ساتھ بھی آپ کا تعلق خوش اسلوبی کے ساتھ ہوگیا۔ اس میں حسن بن سہل کی مذمت ہے کہ اس کمینے شخص کی لڑکی سے کیسے آپ نے رشتہ کرلیا۔

حسن سے مراد حسن بن سہل ہے جو مشہور عباسی خاندان کے بادشاہ مامون کا وزیر تھا اس کی لڑکی کا نام بوران تھا جس سے خلیفہ مامون نے شادی کی اسی موقع پر یہ اشعار محمد بن حزم نے کہے تھے۔

(۳) التَّوجِيهُ إفَادَةُ مَعْنًى بِألفَاظٍ مَوضُوعَةٍ لهُ وَلكِنَّهَا أسْمَاءٌ لِنَاسٍ او غيرِهِمْ كَقولِ بَعضِهِمْ يَصِفُ نَهْرًا

إذَا فَاخَرَتْهُ الرِّيحُ وَلَّتْ عَلِيلَةً بِأذْيَالِ كُثْبَانِ الثَّرىٰ تَتَعَثَّرُ
بِهِ الفَضْلُ يَبْدُو وَالرَّبِيعُ وَكَمْ غَدَا بِهِ الرَّوضُ يَحْيىٰ وَهَوَ لاشَكَّ جَعْفَر

فَـ"الفَضْلُ، وَالرَّبِيعُ، وَيَحْيىٰ، وَجَعْفَرُ" أَسْمَاءُ نَاسٍ وَكَقَولِهِ ؎

وَمَا حُسنُ بَيتٍ لهُ زُخْرُفٌ تَرَاهُ إذَا زُلْزِلَتْ لَمْ يَكُنْ

فَإنَّ "زُخْرُفًا" وَ "إِذَا زُلْزِلَتْ" وَ "لَمْ يَكُنْ" أَسْمَاءُ سُوَرٍ مِنَ القُرآنِ

(٤) الطِّبَاقُ هُوَ الجَمْعُ بَينَ مَعْنَيَيْنِ مُتَقَابِلَينِ نحوُ قَولِهِ تَعَالىٰ "وَتَحْسَبُهُمْ أيقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ، وَلكِنَّ اَكثَرَ النَّاسِ لايَعْلَمُونَ ، يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا".

ترجمہ: (۳) توجیہ کسی معنی کو بیان کرنا ایسے الفاظ کے ذریعے جن کو اس کے لیے وضع کیا گیا ہو لیکن یہ الفاظ انسانوں یا ان کے علاوہ کسی اور کے نام ہوں جیسے کسی شاعر کا شعر نہر کا وصف بیان کرتے ہوئے "إذا فاخرته" ؎

جب ہوا اس (ممدوح) کے سامنے ناز وانداز سے چلتی ہے تو پیٹھ دکھا کر نمناک مٹی کے ریتیلے ٹیلوں کے دامن سے الجھ جاتی ہے۔

اسی کے طفیل فضل اور ربیع لہلہار ہے ہیں اور اسی کی وجہ سے کتنے باغات سبزہ زار ہیں، اور وہ بلاشبہ ایک چشمہ ہے۔

تو ''فضل، ربیع، یحییٰ اور جعفر'' لوگوں کے نام ہیں، اور جیسے شاعر کا شعر وما حسن الخ ۔

اور اس گھر کی کوئی خوب صورتی نہیں جس کے لیے صرف ظاہری خوب صورتی ہو تم اس گھر کو دیکھو گے جب زلزلہ آئے گا باقی نہیں رہے گا۔

کیوں کہ ''زخرف، إذا زلزلت'' اور ''لم یکن'' قرآن کریم کی سورتوں کے نام ہیں۔

(۴) طباق، وہ جمع کرنا ہے دو ایسے معنوں کے درمیان جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں، جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ''و تحسبهم الخ'' اور تم انہیں بیدار سمجھو گے، حالاں کہ وہ سوئے ہوئے ہیں ''ولكن اكثر الناس'' لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں محسنات لفظیہ کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں (۱) توجیہ (۲) طباق۔

توجیہ یہ ہے کہ کسی معنی کو ایسے الفاظ کے ذریعے بیان کیا جائے جو اسی معنی کے لیے وضع کیے گئے ہوں بشرطے کہ وہ الفاظ انسانوں یا ان کے علاوہ کے نام ہوں، جیسے کہ شاعر کا شعر جس نے نہر کا وصف بیان کیا ہے

إذا فاخرته الريح ولت عليلة　　بأذيال كثبان الثرى تتعثر

به الفضل يبدوا والربيع وكم غدا　　به الروض يحيىٰ وهو لاشك جفعر

لغات: فاخرَ مُفاخرَةً (مفاعلۃ) اظہار فخر کرنا۔ وَلّٰى يولّي تولِيَةً

(تفعیل) پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔ أذیال واحد، ذیلٌ دامن۔ کُثْبانٌ واحد کثِیب ریت کاٹیلہ۔ ثری (ج) أثراء نمناک مٹی۔ تعثَّرَ یتعَثَّرُ تعَثُّرًا (تفعل) رک جانا، الجھنا۔ حیی یحییٰ حیاةً (س) زندہ رہنا۔ جعفر (ج) جعافر نالہ، ندی

ترکیب: إذا شرطیہ ''فاخرته الریح'' فعل بافاعل ومفعول جملہ فعلیہ خبریہ شرط ''ولّت'' فعل، ضمیر ذوالحال ''علیلة'' حال، ذوالحال باحال فاعل، جملہ شدہ جزا، باجارہ أذیال کثبان الثریٰ مرکب اضافی شدہ مجرور متعلق مقدم بہ تتعثر، به جار بامجرور متعلق بہ یبدو، ''الفضل والربیع'' معطوف علیہ ومعطوف فاعلِ یبدو، کم خبریہ، روضٍ تمیز محذوف، ''غدا'' فعل ناقص الروض اسم ''یحیی'' خبر ''هو'' مبتدا ''جعفر'' خبر ''لاشك'' أي لاشك فیه، لائے نفی جنس ''شكّ'' اسم ''فیه'' خبر۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''فضل، ربیع، یحیٰ اور جعفر'' یہ چاروں الفاظ ہیں یہ الفاظ اپنے معنیٔ موضوع لہ (کمال، موسم بہار، زندہ رہتا ہے، ندی) کو بھی بتلا رہے ہیں اور انسانوں کے نام بھی ہیں، اسی طرح دوسرا شعر ؎

وما حسن بیت له زخرف تراه إذا زلزلت لم یکن

لغات: زُخْرُفٌ (ج) زَخَارِفُ ظاہری خوبصورتی۔ زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ زَلْزَلَةً فعللة بھونچال آنا۔

ترکیب: واو مستانفہ ''ما'' نافیہ مشابہ بہ لیس ''حسن'' مضاف ''بیت'' موصوف ''له'' خبر مقدم ''زخرف'' مبتدا مؤخر، جملہ صفت، موصوف باصفت اسم ما ''تراه'' فعل بافاعل ومفعول جملہ شدہ خبر ''إذا زلزلت'' شرط ''لم یکن'' جزا۔

اس شعر میں محل استشہاد ''زخرف، إذا زلزلت، لم یکن'' یہ تینوں الفاظ ہیں، جو اپنے معنیٔ موضوع لہ کو بتلانے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے علاوہ قرآن کریم کی سورتوں کے نام ہیں۔

الطباق هو الجمع: محسنات معنویہ کی چوتھی قسم طباق ہے، یعنی کلام میں ایسے دو معانی کو جمع کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں، خواہ وہ دونوں اسم ہوں یا فعل، اسم، جیسے "وتحسبهم ایقاظًا وهم رقود" محل استشهاد "أیقاظًا" (جاگنے والے) اور "رقودٌ" (سونے والے) ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں، فعل کی مثال، جیسے "ولکن اکثر الناس لایعلمون، یعلمون ظاهرًا من الحیٰوة الدنیا"

آیت مذکورہ میں محل استشہاد "لایعلمون" اور "یعلمون" ہیں جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور دونوں فعل ہیں، ایک فعل منفی ہے اور ایک فعل مثبت ہے۔

(٥) ومِنْ الطِّبَاقِ المُقَابَلَةُ وَهُوَ أنْ يُؤْتٰى بِمَعْنَيَيْنِ أوْ أكْثَرَ ثُمَّ يُؤْتٰى بِمَا يُقَابِلُ ذٰلِكَ عَلَى التَّرتِيبِ ، نحوُ قَولِهِ تَعَالٰى "فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلاً وَلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا"

(٦) وَمِنْهُ التَّدْبِيجُ وَهُوَ التَّقَابُلُ بَينَ أَلْفَاظِ الألوَانِ ، كقَولِهِ ؎

تردّٰى ثِيَابَ المَوتِ حُمْرًا فَمَا أتٰى لَهَا اللَّيْلُ إلَّا وَهِيَ مِنْ سُنْدُسٍ خُضْرِ

(٧) الإدْمَاجُ أنْ يُضَمَّنَ كَلامٌ سِيقَ لِمَعْنًى آخَرَ نحوُ قَولِ أبِي الطَّيِّبِ ؎

أُقَلِّبُ فِيهِ أجْفَانِي كَأنِّي اعُدُّ بِهَا عَلَى الدَّهْرِ الذُّنُوْبَا

فَإنَّهُ ضَمَّنَ وَصْفَ اللَّيلِ بِالطُّولِ الشِّكَايَةَ مِنَ الدَّهرِ .

(٨) وَمِنَ الإدْمَاجِ مَا يُسَمّٰى بِالإسْتِتْبَاعِ وَهُوَ المَدْحُ بِشَيْءٍ عَلٰى وَجْهٍ يَسْتَتْبِعُ المَدْحَ بِشَيْءٍ آخَرَ كَقَولِ الخُوَارِزمِي ؎

سَمْحُ البَدِيهَةِ لَيسَ يُمْسِكُ لفظَهُ فَكَأنَّمَا ألفَاظُهُ مِنْ مَالِهِ

ترجمہ: (۵) طباق ہی کی ایک قسم مقابلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دو معنوں یا اس

سے زیادہ کو لایا جائے پھر ان کا متقابل لایا جائے ترتیب وار، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "فلیضحکوا الخ" سو تھوڑے دنوں ہنس لیں اور بہت دنوں روتے رہیں۔

(٦) اور طباق ہی کی ایک قسم تدبیج ہے اور وہ (کلام میں) رنگوں کے الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لانا ہے، جیسے شاعر کا شعر تردّٰی ثِیابَ المَوتِ الخ۔

اس نے موت کے سرخ کپڑوں کی چادر بنالی تو ابھی ان کپڑوں پر رات بھی نہ گذری تھی کہ وہ کپڑے سبز ریشمی ہو گئے۔

(٧) ادماج یہ ہے کہ اس کلام میں جس کو کسی معنی کے لیے لایا گیا ہو دوسرے معنی کو ضمناً بیان کر دیا جائے، جیسے متنبّی کا شعر ؎

میں اس میں (رات میں) اپنی پلکیں الٹتا رہتا ہوں گویا اس کے ذریعہ میں زمانے کے گناہوں کو شمار کرتا ہوں۔

کیوں کہ شاعر نے رات کی لمبائی کے وصف بیان کرنے کے ساتھ زمانہ کی شکایت کو بھی شامل کر دیا ہے۔

(٨) اور ادماج ہی کی ایک قسم استتباع ہے اور وہ کسی صفت کے ذریعے تعریف کرنا ہے ایسے طریقے پر کہ تبعاً دوسری صفت سے بھی تعریف ہو جائے، جیسے خوارزمی کا شعر سمح البدیهة ؎

وہ (ممدوح) فی البدیہہ کہنے میں ایسا سخی ہے کہ اس کی گفتگو میں رکاوٹ نہیں ہوتی ایسا لگتا ہے کہ اس کے الفاظ اس کے مال کی جنس سے ہوں۔

تشریح: عبارت بالا میں محسنات معنویہ کی پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں قسم کو بیان کیا گیا ہے۔

(٥) مقابلہ: یہ بھی طباق ہی کی ایک قسم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دو یا زیادہ متوافق معنی لائے جائیں پھر علی الترتیب ہر لفظ کا مقابل لایا جائے، جیسے "فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً" اس آیت میں "فلیضحکوا" اور

قلیلاً متوافق لفظ ہیں اور اسی ترتیب سے "فلیضحکو" کا مقابل "ولیبکوا" اور "قلیلاً" متوافق لفظ ہیں اور اسی ترتیب سے "فلیضحکوا" کا مقابل "ولیبکوا" اور "قلیلاً" کا مقابل "کثیراً" کو لایا گیا ہے۔

(۶) ومنه التدبیج: محسنات معنویہ کی چھٹی قسم تدبیج ہے، تدبیج کے لغوی معنی تزئین ہیں، اصطلاح بلاغت میں تدبیج نام ہے کلام میں رنگوں کے الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لانا یعنی بطور مدح کسی کلام میں مختلف رنگوں کا تذکرہ کرنا، جیسے ؎

تردّٰی ثیاب الموت حمرًا فیما أتی　　لها اللیل الاّ وهي من سندس خضر

لغات: تَرَدّٰی تَرَدِّیًا (تفعل) چادر اوڑھانا۔ سندس ایک قسم کا ریشمی کپڑا

ترکیب: تردّٰی فعل بافاعل "ثیاب الموت" ذوالحال "حمرًا" حال، ذوالحال، باحال مفعول بعد ازاں جملہ فعلیہ خبریہ، فا تفصیلیہ "ما اتی" فعل منفی، لها جار مجرور متعلق بہ ما أتی "اللیل" فاعل، إلا حرف استثناء، واو مستانفہ "هي" مبتدا، من جارہ "سندس" موصوف "خضر" صفت، موصوف باصفت، مجرور شدہ متعلق بہ ثابتۃ خبر، مبتدا باخبر جملہ۔

شعر میں محل استشہاد "حمر" اور "خضر" ہیں، یہ دو رنگ ہیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں، اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ ممدوح جس وقت شہید ہوا اس کے کپڑے خون میں لت پت ہونے کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے تو گویا اس نے سرخ چادر اوڑھ رکھی تھی، مگر جب اسے دفنا دیا گیا تو وہ خون آلود کپڑے جنت کے سبز ریشمی کپڑوں میں بدل گئے یعنی اسے جنتی لباس میں ملبوس کر دیا گیا۔

(۷) الادماج: ادماج کے لغوی معنی لپیٹنے کے ہیں اور اصطلاح میں ادماج اس کلام کو کہتے ہیں جسے ایک معنی کے لیے لایا گیا ہو مگر دوسرے معنی کو بھی ضمناً شامل ہو گیا ہو، جیسے ؎

اقلبُ فيهِ أجفاني كأني اَعُدُّبها على الدهر الذنوبا

لغات: قلب تقليباً (تفعیل) الٹنا پلٹنا۔ أجفانٌ واحد، جفنٌ آنکھ کے اوپر نیچے کا پپوٹہ، دَهرٌ (ج) أدْهُرٌ و دُهُورٌ زمانہ، ذنوبٌ (واحد) ذنبٌ گناہ۔

ترکیب: اقلب فعل بافاعل، "فيه" متعلق بہ أقلب" أجفاني" مفعول بہ "كأني" حرف مشبہ بہ فعل واسم، "أعُدّ" فعل بافاعل "بها" متعلق بہ أعدّ" على الدهر" متعلق ثانی، "الذنوب" مفعول بہ، جملہ خبر کأنّ۔

شعر مذکور مشہور شاعر ابو الطیب متنبّی کا ہے جس میں اس کا اصل مقصد درازی شب کو بیان کرنا تھا مگر اسی کے ساتھ شاعر نے زمانے کی بھی شکایت کردی گویا کہ زمانے کی شکایت مقصود اصلی نہیں تھی بل کہ ضمناً ہوگئی ہے۔

(۸) ومن الادماج: ادماج ہی کی ایک قسم استتباع ہے، استتباع کے لغوی معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا اور اصطلاح میں استتباع کہتے ہیں کسی شے کی تعریف ایسے انداز سے کرنا کہ اس تعریف سے ایک اور چیز کی تعریف ہوجائے، جیسے ؎

سمح البديهة ليس يمسك لفظه فكأنما الفاظه من ماله

لغات: سَمَحَ يَسْمح سَمَاحَة (ف) بخشش کرنا۔ سمحٌ صیغہ صفت ہے بروزن فعلٌ، هو مبتدا محذوف ہے، جس سے مراد ممدوح ہے۔

ترکیب: هو مبتدا محذوف "سمح البديهة" خبر اول "ليس" فعل ناقص، ضمیر اس کا اسم "يمسك لفظه" جملہ خبر لیس شدہ خبر ثانی بہ مبتدا، فا تفصیلیہ "كأنما" ملغی " ألفاظه" مبتدا "من ماله" "موجودة" سے متعلق ہو کر خبر۔

شاعر کا مقصد ممدوح کی فصاحت اور اس کے کلام کی برجستگی پر قدرت کو بتلانا ہے کہ میرا ممدوح بڑا حاضر جواب اور برجستہ گو ہے اس کے پاس الفاظ کی کمی نہیں ہے بل کہ الفاظ کے خزانے ہیں وہ ایسا ہے جس وقت بھی کوئی اس سے سوال

کرے جواب کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، لیکن یہ تعریف ایسے انداز سے کی ہے کہ اس سے ممدوح کی ایک دوسری تعریف بھی ہوگئی یعنی اس کی فیاضی اور سخاوت کا بھی بیان ہوگیا۔

(۹) مُرَاعَاةُ النَّظِيرِ هِيَ جَمْعُ أمرٍ وَمَا يُنَاسِبُهُ لَا بِالتَّضَادِ كَقَولِهٖ

إِذَا صَدَقَ الجَدُّ افْتَرىٰ العَمُّ لِلْفَتىٰ مَكَارِمُ لَا تَخْفَىٰ وَإِنْ كَذَبَ الخَالُ

فَقَدْ جَمَعَ بَينَ الجَدِّ والعَمِّ والخَالِ ، وَالمُرادُ بِالأَوَّلِ الحَظُّ وَبِالثَّانِي عَامَّةُ النَّاسِ وبِالثَّالِثِ الظَّنُّ.

(۱۰) اَلِاسْتِخْدَامُ هُوَ ذِكرُ اللَّفظِ بِمَعنًى وَإِعَادَةُ ضَمِيرٍ عَلَيهِ بمعنًى آخَرَ وإِعَادَةُ ضَمِيرَينِ تُرِيدُ بِثَانِيْهِمَا غيرَ مَا أرَدْتَهُ بأوَّلِهِمَا ، فَالأَوَّلُ نحوُ قَولِهٖ تعَالىٰ "فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهرَ فَلْيَصُمْهُ" أرادَ بِالشَّهرِ "الهِلالَ" وبِضَمِيرِهٖ "الزَّمَانَ المَعْلُومَ" وَالثَّانِي كَقَولِهٖ ؎

فَسَقَى الغَضَا وَالسَّاكِنِيهِ وَإنْ هُمْ شَبُّوهُ بَيْنَ جَوَانِحِي وَضُلُوعِي

الغَضَا شَجَرٌ بِالبَادِيَةِ وَضَمِيرُ سَاكِنِيهِ يَعُودُ إِلَيهِ بِمَعنىٰ مَكَانِهٖ وَضَمِيرُ شَبُّوهُ يَعُودُ إِلَيهِ بِمَعْنىٰ نَارِهٖ .

ترجمہ: (۹) مراعاة النظير: وہ (کلام میں) کسی امر اور اس کے مناسب چیزوں کو جمع کرنا ہے جن کے درمیان نسبت تضاد نہ ہو، جیسے اذا صدق الخ ؎

جب نصیبہ ٹھیک ہوتا ہے تو عوام تہمت لگاتے ہیں، نوجوان کے ایسے بلند پایہ اخلاق ہیں جو ظاہر ہیں اگرچہ خیال تکذیب کرے۔

تو شاعر نے جدّ، عمّ اور خال کو جمع کر دیا ہے، پہلے سے نصیبہ دوسرے سے عوام الناس اور تیسرے سے خیال مراد ہے۔

(۱۰) استخدام: وہ لفظ کا ذکر کرنا ہے ایک معنی کے لیے اور اس پر ضمیر کا لوٹانا ہے دوسرے معنی مراد لینے کے لیے (یا لفظ کو ذکر کرکے) اور دو ضمیروں کا لوٹانا

ہے اس حال میں کہ تم دوسری ضمیر سے اس معنی کے علاوہ مراد لے رہے ہو، جو تم نے ان دونوں میں سے پہلے سے مراد لیا ہے، تو اول جیسے اللہ تعالیٰ کا قول "فمن شهد منكم الشهر فليصمه" سو جو شخص اس ماہ کو پالے اسے ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے، شہر سے مراد چاند اور اس کی ضمیر سے مراد زمانہ معلوم ہے، اور دوسرے کی مثال جیسے شاعر کا شعر فسقى الغضا الخ ؎

(دعا ہے کہ) وہ غضا کے درخت اور اس کے باشندوں کو سیراب کرے اگرچہ ان لوگوں نے اس کی آگ کو میرے پہلوؤں اور پسلیوں کے درمیان بھڑکا دیا ہے۔

غضا ایک جنگلی درخت ہے اور "ساكنيه" کی ضمیر اسی کی طرف لوٹ رہی ہے جو "موضع غضا" کے معنی میں ہے اور "شبوه" کی ضمیر بھی اسی کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ "نار غضاء" کے معنی میں ہے۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفینؒ نے محسنات معنویہ کی نویں اور دسویں قسم کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ نویں قسم مراعاۃ النظیر ہے، مراعاۃ النظیر کا مطلب یہ ہے کہ ایسے دو یا دو سے زیادہ امور کو ایک جگہ جمع کیا جائے جن کے درمیان نسبت تضاد کے علاوہ کوئی اور نسبت ہو، جیسے ؎

إذا صدق الجد افترى العم للفتى مكارم لا تخفى وإن كذب الخال

لغات: جدٌّ نصیبہ، جَدَّ یجدُّ جدًّا (س) نصیبہ والا ہونا، افتریٰ افتراءً (افتعال) کسی پر تہمت لگانا، جھوٹ باندھنا۔ فتیٰ (ج) فِتیۃٌ وفِتیانٌ نوجوان۔ مَکرُمَۃٌ (ج) مکارم کریم کا فعل، بخشش، فیاضی، اخلاق۔

ترکیب: إذا صدق الجد جملہ فعلیہ شرط "افترى العم" فعل بافاعل جملہ جزا "للفتى" جار با مجرور متعلق بہ محذوف شدہ خبر مقدم "مكارم" موصوف، "لا تخفىٰ" صفت، موصوف باصفت مبتدا، جملہ خبریہ، إن وصلیہ "كذب

الخال'' فعل با فاعل شدہ جملہ خبریہ۔

شعر مذکور میں شاعر نے ''جد، عم، خال'' تینوں کو جمع کر دیا ہے ''جد'' کے معنی ''دادا'' ''عم'' کے معنی چچا اور خال کے معنی ''ماموں'' اور ان تینوں معنوں میں مناسبت موجود ہے اور یہ مناسبت تضاد کی بھی نہیں ہے مگر شعر میں یہ معنیٰ مذکور مراد نہیں ہیں بل کہ ''جد'' سے مراد ''نصیبہ'' ''عم'' سے مراد ''عوام الناس'' اور ''خال'' سے مراد ''خیال'' ہے۔

الاستخدام: دسویں قسم صفت استخدام ہے، استخدام کے لغوی معنی ہیں خادم بنانا، اصطلاح بلاغت میں استخدام کہتے ہیں کہ کسی لفظ کے دو معنی ہوں، ایک معنی تو لفظ کو ذکر کر کے اس سے مراد لیں اور دوسرا معنی اس کی ضمیر سے جو اس لفظ کی طرف راجع ہے، یا استخدام کا مطلب یہ ہے کہ کسی لفظ کے دو معنی ہوں اور اس لفظ کی طرف دو ضمیریں لوٹائی جائیں جن میں سے پہلی ضمیر سے ایک معنی مراد لیں اور دوسری ضمیر سے دوسرا معنی مراد لیں، پہلے کی مثال، جیسے **فمن شهد منكم الشهر الخ**

آیت کریمہ میں محل استشہاد لفظ **"الشهر"** اور **"فليصمه"** کی ہ ضمیر ہے ''**شهر**'' ایک لفظ ہے جس کے دو معنی ہیں (۱) ہلال رمضان (۲) ماہ رمضان، لفظ شہر سے تو ہلال رمضان مراد ہے اور **فليصمه** کی ہ ضمیر سے دوسرا معنیٰ ''زمانۂ معلوم'' یعنی ماہ رمضان مراد ہے، دوسری قسم کی مثال جیسے شاعر بختری کا یہ شعر ؎

فسقى الغضا والساكنيه وإن هم شبوه بين جوانحي وضلوعي

لغات: **سقى يسقِيْ سَقيًا** (ض) سیراب کرنا۔ **غضا** جھاؤ کا درخت جس کی لکڑی بہت سخت ہوتی ہے اور اس کی چنگاری دیر تک نہیں بجھتی **شبا النار يشبو شبواً** (ن) آگ جلانا، آگ روشن کرنا۔ **جوانح** (واحد) **جانح** جانب، پہلو۔ **ضلوعٌ** (واحد) **ضِلعٌ** پسلی۔

ترکیب: سقی فعل بافاعل ''الغضا'' معطوف علیہ''الساکنیه'' معطوف، معطوف علیہ ومعطوف مفعول، فعل بافاعل ومفعول جملہ خبریہ، إن وصلیہ، ''هم'' مبتدا، ''شبوه'' فعل بافاعل مفعول، بین مضاف،''جوانحي وضلوعي'' معطوف علیہ ومعطوف شدہ مضاف الیہ، بعدازاں ظرف شبوہ۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''الغضا'' اور الساکنیه کی ضمیر ''ہ'' اور شبوہ کی ضمیر ''ہ'' یہ تینوں الفاظ ہیں بایں طور کہ ''الغضا'' ایک لفظ ہے جس کی طرف دوضمیریں لوٹ رہی ہیں، اور دونوں ضمیر کا معنی الگ الگ ہے، چناں چہ ساکنیہ کی ضمیر ''غضا'' کی طرف لوٹ رہی ہے اور وہ ''موضع غضا'' کے معنی میں ہے اور ''شبوہ'' کی ضمیرِ مفعول کا مرجع غضا ہے جو ''نار غضا'' کے معنی میں ہے۔

(۱۱) الاستِطْرَادُ هُوَ أَنْ يَخْرُجَ الْمُتَكَلِّمُ مِنَ الغَرَضِ الَّذِيْ هُوَ فِيهِ إِلَى آخَرَ لِمُنَاسَبَةٍ ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى تَتْمِيمِ الأَوَّلِ كَقَوْلِ السَّموألِ ؎

وَإِنَّا أُنَاسٌ لاَ نَرَىٰ القَتْلَ سُبَّةً إِذَا مَا رَأَتْهُ عَامِرٌ وَسَلُولُ
يُقَرِّبُ حُبُّ المَوتِ آجَالَنَا لَنَا وَتَكْرَهُهُ آجَالُهُمْ فَتَطُولُ
وَمَا مَاتَ مِنَّا سَيِّدٌ حَتْفَ أَنْفِهِ وَلاَ طُلَّ مِنَّا حَيْثُ كَانَ قَتِيلُ

فَسِيَاقُ القَصِيدَةِ لِلْفَخْرِ واسْتَطْرَدَ مِنْهُ إِلَى هِجَاءِ عَامِرٍ وَسَلُولٍ ثُمَّ عَادَ إِلَيهِ .

(۱۲) الافْتِنَانُ هُوَ الجَمْعُ بينَ فَنَّيْنِ مُخْتَلِفَينِ كَالغَزَلِ والحَمَاسَةِ وَالمَدْحِ وَالهِجَاءِ ، والتَّعْزِيَةِ وَالتَّهْنِئَةِ كَقَوْلِ عَبْدِ اللّٰهِ بن هَمَّامِ السَّلُولِيِّ حِينَ دَخَلَ عَلَى يَزِيْدَ وَقَدْ مَاتَ أَبُوهُ مُعَاوِيَةُ وَخَلَفَهُ هُوَ فِي المُلْكِ: "آجَرَكَ اللّٰهُ عَلَى الرَّزِيَّةِ وَبَارَكَ لَكَ فِي العَطِيَّةِ وَأَعَانَكَ عَلَى الرَّعِيَّةِ فَقَدْ رُزِئْتَ عَظِيمًا وَأُعْطِيتَ جَسِيمًا فَاشْكُرِ اللّٰهَ عَلَى مَا أُعْطِيتَ واصْبِرْ عَلَى مَارُزِئْتَ فَقَدْ فَقَدتَ الخَلِيفَةَ وَأُعْطِيتَ الخِلاَفَةَ فَفَارَقْتَ خَلِيلاً وَوُهِبْتَ

جَلِيلًا".

اِصْبِرْ يَزِيدُ فَقَدْ فَارَقْتَ ذَاثِقَةٍ وَاشْكُرْ حِبَاءَ الَّذِي بِالْمُلْكِ أَصْفَاكَ
لَارُزْءَ أَصْبَحَ فِي الْأَقْوَامِ نَعْلَمُهُ كَمَا رُزِئْتَ وَلَا عُقْبَى كَعُقْبَاكَ

ترجمہ: استطرادوہ یہ ہے کہ متکلم اس غرض سے جس میں وہ تھا دوسری غرض کی طرف نکل جائے کسی مناسبت کی وجہ سے، پھر پہلی غرض کو پورا کرنے کے لیے لوٹ آئے، جیسے سمول کا یہ شعر وإنّا أناسٌ ۔

اور ہم ایسے لوگ ہیں جو قتل کو باعثِ عار نہیں سمجھتے جب کہ عامر اور سلول کے قبیلے اس کو ایسا ہی (باعث عار) سمجھتے ہیں۔

موت کی محبت ہم سے ہماری موتوں کو قریب کردیتی ہے اور ان کی موت کے اوقات مقررہ ان سے نفرت کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی عمریں بڑھ جاتی ہیں

اور ہمارا کوئی سردار اپنی موت نہیں مرا ہے اور نہ ہی ہمارے کسی بھی مقتول کو بلا قصاص چھوڑ دیا گیا ہے جہاں بھی پایا گیا ہو۔

تو قصیدے کا سیاق فخر کے لیے ہے اور اسی کے درمیان عامر اور سلول کے ہجو کو لے آیا پھر اسی فخر کی طرف لوٹا۔

(۱۲) افتنان وہ دو مختلف فنون کا جمع کرنا ہے، جیسے کہ غزل اور حماسہ، مدح اور ہجو، تعزیت وتہنیت، جیسے کہ عبداللہ بن ہمام السلولی کا وہ قول جسے اس وقت کہا تھا جب کہ یزید کے پاس گیا تھا جب کہ اس کے والد حضرت معاویہؓ کا انتقال ہوگیا تھا اور بادشاہت میں ان کا جانشین بنا تھا، اجرك الله الخ اللہ تعالیٰ آپ کو مصیبت پر اجر عطا فرمائے اور اس عطیہ میں آپ کے لیے برکت عطا فرمائے اور رعایا پر آپ کی عنایت فرمائے، کیوں کہ آپ بڑی مصیبت میں مبتلا ہوگئے اور آپ کو ایک عظیم چیز عطا کی گئی، لہٰذا آپ اللہ کا شکر ادا کریں اس چیز پر جو آپ کو عطا کی گئی، اور صبر کریں اس مصیبت پر جس میں مبتلا کئے گئے ہیں کیوں کہ آپ خلیفہ

سے محروم کردیئے گئے اور خلافت سے نوازے گئے، تو آپ نے ایک خلیل کو داغ مفارقت دی اور ایک عظیم چیز سے مالا مال کیے گئے۔

اے یزید! تم صبر سے کام لو کیوں کہ قابل اعتماد (مربی) تم سے جدا ہو گئے اور اس ذات کی بخشش کا شکریہ ادا کرو جس نے تم کو بادشاہت کے لیے منتخب کیا۔

ہماری معلومات کے مطابق اقوام عالم میں سے کسی پر اتنی بڑی مصیبت نازل نہیں ہوئی جتنی آپ پر ہوئی اور نہ ہی اتنا بہترین انجام (ہمیں معلوم ہے) جتنا اچھا کہ آپ کا انجام۔

تشریح: الاستطراد: حضرات مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ محسنات معنویہ کی گیارہویں قسم استطراد ہے، استطراد کے لغوی معنی ہیں کلام کو اس طرح بیان کرنا کہ اس سے دوسرا کلام لازم آجائے، اور اصطلاح بلاغت میں، استطراد یہ ہے کہ متکلم اپنے اس مقصد کو جسے وہ بیان کرر ہا تھا ناقص چھوڑ کر دوسرے مقصد میں لگ جائے کسی مناسبت کی وجہ سے، پھر دوبارہ پہلے مقصد کی تکمیل کے لیے لوٹے، جیسے کہ سموٴل کا یہ شعر ؎

وإنا أناس لانـــرى القتل سُبَّةً　　إذا ما رأتـــه عامر وسلول

يقرب حب الموت آجا لنا لنا　　وتكرهـــه آجالهم فتطول

ومامات مناسيّـــدٌ حتف أنفه　　ولا طُلَّ مناحيث كان قتيل

لغات: أناس (واحد) اِنسٌ آدمی۔ سُبَّة عار، بے عزتی۔ آجالٌ (واحد) أجلٌ وقت مقررہ۔ حتف (ج) حتوف موت، محاورہ ہے "هو مات حتف أنفه" وہ اپنی موت مرا، طَلَّ يطلُّ طلاً (س) بغیر قصاص کے چھوڑ دینا، قَتيلٌ صیغہ صفت بمعنی مقتول۔

ترکیب: إن حرف مشبہ بہ فعل، ضمیر اسم "أناس" موصوف "لانرى القتل سُبة" فعل بافاعل وہر دو مفعول (القتل و السبة) جملہ خبریہ شدہ صفت،

20

موصوف باصفت خبر إنّ "إذا" ظرفیہ مازائدہ "رأت" فعل، "ہ" مفعول "عامرٌ وسلول" معطوف علیہ با معطوف فاعل، جملہ ظرف لاانری کا "یقرّب" فعل، "حب الموت" فاعل "اجالنا" مفعول "لنا" متعلق جملہ فعلیہ خبریہ معطوف علیہ، واو عاطفہ "تکرہ" فعل، "ہٗ" مفعول "آجالھم" فاعل، معطوف علیہ بامعطوف، فا نتیجیہ "تطول" جملہ شدہ معطوف "ما مات" فعلٌ "منا" متعلق "سید" فاعل "حتف أنفہ" مفعول مطلق، واو عاطفہ "طُل" فعل "منا" متعلق "قتیل" نائب فاعل "حیث کان" مضاف بامضاف الیہ ظرف۔

اشعار مذکورہ کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر نے اپنے خاندان کی شجاعت وحماست پر فخر ظاہر کیا ہے بایں طور کہ ہم لوگ قتل وجنگ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، اس لیے کہ ان چیزوں سے ہمارا روزانہ سامنا پڑتا ہے حتی کہ یہ چیزیں ہماری عادت میں داخل ہوگئی ہیں ہم اس کو بالکل معیوب سمجھتے ہی نہیں، پھر اس کے بعد دوسرے مصرعے میں عامر اور سلول کی مذمت بھی کردی کہ یہ لوگ جنگ سے گھبراتے ہیں اسی طریقے سے دوسرے میں پہلے اپنا فخر بیان کیا اور ان دونوں قبیلوں کی مذمت کی، اور پھر تیسرے شعر میں اپنی بڑائی کی طرف لوٹ آیا کہ ہم اتنے بہادر اور دلیر ہیں کہ ہمارا کوئی سردار اب تک اپنی موت نہیں مرا ہے؛ بل کہ ہر ایک نے مقابلہ کرتے ہوئے ہی اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی ہے اور ہم نے اپنے مقتولین میں سے ہر ایک کا قصاص لے لیا ہے۔

الافتنان: محسنات معنویہ کی بارہویں قسم افتنان ہے، افتنان کے لغوی معنی ہیں اچھے اسلوب سے بیان کرنا، بلاغت کی اصطلاح میں افتنان نام ہے کلام میں دو مختلف فنون کا جمع کرنا، مثلاً غزل یعنی عشق ومحبت کے کلام اور حماسہ یعنی دلیری اور بہادری کے متعلق باتیں، ان دونوں فنوں کا جمع کرنا، اسی طرح مدح اور ہجو یعنی کسی کی تعریف اور کسی کی مذمت وغیرہ کو جمع کرنا اور اسی طریقے سے تعزیت

وتہنیت یعنی تسلی اور مبارک بادی جیسے دوفنوں کو جمع کرنا وغیرہ
افتنان کی مثال میں مصنفینؒ نے عبداللہ بن ہمام السلولی کا وہ قول پیش کیا ہے جو اس نے یزید ابن معاویہ سے اس وقت کہا تھا جب یزید کے والد حضرت امیر معاویہؓ کا انتقال ہو گیا تھا اور یزید کو سلطنت اسلامیہ کی خلافت ملی تھی عبداللہ بن ہمام نے اپنے قول میں تعزیت اور تہنیت دونوں قسم کے کلام کو بہت ہی بہترین اسلوب میں جمع کیا ہے، چناں چہ "اجرك الله على الزرية" میں تعزیت کا معنی ہے اور "بارك لكَ في العطية الخ" میں تہنیت کا معنی ہے، اسی طریقے سے "فقد رزئت عظيمًا" میں تعزیت اور "أعطيت جسيمًا فاشكر الله على ما أُعطِيتَ" میں تہنیت کا پہلو ہے، اور "و اصبر على ما رزئت فقد فقدت الخليفة" میں اظہار تعزیت اور "اعطيت الخلافة" میں اظہار تہنیت ہے، اسی طریقے سے "فارقت خليلاً" تعزیت پر مشتمل ہے جب کہ "وهبت جليلاً" میں تہنیت کا پیغام ہے، یہی مضمون مندرجہ ذیل اشعار میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

اصبر يا يزيد فقد فارقت ذاثقة   واشكر حباء الذي بالملك أصفاك
لارزءَ أصبح في الأقوام نعلمه   كما رزئت ولا عقبى كعقباك

لغات: فارق مفارقة (مفاعلة) داغ مفارقت دینا۔ حِباءٌ عطیہ، أصفى إصفاء (افعال) منتخب کرنا، رُزْأٌ (ج) أَرْزَاءٌ، بڑی مصیبت رَزَأَ يرْزَأُ رَزْءًا (ف) کمی کرنا، مصیبت میں مبتلا ہونا، عقبىٰ کام انجام، بدلہ۔

ترکیب: اصبر فعل بافاعل جملہ انشائیہ یایزید ندابا منادیٰ جملہ انشائیہ، فا تعلیلیہ قد برائے تحقیق، "فارقت" فعل بافاعل "ذاثقةٍ" مرکب اضافی شدہ مفعول جملہ خبریہ "اشکر" فعل بافاعل "حباء" مضاف "الذي" موصول، "بالملك" متعلق بہ "أصفاك" فعل بافاعل ومفعول ومتعلق جملہ خبریہ شدہ صلہ،

موصول باصلہ مضاف الیہ، بعدازاں مفعول، جملہ انشائیہ، لا برائے نفی جنس ''رزء'' اسم ''أصبح'' فعل ناقص ضمیر اسم، ''في الأقوام'' متعلق بہ ''لانعلم'' ناقص، کاف بمعنی مثل مضاف، ''مارزئت'' جملہ مضاف الیہ شدہ مفعول ثانی ''نعلم'' کا، لا برائے نفی جنس، ''عقبی'' اسم ''کعقباك'' جار با مجرور خبر۔

اس شعر کے بھی پہلے مصرع میں تعزیت ہے اور دوسرے میں تہنیت ہے اور دوسرے شعر کے بھی مصرع اول میں تعزیت اور ''لاعقبٰی کعقباك'' میں تہنیت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مضمون سابق اور شعر مذکور دونوں میں افتنان بہت ہی عمدہ اور لطیف پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

(۱۳) ألجَمْعُ هُوَ أنْ يُجمَعَ بينَ مُتَعَدَّدٍ فِيْ حُكْمٍ وَاحِدٍ كَقَولِهِ ؎

إنَّ الشَّبابَ وَالفَراغَ وَالجِدَةَ مَفْسَدَةٌ لِلْمَرْءِ أيُّ مَفْسَدَةٍ

(۱٤) التَّفْرِيقُ هُوَ أنْ يُفرَقَ بَيْنَ شَيْئينِ مِنْ نَوْعٍ وَاحِدٍ كَقَولِهِ

مَانَوالُ الغَمامِ وَقْتَ رَبيعٍ كَنَوالِ الأميرِ يومَ سَخاءٍ

فنَوالُ الأمِيرِ بَدْرَةُ عينٍ وَنوالُ الغَمامِ قَطْرَةُ ماءٍ

(۱۵) التَّقْسِيمُ هُوَ إمَّا اسْتِيفَاءُ أقْسَامِ الشَّيُ نحوُ قَولِهِ ؎

وَأعْلَمُ عَلِمَ اليَومِ وَالأمسِ قَبْلَهُ وَلكِنَّنِي عَنْ عِلْمِ مَا فِيْ غَدٍ عَمِى

وَإمَّا ذِكرُ مُتَعَدَّدٍ وَإرجَاعُ مَا لِكُلٍّ إلَيهِ عَلَى التَّعيينِ كَقَولِهِ ؎

وَلَا يُقِيمُ عَلٰى ضَيمٍ يُرَادُ بِهِ إلَّا الأذَلَّانِ عَيرُ الحَيِّ وَالوَتَدُ

هذا عَلَى الخَسفِ مَرْبُوطٌ بِرُمَّتِهِ وَذَا يُشَجُّ فَلا يَرْثِي لَهُ أحَدُ

وَإمَّا ذِكرُ أحوَالِ الشَّيُ مُضَافًا إلٰى كُلٍّ مِنهُمَا مَا يَلِيْقُ بِهِ كَقَولِهِ ؎

سأطْلُبُ حَقِّي بِالقَنا وَمَشائخَ كَأنَّهُمْ مِنْ طُولِ مَا التَثَمُوْا مُرْدُ

ثِقَالٌ إذَا لاقُوْا خِفَافٌ إذَا دُعُوْا كَثِيرٌ إذَا شَدُّوْا قَلِيلٌ إذَا عُدُّوْا

ترجمہ: (۱۳) جمع وہ یہ ہے کہ ایک حکم میں متعدد چیزوں کو جمع کیا جائے،
جیسے شاعر کا شعر إن الشباب الخ
بیشک جوانی، بے کاری اور مال داری انسان کو بہت زیادہ بگاڑنے والی ہیں۔
(۱۴) تفریق وہ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کی دو چیزوں کے درمیان جدائیگی
کردی جائے، جیسے کہ شاعر کا شعر مانوال الغمام ؎
موسم ربیع میں بادلوں کی بخشش ایسی نہیں ہوتی جیسے کہ سخاوت کے دن امیر کی
بخشش، کیوں کہ امیر کی بخشش اشرفیوں سے بھری تھیلی ہوتی ہے اور بادلوں کی
بخشش پانی کا معمولی قطرہ ہوا کرتا ہے۔
(۱۵) تقسیم وہ یا تو شے کے اقسام کا مکمل بیان کرنا ہے، جیسے شاعر کا شعر ؎
مجھے آج کا بھی علم ہے اور کل گذشتہ کا بھی، لیکن میں آئندہ کل کے حالات
سے ناواقف ہوں۔
اور یا تو متعدد چیزوں کا ذکر کرنا اور ہر ایک کے لیے متعین طریقے پر ایک
ایک حکم منسوب کردینا ہے، جیسے شاعر کا شعر "ولا یقیم علی ضیم" ؎
اور کوئی بھی ایسے ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا جس کا اس کے ساتھ ارادہ کیا گیا ہو
سوائے دو ذلیل ترین فرد کے ایک محلے کا گدھا اور دوسرا کھونٹا۔
یہ (گدھا) ذلت کے ساتھ اپنی رسی میں باندھ دیا گیا ہے اور وہ (کھونٹا)
ٹھونکا جاتا ہے تو اس پر کسی کو ترس نہیں آتا۔
اور یا (تقسیم نام ہے) کسی شے کے احوال کو ذکر کرنا اس حال میں کہ ان
میں سے ہر ایک کی طرف ایسی چیز منسوب ہو جو اس کے مناسب ہو، جیسے شاعر کا
شعر سأطلب حقي الخ ؎
عنقریب میں اپنا حق طلب کروں گا نیزے اور ایسے تجربے کار بوڑھوں کے
ذریعہ جو یوں معلوم ہوتے ہیں کہ گویا وہ طویل عرصے سے چہرے پر نقاب ڈالنے

کی وجہ سے بے ریش ہیں۔

(وہ لوگ) بھاری بھرکم ہوتے ہیں جب جنگ کرتے ہیں ہلکے بدن ہوتے ہیں جب انہیں پکارا جائے، جب حملہ آور ہوتے ہیں تو زیادہ ہوتے ہیں جب شمار کیا جاتا ہے تو کم ہوتے ہیں۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفین نے محسنات معنویہ کی تین اور قسمیں بیان کی ہیں فرماتے ہیں محسنات معنویہ کی تیرہویں قسم جمع ہے، جمع کے لغوی معنی اکٹھا کرنے کے ہیں، اور اصطلاح میں جمع کا مطلب یہ ہے کہ کئی چیزوں کو ایک حکم میں جمع کر دیا جائے، جیسے کہ شاعر ابو العتاہیہ کا شعر ؎

إن الشباب والفراغ والجدة مفسدة للمرأ أي مفسدة

لغات: شَبَّ يَشِبُّ شَبَابًا (ض) جوان ہونا، جِدَةٌ، نصیبہ، مالداری۔ مَفْسَدَةٌ بگاڑ۔

ترکیب: إنّ حرف مشبہ بہ فعل "الشباب والفراغ والجدة معطوف علیہ ومعطوف شدہ اسم" مفسدة للمرأ" خبر أيْ مُفسدَة، خبر ثانی۔

شعر مذکور میں "شباب، فراغ" اور "جدة" کو ایک حکم یعنی فساد میں جمع کر دیا گیا ہے۔

التفریق: چودھویں قسم تفریق ہے تفریق کے لغوی معنی ہیں، جدا کرنا فرق کرنا اور اصطلاح میں تفریق نام ہے ایک ہی نوع کی دو چیزوں کے درمیان بایں طور فرق کر دیا جائے کہ ایک شئ کے لیے کوئی خصوصیت ذکر کر دی جائے، جیسے کہ مندرجہ ذیل شعر:

ما نوال الغمام وقت ربيع كنوال الأمير يوم سخاء

فنوال الأمير بدرة عين ونوال الغمام قطرة ماء

لغات: نوالٌ کے معنی، داد و دہش، غمامٌ (ج) غمائم بادل، بدرَةٌ

(ج) بُدُورٌ دس ہزار درہم، بڑی مالیت، دس ہزار درہم کی تھیلی۔

ترکیب: ما مشابہ بہ لیس، ''نوال الأمیر'' اسم ما'' وقت ربیع'' ظرف، کاف جارہ'' نوال الأمیر'' مجرور شدہ خبر ما ''یوم سخاء'' ظرف، فاتعلیلیہ ''نوال الأمیر'' مبتدا ''بدرة عین'' خبر، جملہ معطوف علیہ، واو عاطفہ ''نوال الغمام'' مبتدا ''قطرة ماء'' خبر، جملہ معطوف۔

شعر مذکور میں ''نوال'' یعنی داد و دہش ایک نوع ہے جس میں بادل اور امیر دونوں شریک ہیں لیکن دونوں کے درمیان فرق کردیا گیا ہے کہ بادل اور امیر کی سخاوت میں آسمان و زمین کا فرق ہے، بادل امیر کا مقابلہ کرلے یہ ناممکن ہے، کیوں کہ امیر کی سخاوت تو اشرفیوں کی تھیلیاں لٹا کر ہوتی ہے جب کہ بادل کی سخاوت پانی کے چند قطرات سے زمین کو تر کردینے سے ہوتی ہے۔

والتقسیم: فرماتے ہیں کہ محسنات معنویہ کی پندرہویں قسم تقسیم ہے، تقسیم کے لغوی معنی ہیں، تقسیم کرنا، اصطلاح میں تقسیم کی کئی شکلیں ہیں جن کو حضرات مصنفین نے علی الترتیب بیان کیا ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ کسی چیز کے تمام اقسام کو مکمل طور پر بیان کردیا جائے جیسے کہ زبیر بن ابی سلمیٰ کا یہ شعر۔

واعلم علم الیوم والأمس قبله ولکنني عن علم ما في غد عمي

ترکیب: اعلم فعل بافاعل، علم مضاف، الیوم معطوف علیہ، واو عاطفہ، الأمس لکن حرف مشبہ بہ فعل، ی اسم، عن جارہ، علم مضاف ماموصولہ، في غد جار با مجرور متعلق بہ ''ثابت'' صیغۂ صفت با متعلق خود صلہ، موصول با صلہ مضاف الیہ مجرور شدہ، متعلق بہ عمي، عمي خبر لکن۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''علم الیوم والأمس وعلم مافي غد'' ہے شاعر نے اس شعر میں زمانے کی تینوں قسموں ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کرلیا ہے

و إما ذکر متعدد تقسیم کی دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے چند چیزیں ذکر

کریں، پھر ہر ایک کے مناسب امر کا ذکر کریں اور جو امر جس کے لیے مناسب ہو اس کو اسی کے لیے متعین بھی کر دیں، جیسے شاعر متلمس کا شعر ؎

ولا يقيم على ضيم يراد به إلاّ الأذلان عير الحي والوتد

هٰذا على الخسف مربوط برمته وذا يشج فلا يرثي له أحد

لغات: ضيمٌ (ج) ضيوم ظلم، أذلان، أذلّ کا تثنیہ ہے، ذلیل ترین، عيرٌ (ج) أعيارٌ گدھا، وتدٌ (ج) أوتادٌ کیل، کھونٹا، رَبَطَ يَرْبُطُ رَبطًا (ن) باندھنا۔ رُمَّةٌ (ج) رُمَمٌ پرانی رسی کا ٹکڑا۔ شجّ يشجّ شجًّا (ن) زخمی کرنا۔ رثى له يرثي رثاءً (ض) رحم کرنا۔

ترکیب: لا يقيم فعل با فاعل، على جارہ، ضيم موصوف، يراد به صفت، موصوف با صفت مجرور شدہ متعلق بہ لا يقيم، إلاّ حرف استثناء، الأذلان مبدل منہ، عير الحي والوتد معطوف علیہ با معطوف بدل، مبدل منہ با بدل مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ غیر مذکور أي لا يقيم أحدٌ إلا الأذلاّن، هٰذا مبتدا، مربوط صیغۂ صفت، على الخسف متعلق اول مربوطٌ، برمته متعلق ثانی، صیغہ صفت بہ ہر دو متعلق خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ شدہ معطوف علیہ، ذا مبتدا، يشج جملہ معطوف علیہ، فا عاطفہ لا يرثي له أحد جملہ معطوف۔

مذکورہ دونوں شعروں میں شاعر نے پہلے "عير" اور "وتد" دو چیزیں ذکر کیں پھر "عير" کے مناسب "ربط على الخسف" اور "وتد" کے مناسب "شج" کو بیان کیا۔

وإما ذكر أحوال الشيئ: تقسیم کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شے کے مختلف احوال ذکر کرنے کے بعد ہر حال کی طرف کسی قید یا صفت کی نسبت کی جائے جو اس حال کے مناسب ہو، جیسا کہ شاعر متنبّی کا یہ شعر ؎

ساطلب حقي بالقنا ومشايخ كأنهم من طول ما التثموا مرد

ثقال إذا لاقوا خفاف إذا دُعوا كثيـر إذا شدُّوا قليلٌ إذا عُدُّوا

لغات: قَنا (واحد) قَناۃٌ نیزہ، نیزہ کی لکڑی۔ اَلتثم یَلْتثِمُ اِلتِثَامًا (افتعال) نقاب اوڑھنا، چہرہ ڈھانکنا۔ ثِقَالٌ (واحد) ثَقِیلٌ بھاری بھرکم۔ خِفافٌ (واحد) خفیفٌ ہلکا پھلکا۔

ترکیب: ساطلب فعل با فاعل، حقي مفعول بہ با جارہ، القنا معطوف علیہ، واو عاطفہ، مشایخ معطوف، معطوف ومعطوف علیہ مجرور شدہ متعلق بہ ساطلب، کأنھم حرف مشبہ بہ فعل واسم، مردٌ خبر، من جارہ طول مضاف، ما موصولہ، التثموا جملہ خبریہ شدہ صلہ، موصول با صلہ مجرور شدہ متعلق بہ مُرْدٌ، ھم مبتدا محذوف۔ ثقالٌ خبر، إذا لاقوا ظرف، یہی ترکیب "خفاف إذا دعوا" "کثیرٌ إذا شدوا" اور "قلیلٌ إذا عدّوا" کی ہوگی۔

شعر مذکور میں شاعر نے مختلف احوال ذکر کیے ہیں (۱) ثقال (۲) خفاف (۳) کثیر (۴) قلیل اور ان احوال کو ذکر کرنے کے بعد ہر ایک حال کے مناسب چیز کو بھی ذکر کیا ہے مثلاً "ثقال" کے مناسب "لاقوا" "خفاف" کے مناسب "دعوا" "کثیر" کے مناسب "شدّ وا" اور "قلیل" کے مناسب "عدّ وا" اور مناسبت بایں طور ہے کہ ثقال اس معنی کر ہیں کہ تندرست وتوانا ہونے کے ساتھ جنگ میں بھرپور حصہ لیتے ہیں اور ہلکے ہیں یعنی جب کسی مہم کے لیے پکارا جاتا ہے تو ہلکے پن کی وجہ سے تیزی سے چلتے ہیں، کثیر ہیں یعنی حملہ آور ہونے کی حالت میں ایک کئی لوگوں کے لیے کافی ہوجاتا ہے، کم ہیں یعنی بظاہر ان کی تعداد کم ہے اگرچہ مقابلے میں کئی ہزار کے برابر کام کرتے ہیں۔

(۱۶) أَلطيُّ وَالنَّشْرُ هُوَ ذِكْرُ مُتَعَدِّدٍ عَلَى التَّفْصِيلِ أَوِ الإِجْمَالِ ثُمَّ ذِكْرُ مَا لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنَ الْمُتَعَدِّدِ مِنْ غَيرِ تَعْيِينٍ اعْتِمَادًا عَلٰى فَهْمِ السَّامِعِ كَقَوْلِهٖ تَعَالٰى "جَعَلَ لَكُمُ اللَّيلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ"

فَالسُّكُونُ رَاجِعٌ إِلَى اللَّيلِ وَالابْتِغَاءُ رَاجِعٌ إِلى النَّهَارِ وَكَقَولِ الشَّاعِرِ ؎

ثَلٰثَةٌ تُشْرِقُ الدُّنْيَا بِبَهْجَتِهَا   شَمْسُ الضُّحٰى وَأَبُوْ إِسْحَاقَ وَالقَمَرُ

(۱۷) إِرْسَالُ المَثَلِ وَالكَلامُ الجَامِعِ هُوَ أَنْ يُؤْتٰى بِكَلامٍ صَالِحٍ لِاَنْ يُتَمَثَّلَ بِهِ فِيْ مَوَاطِنِ كَثِيْرَةٍ.

وَالفَرْقُ بَينَهُمَا أَنَّ الأَوَّلَ يَكُونُ بَعْضَ بَيتٍ كَقَولِهٖ: ع

لَيسَ التَّكَحُّلُ فِيْ العَيْنَينِ كَالكَحَلِ

وَالثَّانِيْ يَكُونُ بَيتًا كَامِلاً كَقَولِهٖ:

إِذَا جَاءَ مُوسٰى وَأَلْقٰى العَصٰى   فَقَدْ بَطَلَ السِّحْرُ وَالسَّاحِرْ

(۱۸) أَلْمُبَالَغَةُ هِيَ اِدِّعَاءُ بُلُوغِ وَصْفٍ فِيْ الشِّدَّةِ أَوِ الضُّعْفِ حَدًّا يَبْعُدُ أَوْ يَسْتَحِيلُ، وَتَنْقَسِمُ إِلٰى ثَلٰثَةِ أَقْسَامٍ.

تَبْلِيغٌ إِنْ كَانَ ذٰلِكَ مُمْكِناً عَقْلاً وَعَادَةً كَقَولِهٖ فِيْ وَصْفِ فَرَسٍ

إِذَا مَا سَابَقَتْهَا الرِّيْحُ فَرَّتْ   وَأَلْقَتْ فِيْ يَدِ الرِّيحِ التُّرَابَا

وَإِغْرَاقٌ إِنْ كَانَ مُمْكِنًا عَقْلاً لَاعَادَةً كَقَولِهٖ ؎

وَنُكْرِمُ جَارَنَا مَادَامَ فِينَا   وَنُتْبِعُهُ الكَرَامَةَ حَيثُ مَالاَ

وَغُلُوٌّ إِن اسْتَحَالَ عَقْلاً وَعَادَةً كَقَولِهٖ ؎

تَكَادُ قِسِيُّهُ مِنْ غَيرِ رَامٍ   تُمَكِّنُ فِيْ قُلُوبِهِمْ النِّبَالاَ

ترجمہ: (۱۶) طی اور نشر وہ متعدد چیزوں کا بالتفصیل یا بالاجمال ذکر کرنا ہے پھر متعدد میں سے ہرایک کے لیے بلاتعیین وہ حکم کیا جائے، جواس کے لیے مناسب ہے سامع کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول "وجعل لکم الخ" اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تا کہ تم اس میں چین کرو اور اس کا کچھ فضل تلاش کرو، تو سکون راجع ہے رات کی طرف اور ابتغاء راجع ہے دن کی طرف اور جیسے شاعر کا شعر ثلثة الخ ؎

تین چیزیں ہیں جن کی چمک سے دنیا روشن ہے دوپہر کا آفتاب، ابواسحق اور چاند۔

(۱۷) ارسال مثل اور کلام جامع: وہ یہ ہے کہ ایسا کلام لایا جائے جو اکثر جگہوں میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھے، اوران دونوں (ارسال مثل اور کلام جامع) کے درمیان فرق یہ ہے کہ اول کسی شعر کا جز ہوا کرتا ہے، جیسے **لیس التکحل الخ.**

دونوں آنکھوں میں سرمہ لگانا سرمگیں آنکھوں کی مانند نہیں ہوتا ہے۔

اور دوسرا مکمل شعر ہوتا ہے، جیسے کہ شاعر کا شعر "**إذا جاء موسیٰ الخ**"

جب موسیٰ آگئے اور لاٹھی ڈال دیا تو یقیناً جادو اور جادوگر دونوں ختم ہو گئے

(۱۸) مبالغہ: وہ کسی وصف کی شدت یا ضعف کے اس حد تک پہنچنے کا دعویٰ کرنا ہے جو (عقل سے) بعید یا محال ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) تبلیغ: اگر وہ عقلاً اور عادۃً ممکن ہو جیسے شاعر کا شعر گھوڑے کی تعریف میں "**إذا ما سابقتها الخ**"

جب ہوا اس سے (گھوڑے سے) آگے بڑھنے میں مقابلہ کرتی ہے تو وہ گھوڑا بھاگ جاتا ہے اور ہوا کے ہاتھ میں گرد ڈال دیتا ہے۔

(۲) اغراق: جب عقلاً ممکن ہو عادتاً نہ ہو، جیسے شاعر کا شعر **ونکرم جارنا الخ**

ہم اپنے پڑوسی کی عزت کرتے ہیں جب تک وہ ہمارے ساتھ رہتا ہے اور اس کے بعد بھی ہم شرافت ہی کا معاملہ کرتے رہتے ہیں، جس وقت وہ نہیں رہتا۔

(۳) غلو: اگر عقلاً اور عادتاً دونوں محال ہو، جیسے شاعر کا شعر **تکاد قسیہ الخ**

قریب ہے کہ اس کی (ممدوح) کمانیں تیر انداز کے بغیر ہی ان کے (دشمنوں کے) دلوں میں تیر چبھا دیں۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں حضرات مصنفینؒ نے محسنات معنویہ کی

سولھویں، سترھویں اور اٹھارھویں قسم کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں کہ محسنات معنویہ کی ایک قسم طی ونشر ہے، طيٌّ کے لغوی معنی لپیٹنا اور نشر کے لغوی معنی پھیلانے کے ہیں، اس قسم کا معروف نام ''لف ونشر'' ہے، بلاغت کی اصطلاح میں طی ونشر یہ ہے کہ پہلے کئی چیزوں کو مفصلاً یا مجملاً بیان کردیا جائے پھر ان کے مناسبات کو بیان کیا جائے، مگر یہ تعیین نہ کی جائے کہ کون سی چیز کس کے مناسب ہے بل کہ اسے سامع کے فہم پر چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ خود ہی متعین کرلے، تفصیل کی مثال، جیسے "جعل لكم الليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله"

آیت کریمہ میں پہلے "لیل ونهار" کو مفصلاً یعنی الگ الگ بیان کیا گیا پھر ''لیل'' کے مناسب "لتسكنوا" کو اور "نهار" کے مناسب "لتبتغوا من فضله" کو ذکر کیا گیا مگر اسے متعین نہیں کیا گیا، سامع سنتے ہی خود متعین کرلے گا کہ سکون کا تعلق لیل سے ہے اور ابتغاء فضل کا تعلق نہار سے ہے کیوں کہ آرام رات میں اور کسب معاش کا عمل اکثر وبیشتر دن میں ہوتا ہے۔

اور اجمال کی مثال جیسے محمد بن وہب کا وہ شعر جو اس نے معتصم باللہ کی تعریف میں کہا تھا ؎

ثلثة تشرق الدنيا ببهجتها شمس الضحى وأبو اسحاق والقمر

ترکیب: ثلثة مبتدا، تشرق الدنيا ببهجتها فعل بافاعل ومفعول ومتعلق سے مل کر خبر، جملہ خبر واقع ہے مبتدا کی، أحدها وثمانيها وثالثها مبتدا محذوف میں اور شمس الضحى أبو اسحاق القمر یکے بعد دیگرے خبر واقع ہیں۔

لغات: أشرق إشراقاً (افعال) روشن کرنا، بهجة خوبصورتی، بَهُجَ يَبْهُجُ بَهَاجَةً (ک) خوبصورت ہونا۔

شعر مذکور میں پہلے "ثلثة" کو مجمل بیان کیا گیا ہے، پھر شمس الضحی وابواسحاق والقمر سے اس کی تفصیل کی گئی ابواسحٰق سے مرد خلیفہ معتصم باللہ ہے۔

إرسال المثل: محسنات معنویہ کی سترہویں قسم ارسال المثل اور کلام جامع ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کلام پیش کیا جائے جو بیشتر مقامات میں کہاوت اور ضرب المثل بن سکے، البتہ ارسال مثل اور کلام جامع کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے وہ یہ ہے کہ ارسال مثل اور کلام جامع کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے وہ یہ ہے کہ ارسال مثل شعر کا ایک مصرع ہوا کرتا ہے جب کہ کلام جامع پورا شعر ہوتا ہے ارسال مثل، جیسے ع **لیس التکحل فی العینین کالکحل**

یہ جملہ شعر کا صرف ایک مصرع ہے اور اصل ونقل کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے وقت بولا جاتا ہے، مصرع مذکور کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنی آنکھ میں کیسا ہی سرمہ کیوں نہ لگالے سرمگیں آنکھوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، کیوں کہ وہ اصل ہے اس کا منظر ہی کچھ ایسا دیدہ زیب ہوتا ہے جو بناوٹی سرمے سے حاصل نہیں ہوسکتا، یعنی اصل کے مرتبے کو نقل نہیں پہنچ سکتا، کلام جامع کی مثال، جیسے:

إذا جاء موسیٰ وألقی العصی فقد بطل السحر والساحر

ترکیب: **إذا** شرطیہ، **جاء موسیٰ** فعل بافاعل، جملہ خبریہ شدہ معطوف علیہ "**القی العصی**" جملہ معطوف شدہ شرط، فا جزائیہ "**قد بطل السحر والساحر**" جملہ جزا۔

یہ ایک مکمل شعر ہے جو مثل کے طور پر ایسی جگہ بولا جاتا ہے جہاں حق کے سامنے باطل مغلوب ہوجائے، اس شعر میں اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جب فرعون نے پورے ملک کے جادوگروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے جمع کیا تھا اور عصائے موسوی نے ان کے جادوگری کے تمام کرشموں کو تہ وبالا کردیا تھا، جس کے نتیجے میں تمام جادوگر سجدے میں گر پڑے تھے اور حق غالب اور باطل مغلوب ہوگیا تھا۔

المبالغة: محسنات معنویہ کی اٹھارہویں قسم مبالغہ ہے، مبالغے کا مطلب یہ

ہے کہ کسی وصف کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ وصف شدت وضعف یعنی زیادتی وکمی یا سختی ونرمی میں اس حد تک پہنچ گیا ہے جو عقل سے بعید یا محال ہے۔

مبالغہ کی مصنفینؒ نے تین قسمیں بیان کی ہیں (۱) تبلیغ (۲) اغراق (۳) غلو

(۱) تبلیغ: اس کا مطلب یہ ہے کہ مبالغے کا دعویٰ عقلاً اور عادتاً دونوں اعتبار سے ممکن ہو، جیسے شاعر کا شعر ؎

إذا ما سبقتها الريح فرت　　وألقت في يد الريح الترابا

لغات: سابق مسابقةً (مفاعلة) سبقت لے جانا۔ ألقى إلقاء ڈالنا۔

ترکیب: إذا شرطیہ، ما زائدہ، سابقتها الريح فعل با فاعل ومفعول جملہ شدہ شرط، فرت جملہ معطوف علیہ، ألقت في يد الريح الترابا فعل با فاعل مفعول ومتعلق جملہ خبریہ شدہ معطوف، معطوف علیہ با معطوف جزا۔

شعر مذکور میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ گھوڑا تیز رفتاری میں ہوا سے بھی بڑھا ہوا ہے اور یہ دعویٰ عقلاً اور عادتاً دونوں اعتبار سے ممکن ہے گرچہ یہ وصف شاذ ونادر ہی ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے۔

(۲) اغراق: اس کا مطلب یہ ہے کہ مبالغے کا دعویٰ عقلاً تو ممکن ہو مگر عادتاً محال ہو، جیسے شاعر کا شعر:

ونكرم جارنا مادام فينا　　ونتبعه الكرامة حيث مالا

لغات: جارٌ (ج) جيران پڑوسی، أتبع يتبع إتباعاً (افعال) پیچھے لگانا۔

ترکیب: نكرم جارنا فعل با فاعل ومفعول، مادام فينا، وقت دوامه فينا کے معنی میں ہو کر ظرف، جملہ معطوف علیہ، نتبع فعل با فاعل، ہٗ مفعول اول، الكرامة مفعول ثانی، حيثما ظرف، لا أي لايكون موجوداً جملہ معطوف۔

شعر مذکور میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ پڑوسی کی موجودگی میں تو ہم عزت کرتے ہی ہیں اور عدم موجودگی میں بھی ہمارا کرم کا معاملہ برقرار رہتا ہے، وہ

پڑوسی جہاں کہیں بھی رہتا ہے ہمارے کرم کے معاملے میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، یہ بات اگرچہ عقلاً ممکن ہے مگر عادتاً ممکن نہیں ہے اس لیے کہ لوگوں میں خود غرضیاں بہت آگئی ہیں اب تو موجودگی ہی میں عزت کردینا بہت بڑی بات ہے چہ جائے کہ غیر موجودگی میں بھی کوئی کرم کے معاملے کو برقرار رکھے، اور وہ بھی اس صورت میں کہ کسی بھی جگہ ہو۔

(۳) غلو: اس کا مطلب یہ ہے کہ دعویٰ عقلاً بھی محال ہو اور عادتاً بھی، جیسے شاعر کا شعر ؎

تکاد قسیه من غیر رام تمکن في قلوبهم النبالا

لغات: قِسِيّ (واحد) قوسٌ کمان، رام اسم فاعل ہے، رمٰی یرمي رمیًا تیراندازی کرنا، مکّن یمکّن تمکینًا چھادینا، نبالٌ (واحد) نبل تیر۔

ترکیب: تکاد فعل مقارب، قسیه اس کا اسم، تمکّن فعل بافاعل، في قلوبهم متعلق بہ تمکن، النبالا مفعول بہ، من غیر رام جار مجرور متعلق بہ تمکن، جملہ خبریہ شدہ خبر۔

شعر مذکور میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کمانیں اتنی عمدہ ہیں کہ بغیر تیرانداز کے ہی دشمنوں کے دل میں اس کی تیریں چبھ جاتی ہیں، یہ بات عقلاً وعادتاً دونوں اعتبار سے محال ہے کہ تیر بغیر تیرانداز کے دل ہی میں جاکر چبھے اور گاڑی بغیر ڈرائیور کے صحیح چلے۔

(۱۹) المُغَایَرَةُ هِيَ مَدْحُ الشَّيْءِ بَعْدَ ذَمِّهٖ أو عَکْسُهٗ کَقَوْلِهٖ فِيْ مَدْحِ الدِّیْنَارِ ع "أَکْرِمْ بِهٖ أَصْفَرَ رَاقَتْ صُفْرَتُهٗ"

بَعْدَ ذَمِّهٖ فِيْ قَوْلِهٖ ع "تَبًّالَهٗ مِنْ خَادِعٍ مُمَاذِقٍ"

(۲۰) تَاکِیْدُ المَدْحِ بِمَا یُشْبِهُ الذَّمَّ ضَرْبَانِ، أَحَدُهُمَا أَنْ یُسْتَثْنٰی مِنْ صِفَةِ ذَمٍّ مَنْفِیَّةٍ صِفَةُ مَدْحٍ عَلٰی تَقْدِیْرِ دُخُوْلِهَا فِیْهَا کَقَوْلِهٖ ؎

وَلَاعَيْبَ فِيْهِمْ غَيرَ أَنَّ سُيُوفَهُمْ بِهِنَّ فُلُولٌ مِنْ قِرَاعِ الكَتَائِبِ

وَثَانِيهِمَا أَنْ يُثْبَتَ لِشَيْءٍ صِفَةُ مَدْحٍ وَيُؤْتٰى بَعْدَهَا بِأَدَاةِ اسْتِثْنَاءٍ تَلِيْهَا صِفَةُ مَدْحٍ أُخْرىٰ كَقَوْلِهٖ ۔

فَتًى كَمُلَتْ أَوْصَافُهُ غَيرَ أَنَّهُ جَوَّادٌ فَمَا يُبْقِي عَلَى المَالِ بَاقِيَا

(۲۱) تَاكِيدُ الذَّمِّ بِمَا يُشْبِهُ المدْحَ ضَرْبَانِ أيضًا. ألأَوَّلُ: أَنْ يُسْتَثْنٰى مِنَ صِفَةِ مَدْحٍ مَنْفِيَّةٍ صَفَةُ ذَمٍّ عَلٰى تَقْدِيْرِ دُخُولِهَا فِيْهَا ، نحوُ "فُلَانٌ لاخَيْرَ فِيهِ إلَّا أَنَّهُ يَتَصَدَّقُ بِمَا يَسْرِقُ"

وَالثَّانِيْ أَنْ يُثْبَتَ لِشَيْءٍ صِفَةُ ذَمٍّ وَيُؤْتٰى بَعْدَهَا بِأَدَاةِ اسْتِثْنَاءٍ تَلِيْهَا صِفَةُ ذَمٍّ أُخْرىٰ كَقَوْلِهٖ ۔

هُوَ الكَلْبُ إلَّا أنَّ فِيهِ مَلاَ لَةً وَسُوْءَ مُرَاعَاةٍ وَمَاذَاكَ فِيالكَلْبِ

ترجمہ: (۱۹) مغایرت وہ کسی چیز کی تعریف کرنا ہے اس کے مذمت کرنے کے بعد یا اس کے برعکس کرنا (یعنی کسی کی مذمت کرنے کے بعد اس کی تعریف کرنا) جیسے شاعر کا شعر دینار کی مدح میں: ع

کتنا عزیز ہے وہ زرد دینار جس کی زردی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

''اس کی مذمت کرنے کے بعد اپنے قول "تباله الخ" میں''

اس کے لیے ہلاکت ہو وہ دھوکے باز منافق ہے۔

(۲۰) تاکید المدح بما یشبه الذم (مدح کو ایسے مدحیہ الفاظ سے موکد کرنا جو ذم کے مشابہ ہوں) اس کی دو قسمیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذمت کی منفی صفت میں سے صفت مدح کا استثناء کرلیا جائے صفت مدحیہ کے مذمت کی صفت میں داخل ہونے کی تقدیر پر، جیسے شاعر کا شعر "ولاعیب فیهم الخ" ۔

ان میں کوئی عیب نہیں بجز اس کے کہ ان کی تلواروں میں فوجی دستوں کو کاٹنے سے دندانے پڑ گئے ہیں۔

اور ان میں کا دوسرا یہ ہے کہ کسی شے کے لیے صفت مدح ثابت کی جائے اور اس کے بعد ایسا حرف استثناء لایا جائے جس سے دوسری صفت مدح متصل ہو، جیسے شاعر کا شعر "فتًی کملت الخ" ۔

وہ ایسا جوان ہے جس کے اوصاف کامل ہیں بجز اس کے کہ وہ سخی ہے جس کی وجہ سے مال پر رحم نہیں کرتا۔

(۲۱) تاکید الذم بما یشبه المدح: (ذم کو ایسے الفاظ مذمت سے پختہ کرنا جو مدح کے مشابہ ہوں) کی دو قسمیں ہیں اول یہ ہے کہ مدح کی صفت منفیہ میں سے صفت ذم کا استثنا کر لیا جائے صفت ذم کے مدح کی صفت منفیہ میں داخل ہونے کی تقدیر پر جیسے "لاخیر الخ" اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ چوری کیے ہوئے مال کا صدقہ کر دیتا ہے۔

دوم یہ کہ کسی شے کے لیے صفت ذم ثابت کیا جائے اور اس کے بعد ایسا حرف استثنا لایا جائے جس سے دوسری صفت ذم متصل ہو، جیسے شاعر کا شعر "ھو الکلب الخ" ۔

وہ سراپا کتا ہے مگر یہ کہ اس میں بے ثباتی اور بے حفاظتی ہے حالاں کہ یہ چیز کتے میں نہیں ہوتی۔

تشریح: عبارت بالا میں بھی مصنفین نے محسنات معنویہ ہی کی تین اور قسموں کو بیان کیا ہے، مغایرۃ، تاکید المدح بما یشبہ الذم، تاکید الذم بما یشبہ المدح۔

(۱۹) مغایرت کے لغوی معنی ہیں مخالفت کرنا، اصطلاح بلاغت میں مغایرت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کسی چیز کی مذمت کر کے پھر اس کی تعریف کی جائے یا اس کے برعکس کیا جائے یعنی پہلے تعریف کر کے پھر اس کی مذمت کی جائے، جیسا کہ صاحب مقامات علامہ حریری نے پہلے دینار کی مذمت کی اپنے قول "تباله من

خادع مماذق“ سے، کہ دینار کے لیے ہلاکت ہو وہ دھوکے باز اور منافق ہے۔ اِس معنی کر وہ دھوکے باز ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ٹھہرتا نہیں خرچ ہو جاتا ہے اور منافقت اس اعتبار سے کہ جس کے پاس رہتا ہے اسی کے گن گاتا ہے، پھر اس کے بعد ”أکرم به راقت صفرته“ سے اس کی تعریف کی کہ کتنا ہی عزیز ہے وہ دینار جس کی زردی بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

(۲۰) تاکید المدح بمایشبه الذم (مدح کی تاکید کرنا ایسے الفاظ سے جو مذمت کے مشابہ ہوں) یعنی کسی کی تعریف کرتے وقت ایسے الفاظ استعمال کرنا جس سے بہ ظاہر ہجو معلوم ہو مگر حقیقت میں وہ تعریف ہی تعریف ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم یہ ہے کہ ذم کی صفتِ منفیہ سے صفتِ مدح کا استثنا کرلیا جائے اور پھر یہ فرض کرلیا جائے کہ مدح کی صفت، ذم کی صفت میں داخل ہے جیسے کہ نابغہ ذبیانی کا مندرجہ ذیل شعر ؎

ولاعیب فیهم غیرأن سیوفهم   بهن فلول من قراع الکتائب

لغات: فلولٌ (واحد) فَلٌّ تلوار کی دھار میں ٹوٹ یا دندانہ۔ قارع مقارعة وقِرَاعاً (مفاعلة) نیزہ بازی کرنا، جنگ کرنا۔ کتائب (واحد) کتیبةٌ سواروں کا دستہ۔

ترکیب: لا برائے نفی جنس، عیب مستثنیٰ منہ، غیر حرف استثنا، أن حرف مشبہ بہ فعل، سیوفهم اس کا اسم، بهن ثابتةٌ سے متعلق ہو کر خبر مقدم، فلولٌ مبتدا موخر، من قراع الکتائب، ثابتة کا متعلق ثانی ہے مبتدا با خبر، خبرِ أن، أنّ با اسم وخبر بتاویل مفرد شدہ مضاف الیہ، غیر حرف استثنا مضاف با مضاف الیہ مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ با مستثنیٰ اسمِ لا، فیهم کائن سے متعلق ہو کر خبر۔

شعر مذکور میں شاعر نے منفی صفت ذم (لاعیب فیهم) سے ایک صفت مدح ”وقوع الفلول بالسیف“ کا جب غیر سے استثنا کیا تو اس بات کا شبہ

ہوا کہ شاید اب کوئی عیب بیان کرے گا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کی تلواروں میں دندانوں کا پڑ جانا یہ تو عیب نہیں بل کہ غایت درجے کی شجاعت ہے، جو سراپا تعریف ہی ہے یہاں مذمت کی صفت منفیہ یعنی ''عیب'' سے صفتِ مدح ''شجاعت'' کا استثنا کیا گیا ہے اور یہ فرض کر کے استثنا کیا گیا ہے کہ صفتِ مدح بھی گویا اسی صفت منفیہ میں داخل تھی۔

دوسری قسم یہ ہے کہ کسی شے کے لیے مدح کی صفت ثابت کی جائے پھر اس صفت کے بعد حرف استثناء لایا جائے اس کے بعد مدح کی دوسری صفت لائی جائے جس کا سابقہ صفتِ مدح سے استثنا کیا گیا ہو، جیسے شاعر کا یہ شعر ؎

فتى كملت أوصافه غير أنه جوادٌ فما يبقي على المال باقيا

لغات: كَمُل يكمُل كمالاً (ک) کامل ہونا، جَوَادٌ صیغۂ صفت جادَ يجُودُ جوادًا (ن) سخی ہونا، فیاض ہونا، أبقى على أحد إبقاءً رحم کرنا۔

ترکیب: هو مبتدا محذوف، فتًى موصوف، كَمُلَتْ فعل، أوصافه مستثنیٰ منہ، غير حرف استثنا مضاف، أنه جوادٌ جملہ مضاف الیہ، مستثنیٰ منہ با مستثنیٰ فاعل، جملہ صفت شدہ خبر مبتدا، فا نتیجیہ، يبقي على المال باقيا فعل فاعل ومفعول ومتعلق سے مل کر جملہ خبریہ۔

شعر مذکور میں پہلے ''كملت أوصافه'' سے ایک صفت مدح ثابت کی گئی اس لیے کہ اوصاف کا کامل ہونا قابل تعریف چیز ہے پھر حرف استثنا ''غیر'' لا کر ایک دوسری صفت یعنی سخاوت کو بیان کیا، مگر جب شاعر نے غیر کہا تو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اب کوئی عیب بیان کرے گا، مگر جو صفت بیان کی تو وہ بھی مدح کے لیے تھی جس نے سابقہ صفت مدح کو مزید پختہ کر دیا۔

(۲۱) تاكيد الذم بما يشبه المدح: (ہجو کی تاکید ایسے الفاظ سے کرنا جو مدح کے مشابہ ہوں) یعنی کسی کی ہجو میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو ظاہر میں تو

مدح معلوم ہوں مگر حقیقت میں ہجو ہو، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: یہ کہ مدح کی صفت منفیہ سے صفت ذم کا استثنا کرلیا جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ صفتِ ذم مدح کی صفت منفیہ میں داخل ہے جیسے "فلان لاخير فيه إلا أنه يتصدق بما يسرق" مثال مذکور میں منفی صفتِ مدح "لاخير فيه" ہے جس سے ایک صفتِ ذم "يتصدق بما يسرق" کا استثناء کیا گیا ہے مگر خیر کی نفی کے بعد جب "إلّا" سے استثناء کیا تو اس بات کا شبہ ہوا کہ اب کوئی تعریف کی بات بیان ہوگی مگر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ چوری کے مال کا صدقہ کرنا مدح نہیں بل کہ مذمت ہے۔

یہاں مدح کی صفت منفیہ "خير" سے ہجو کی صفت "تصدق بالمال المسروق" کا إلّا کے ذریعہ استثناء کرلیا گیا یہ فرض کرکے کہ یہ ہجو کی صفت، صفتِ منفیہ میں داخل ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ کسی شے کے لیے ذم کی صفت ثابت کی جائے اس کے بعد کلمہ استثناء لایا جائے اس کے بعد ذم کی دوسری صفت لائی جائے، جیسے

هو الكلب إلا أن فيه ملالة وسوء مراعاة وماذاك في الكلب

لغات: مَلَّ يمَلّ ملالة (س) اکتانا، بے ثبات ہونا، راعٰی مراعاةً (مفاعلة) حفاظت کرنا۔

ترکیب: هو مبتدا، الكلب خبر، إلا حرف استثناء، أن حرف مشبہ بہ فعل، فيه متعلق بہ محذوف شدہ خبر مقدم، ملالة وسوء مراعاة معطوف شدہ اسم أن، واو عاطفہ، ما نافیہ، ذاك مبتدا في الكلب متعلق بہ محذوف شدہ خبر۔

شعر مذکور میں پہلے لفظ "كلب" سے مذمت کی پھر "إلّا" لاکر دوسری صفت ذم "ملالة وسوء مراعاة" لائے۔

(۲۲) التَّجْرِيدُ هُوَ أَنْ يُنْتَزَعَ مِنْ أَمْرٍ ذِيْ صِفَةٍ أَمْرٌ آخَرُ مِثْلُهُ فِيهَا

مُبَالَغَةٌ لِكَمَالِهَا فِيهِ وَيَكُونُ بِـ"مِنْ" نَحْوُ "لِيْ مِنْ فُلَانٍ صَدِيقٌ حَمِيمٌ" أَو فِيْ، كَمَافِيْ قَولِهِ تَعَالٰى "لَهُمْ فِيهَا دَارُ الخُلدِ" أَوِ البَاءِ، نحوُ "لَئِنْ سَأَلْتَ فُلَانًا لَتَسْئَلَنَّ بِهِ البَحْرَ" أَوْ بِمُخَاطَبَةِ الإنْسَانِ نَفْسَهُ كَقَوْلِهِ:

لاخيلَ عِندكَ تُهْدِيْها وَلاَ مالَ فلْيُسْعِدِ النُّطقُ إن لَم تُسعِدِ الحَالُ

أو بغير ذٰلك كَقَوْلِهِ:

فَلَئِنْ بَقِيتُ لَأَرْحَلَنَّ لِغَزْوَةٍ تَحْوِي الغَنَائِمَ أَوْ يَمُوتَ كَرِيمُ

(۲۳) حُسْنُ التَّعْلِيْلِ هُوَ أَنْ يُدَّعٰى لِوَصْفٍ عِلَّةٌ غَيْرُ حَقِيْقِيَّةٍ فِيْهَا غَرَابَةٌ كَقَولِهِ:

لَوْ لَمْ تَكُنْ نِيَّةُ الجَوْزَاءِ خِدْمَتَهُ لَمَا رَأَيْتَ عَلَيْهَا عِقْدَ مُنْتَطِقِ

(۲٤) اِئْتِلَافُ اللَّفْظِ مَعَ المَعْنٰى هُوَ أَنْ تَكُونَ الأَلْفَاظُ مُوَافِقَةً لِلْمَعَانِيْ، فَتُخْتَارُ الأَلْفَاظُ الجَزْلَةُ وَالعِبَارَاتُ الشَّدِيْدَةُ لِلْفَخْرِ وَالحَمَاسَةِ، وَالكَلِمَاتُ الرَّقِيقَةُ وَالعِبَارَاتُ اللَّيِّنَةُ لِلْغَزَلِ وَنَحْوِهِ كَقَولِهِ:

إِذَا مَا غَضِبْنَا غَضْبَةً مَضَرِيَّةً هَتَكْنَا حِجَابَ الشَّمْسِ أَوْقَطَرَتْ دَمًا

إِذَا مَا أَعَرْنَا سَيِّدًا مِنْ قَبِيْلَةٍ ذُرىٰ مِنْبَرٍ صَلّٰى عَلَيْنَا وَسَلَّمَا

وقَولِهِ:

لَمْ يَطُلْ لَيْلِيْ وَلٰكِنْ لَمْ انَمْ وَنَفٰى عَنِّيْ الكَرٰى طَيفٌ أَلَمْ

ترجمہ: (۲۲) تجرید وہ یہ ہے کہ کسی صفت والی چیز (موصوف) سے ایک دوسری چیز نکالی جائے جو صفت میں اسی جیسی ہو، مبالغہ کے طور پر، اس صفت کے اس میں (موصوف) میں کامل ہونے کی وجہ سے، اور تجرید حاصل ہوتی ہے "من" سے، جیسے "لي من فلان الخ" میرے لیے فلاں شخص کے توسل سے ایک جگری دوست ہے، یا "في" کے ذریعے، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول "لھم فیھا الخ" اس میں ان کے لیے ہمیشگی کا گھر ہے، اور "با" کے ذریعہ جیسے "لئن سألت الخ" اگر

تم فلاں سے سوال کرو گے تو ضرور بالضرور تم اس کے ساتھ ایک اور سمندر سے سوال کرو گے، یا انسان کا اپنے نفس کو مخاطب بنانے کے ذریعے، جیسے شاعر کا شعر
لاخيل عندك الخ ؎

نہ تو تمہارے پاس گھوڑا ہے جس کا تم ہدیہ کرو اور نہ مال، تو چاہئے کہ قوتِ گویائی مدد کرے اگر (مالی) حالت اعانت نہ کرے۔

یا ان مذکورہ صورتوں کے علاوہ کے ذریعے جیسے شاعر کا شعر "**فلئن بقيت**" الخ

پس اگر میری زندگی نے ساتھ دیا تو میں ایک ایسے غزوے کے لیے نکلوں گا جو بہت زیادہ مال غنیمت جمع کرنے کا سبب ہوگا مگر یہ کہ شریف آدمی کی موت واقع ہو جائے۔

(۲۳) حسن تعلیل وہ یہ ہے کہ صفت کے لیے کسی ایسی غیر حقیقی علت کا دعویٰ کیا جائے، جس میں ندرت ہو جیسے شاعر کا شعر: **لو لم تكن** ؎

اگر جوزا کی نیت اس کی (محبوب کی) خدمت نہ ہوتی تو تم اس کے اوپر کمر بند کسنے والے کی گھنڈی نہ دیکھتے۔

(۲۴) **ائتلاف اللفظ مع المعنى**: وہ یہ ہے کہ الفاظ معانی کے موافق ہوں، اسی لیے فصیح الفاظ اور سحر انگیز عبارتیں فخر اور بہادری کے لیے اور نرم الفاظ دل کش عبارتیں غزل اور اس جیسے مضمون کے لیے لائی جائیں، جیسے شاعر کا شعر "**إذا ما**" **الخ** ؎

جب ہم قبیلۂ مضر کی طرح غصے سے چور چور ہوتے ہیں تو ہم آفتاب کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس سے خون بہہ پڑے۔

جب ہم کسی قبیلے کے سردار کو منبر کی بلندی عاریت پر دیتے ہیں تو وہ ہمارے اوپر ہی درود و سلام بھیجتا ہے۔

اور جیسے شاعر کا شعر **لم يطل ليلي الخ** ؎

میری رات لمبی نہیں ہوئی لیکن میں سویا بھی نہیں (محبوب کے) تصورات وخیالات نے میری نیند اڑادی۔

تشریح: عبارت بالا میں محسنات معنویہ کی تین قسموں ''تجرید، حسن تعلیل، ائتلاف'' کو بیان کیا گیا ہے۔

(۲۲) تجرید کے لغوی معنی ہیں: جرّد الثوب ننگا کرنا، جرَّدَ العُودَ لکڑی چھیلنا وغیرہ اور اصطلاح بلاغت میں تجرید کہتے ہیں کسی ذی صفت شے سے اس صفت میں مماثل دوسری چیز کو نکالنا یہ بتلانے کے لیے کہ یہ صفت اس موصوف میں اتنی کامل ہے اور اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ اسی جیسا ایک اور موصوف بھی اس سے حاصل ہوسکتا ہے۔

تجرید کے مختلف طریقے ہیں کبھی تو ''تجرید'' حاصل ہوتی ہے ''من'' کے ذریعے جیسے ''لي من فلان صديق حميم'' میرے لیے فلاں کے وسیلے سے ایک اور جگری دوست ہے، یہاں تجرید کا معنی اس طریقے سے پایا جارہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے دوستی میں اتنا کامل ہے کہ اسی کے توسط سے ایک اور دوست نکالا جاسکتا ہے۔

اور کبھی ''فی'' کے ذریعے، جیسے ''لهم فيها دار الخلد'' ان کے لیے اس میں ہمیشگی کا گھر ہے، یہاں تجرید بایں طور ہے کہ جہنم خود ایک دار ہے اور پھر اس دار میں ایک ''دار خلد'' بھی ہے یعنی دار ہونے میں اتنا کامل ہے کہ اس میں سے ایک اور دار کو بھی نکالا جاسکتا ہے۔

اور کبھی ''با'' کی ذریعے جیسے ''لئن سألت فلانا لتسئلن به البحر'' اگر تم فلاں سے سوال کروگے تم اس کے ساتھ ایک اور سمندر سے سوال کروگے۔ یہاں ''تجرید'' اس طریقے سے ہے کہ فلاں شخص گویا سخاوت میں مثل سمندر کے ہے اگر تو اس سے سوال کرے گا تو اس کے ساتھ سمندر کی طرح ایک اور شخص سے

بھی سوال کرے گا یعنی تیرا سوال دو آدمیوں سے ہوگا تو گویا سخاوت میں متکلم نے ممدوح کو اتنا کامل ثابت کیا کہ اس سے ایک اور سمندر کا انتزاع کیا۔

اسی طریقے سے تجرید کبھی حاصل ہوتی ہے بایں طور کہ انسان اپنے نفس کو مخاطب بناتا ہے، جیسے شاعر کا شعر:

لاخيل عندك تهديها ولامال فليسعد النطق إن لم تسعد الحال

لغات: خيلٌ (ج) خيول گھوڑا۔ أهدىٰ إهداءً (افعال) ہدیہ کرنا۔ أسعد على الامر، إسعاداً (افعال) اعانت کرنا۔

ترکیب: لا لائے نفی جنس، خيل موصوف، تهديها صفت، موصوف باصفت معطوف علیہ، واو عاطفہ مالٌ معطوف برمحل اسم، معطوف علیہ با معطوف اسم لا، عندك موجودٌ سے متعلق ہوکر خبر، فا تفصیلیہ ليسعد فعل امر، النطق فاعل، جملہ انشائیہ، إن شرطیہ، لم تسعد فعل، الحال فاعل، فعل با فاعل جملہ خبریہ شدہ شرط، جزا محذوف۔

شعر مذکور میں تجرید بایں طور ہے کہ شاعر کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ ممدوح کی خدمت میں پیش کی جانے والی مختلف چیزیں ہیں مثلاً گھوڑا، مال وغیرہ یہ سب چیزیں تو (اے نفس) تیرے پاس نہیں لیکن ایک چیز تو ضرور ہے کہ اپنی زبان سے اس کی مدح سرائی کردے گویا کہ شاعر نے اپنی ہی ذات سے ایک شخص کا انتزاع کیا جو مفقود الخیل والمال ہے پھر اس کو مخاطب کیا۔

اور کبھی تجرید مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ سے بھی حاصل ہوتی ہے، یعنی کسی حرف کا توسط نہیں ہوتا ہے، جیسے شاعر کا شعر:

فلئن بقيت لأرحلن لغزوة تحوي الغنائم أو يموت كريم

لغات: رَحَلَ يَرْحَلُ (ف) کوچ کرنا، حَوىٰ يَحْوِي حَوَايَةً (ض) جمع کرنا۔

ترکیب: لئن بقیت شرط، لأرحلنّ فعل بافاعل، لام جارہ، غزوۃٍ موصوف،تحوي الغنائم صفت۔

شعر مذکور میں شاعر کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ میری زندگی نے ساتھ دیا تو میں بہ نفس نفیس جنگ میں شرکت کروں گا اور مال غنیمت میں شریک رہوں گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنے آپ کو فنا کردوں گا،شعر مذکور میں محل استشہاد "کریم" ہے بایں طور کہ شاعر نے مبالغتاً اپنی ذات سے کریم ہونے کا انتزاع کیا ہے، کیوں کہ بقیت میں بھی وہی شاعر ہی مراد ہے۔

(۲۳) محسنات معنویہ کی تیئیسویں قسم حسن تعلیل ہے،حسن تعلیل کا مطلب یہ ہے کہ کسی وصف کے لیے ایسی غیر حقیقی علت کا دعویٰ کیا جائے جس میں ندرت ہو جیسے عبدالرحمٰن قزوینی کا یہ شعر:

لو لم تكن نية الجوزاء خدمته لما رأيت عليها عقد منتطق

لغات: الجوزاء آسمان کے ایک برج کا نام ہے، عَقْدٌ (ج) عُقُودٌ بندش،گرہ۔انتطق انتطاقًا عورت کا کمر پر پٹکا باندھنا۔

ترکیب: لو شرطیہ تکن فعل ناقص، نية الجوزاء اسم، خدمته خبر، جملہ شرط، لام برائے تاکید، مارأیت فعل بافاعل، علیها متعلق بہ "ما رأيتَ" عقد منطق مفعول جملہ خبر۔

شعر مذکور میں شاعر نے خدمت کی علت کمر پر بندھے ہوئے پٹے کو قرار دیا ہے حالاں کہ یہ علت حقیقی نہیں ہے اس لیے کہ "جوزا" ایک ستارے کا نام ہے جس کے اردگرد دوسرے ستارے حلقہ بنائے رہتے ہیں،شاعر نے انہیں کمر بستہ خادم سے تشبیہ دی ہے، ظاہر ہے کہ کمر پر پٹہ باندھنا یہ عاقل کے لیے تو ممکن ہے غیر عاقل کے لیے نہیں، البتہ ستاروں کے اس حلقہ بنانے کو خدمت کے لیے کمر بستہ ہونے پر تشبیہ دینے میں ندرت وغرابت ضرور ہے اور اسی کا نام حسن تعلیل ہے

(۲۴) ائتلاف اللفظ مع المعنی (لفظ کا معنی کے موافق ہونا) یہ محسناتِ معنوی کی آخری قسم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ مضمون کے اعتبار سے ایسے الفاظ استعمال کیے جائے جو معنی کے بالکل موافق ہوں مثلاً اگر مضمون فخر اور بہادری کے متعلق ہے تو عبارات والفاظ بھی فصیح و بلیغ اور سحر انگیز ہوں جن سے خود فخر اور حماست مترشح ہو، اور اگر مضمون غزل وغیرہ کا ہو تو الفاظ بھی جاذب اور دلکش ہوں جیسے کہ بشار بن برد کے مندرجہ ذیل اشعار جو فخر وحماست سے متعلق ہیں: ۔

إذا ما غضبنا غضبة مضرية هتكنا حجاب الشمس أو قطرت دما
إذا ما أعرنا سيدا من قبيلة ذرى منبر صلّى علينا وسلم

لغات: هَتَكَ يهتِكُ هَتْكًا (ض) پھاڑنا، چاک کرنا۔ حجابٌ (ج) أحجبة پردہ۔ أعار إعارة (افعال) عاریت پر دینا، ذُریٰ (واحد) ذِروةٌ چوٹی، بلندی۔

ترکیب: إذا شرطیہ، ما زائدہ، غضبنا فعل بافاعل، غضبة مضرية موصوف باصفت مفعول مطلق، جملہ فعلیہ شرط، هتكنا حجاب الشمس، فعل فاعل ومفعول سے مل کر جزا، أو بمعنی إلا، قطرت دماً جملہ فعلیہ خبریہ، إذا ما شرط، أعرنا فعل بافاعل، سيداً موصوف من قبيلة كائنا کے متعلق ہو کر صفت، موصوف با صفت مفعول اول، ذرى منبر مفعول ثانی جملہ شرط، صلّى علينا وسلم جزا۔

مُطلب یہ ہے کہ جب ہم غضبناک ہوتے ہیں تو کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے حتی کہ آفتاب کے پردے کو بھی چاک کرنے سے نہیں گھبراتے اور جب ہم کسی قبیلے کے سردار کو بطور عاریت کوئی چیز عطا کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہ ہمارے ہی گن گاتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ چوں کہ بطور عاریت گیا ہوا ہے اس لیے انہیں کی مدح سرائی کرے بل کہ پہلے ہماری ہی تعریف میں اس کی زبان گویا ہوتی ہے، یہ غایت رعب ودبدبے کا عالم ہے۔

شعر مذکور کے الفاظ "هتكنا حجاب الشمس أو قطرت دما" سے ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ اس شعر میں فخر ہی فخر کا پہلو ہے۔

اور جیسے کہ دوسرا شعر جو غزل اور عشق ومحبت سے متعلق ہے۔

لم يطل ليلي ولكن لم انم ونفى عني الكرى طيف ألم

لغات: أَلَمَّ الطَّيْفُ يُلِمُّ إِلْمَامًا دل میں خیال آنا۔ طَيْفٌ (ج) أَطْيَاف خیال۔

ترکیب: لم يطل ليلي فعل با فاعل جملہ معطوف علیہ، لكن عاطفہ، لم أنم جملہ معطوف علیہ معطوف، واو عاطفہ، نفى فعل، عني متعلق بہ نفى ، الكرى مفعول بہ، طيفٌ موصوف ألم جملہ صفت، موصوف با موصوف با صفت فاعل، جملہ معطوف۔

مطلب یہ ہے کہ محبوب کا تصور نگاہوں میں ایسا رقص کرتا رہا کہ پوری رات نیند نے آنکھوں کو خیر باد کہہ دیا اور یہ تصور کچھ ایسا نرالا اور دلکش رہا کہ سوچتے سوچتے رات اتنی جلدی گذر گئی کہ جیسے رات کی طوالت ہی ختم کر دی گئی ہو۔

شعر مذکور میں "نفى الكرى ، طيفٌ ، الم" یہ ایسے الفاظ ہیں جو بہت ہی دلکش اور جاذب ہیں۔

مُحَسِّنَاتٌ لَفْظِيَّةٌ

(١) تَشَابُهُ الأَطْرَافِ هُوَ جَعْلُ آخِرِ جُمْلَةٍ صَدْرَ تَالِيَتِهَا ، أو آخِرِ بيتٍ صَدْرَ مَا يَلِيهِ ، كَقَولِهِ تَعَالَى "فِيهَا مِصْبَاحٌ ، المِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ، الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ" وكَقَولِ الشَّاعِرِ:

إِذَا نَزَلَ الحَجَّاجُ أرضًا مَرِيْضَةً تَتَبَّعَ أَقْصَى دَائِهَا فَشَفَاهَا

شَفَاهَا مِنَ الدَّاءِ العُضَالِ الَّذِي بِهَا غُلَامٌ إِذَا هَزَّ القَنَاةَ سَقَاهَا

(۲) ألجناسُ هُوَتشَابُهُ اللَّفظَينِ فِي النُّطقِ لافِي المعْنى ويكُونُ تامًّا وغيرَتَامّ ، فَالتَّامُّ مَا اتَّفقتْ حُرُوفُهُ فِي الهَيْئةِ وَالنَّوعِ والعَدَدِ وَالتَّرتِيبِ وَهُوَ مَتَماثِلٌ إنْ كَانَ بينَ لَفظَينِ مِنْ نوعٍ وِاحِدٍ نحوُ : ؎

لَمْ نَلقَ غيرَكَ إنسَانًا يُلاذُ بِهِ فَلا بَرِحَتَ لِعَينِ الدَّهرِ إنسَانًا

وَمُستوفًى إن كانَ مِنْ نوعَينِ نحوُ: ؎

فَدَارِهِمْ مَادُمتَ فِيْ دَارِهِمْ وَأرْضِهِمْ مَادُمتَ فِيْ أرْضِهِمْ

وَمُتَشَابِهٌ إنْ كَانَ بينَ لَفظَينِ أحَدُهُمَا مُركَّبٌ والآخَرُ مُفرَدٌ واتَّفقا فِي الخطِّ نحوُ ؎

إذا مَلِكٌ لَمْ يَكُنْ ذَاهِبَةٍ فَـدَعْـهُ فَـدَولَـتُـهُ ذَاهِـبَـةٌ

وَمَفرُوقٌ إنْ لَمْ يَتَّفِقَا نَحوُ: ؎

كُلُّكُمْ قَدْ أخَذَ الجَامَ وَلاَ جَامَ لَنَا مَاالَّذِىْ ضَرَّمُدِيرَ الجَامِ لَوْ جَامَلَنَا

محسنات لفظیہ

(۱) تشابہ اطراف وہ کسی جملے کے آخری لفظ کو اس کے بعد آنے والے جملے کا پہلا جز بنا دینا ہے، یا کسی شعر کے آخری لفظ کو اس سے متصل شعر کا پہلا جز بنا دینا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''فیھا مصباح الخ'' اس طاق میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے جیسے کوئی چمک دار ستارہ ہو اور جیسے شاعر کا شعر: ''إذا نزل الخ''

جب حجاج کسی بیمار زمین پر فروکش ہوتا ہے تو اس زمین کی بیماری کی انتہا کا پتہ لگالیتا ہے پھر اس کو شفایاب کر دیتا ہے۔

اس کو شفا دیتا ہے اس لاعلاج مرض سے جس میں وہ مبتلا ہو وہ ایسا جوان ہے کہ جب نیزے کو حرکت دیتا ہے تو اسے سیراب کر دیتا ہے۔

(۲) جناس وہ دولفظوں کا تلفظ میں مشابہ ہونا ہے نہ کہ معنی میں اور جناس تام وغیر تام ہوتا ہے، تو جناس تام وہ جناس ہے جس کے حروف ہیئت، نوع، عدد اور ترتیب میں متفق ہوں اور وہ متماثل ہے اگر دولفظوں کے درمیان (اتحاد) ایک نوع سے ہو، جیسے شاعر کا شعر لم نلق غيرك الخ ۔

(اے ممدوح) آپ کے علاوہ ہم نے کسی ایسے انسان کو نہیں پایا جس کی پناہ لی جائے لہٰذا تم ہمیشہ زمانے کے آنکھ کی پتلی بنے رہو۔

اور مستوفی ہے اگر (دولفظوں کے درمیان اتحاد) دو نوع سے ہو، جیسے "فدارهم مادامت الخ" ۔

تم ان کے ساتھ رواداری کرو جب تک ان کے گھر میں رہو اور ان کو خوش رکھو جب تک ان کی سرزمین میں رہو۔

اور متشابہ ہے اگر دولفظوں میں سے ایک مرکب اور دوسرا مفرد ہو اور خط میں دونوں متفق ہوں جیسے شاعر کا شعر "إذا ملك الخ" ۔

جب بادشاہ داد و دہش والا نہ ہو تو اسے چھوڑ دے کیوں کہ اس کی سلطنت ختم ہونے والی ہے

اور مفروق ہے اگر دونوں متفق نہ ہوں (خط و کتابت ہیں) جیسے كلكم.

تم میں سے ہر ایک نے جام لے لیا اور ہمارے لیے کوئی جام نہیں کون سی چیز ساقی کو نقصان میں ڈال دیتی اگر وہ ہمارے ساتھ اچھا معاملہ کرتا۔

تشریح: محسنات معنویہ کے بیان سے فارغ ہونے کے بعد اب حضرات مصنفینؒ محسنات لفظیہ کا بیان شروع کر رہے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ محسنات لفظیہ کی پہلی قسم تشابہ اطراف ہے۔

(۱) تشابہ اطراف کا مطلب یہ ہے کہ کسی جملے کے آخری لفظ کو مابعد والے جملے کا پہلا لفظ بنا دیا جائے یا اگر شعر ہے تو ایک شعر کے آخری لفظ کو دوسرے شعر کا

پہلا لفظ بنا دیا جائے گویا کہ تشابہ اطراف کا استعمال نثر و نظم دونوں میں ہوتا ہے، نثر کی مثال، جیسے "فیها مصباح ، المصباح فی زجاجة ، الزجاجة كانها كوكب درّيّ"

آیت مذکورہ میں ایک جملے کا اختتام "مصباح" پر ہو رہا ہے تو دوسرے جملے کی ابتدا بھی لفظ "مصباح" ہی سے ہو رہی ہے، اسی طریقے سے ایک جملے کا اختتام لفظ "زجاجة" پر ہو رہا ہے تو دوسرے جملے کی ابتدا بھی لفظ "زجاجة" ہی سے ہو رہی ہے اور شعر کی مثال جیسے

إذا نزل الحجاج أرضا مريضة تتبع أقصى دائها فشفاها
شفاها من الداء العضال الذى بها غلامٌ إذا هزّ القناة سقاها

لغات: تَتَبَّعَ تَتَبُّعًا تلاش کرنا، أقصى اسم تفصيل (ج) أقاصٍ زیادہ دور، قَصِيَ يَقْصٰى قصًا المكانُ (س) دور ہونا داءٌ عُضَالٌ عاجز کر دینے والا مرض عَضَلَ يَعْضُلُ عَضْلاً الأمرُ (ن) سخت ہونا۔ هز يهز هزاً ہلانا، قناةٌ (ج) قنا نیزہ۔

ترکیب: إذا شرطیہ، نزل الحجاج فعل وفاعل، أرضًا مريضة موصوف باصفت مفعول، جملہ شرط، تَتَبَّعَ فعل بافاعل، أقصى دائها مرکب اضافی شدہ مفعول، جملہ معطوف علیہ، فا عاطفہ، شفاها، فعل فاعل ومفعول جملہ خبریہ شدہ معطوف، معطوف علیہ ومعطوف جملہ معطوفہ شدہ جزا، شفاها فعل وفاعل ومفعول، من جارہ، الداء موصوف العضال صفت اول، الذي موصول، بهایکون کے متعلق ہو کر صلہ، موصول باصلہ صفت ثانی، مجرور شدہ متعلق بہ شفاها، هو مبتدا محذوف، غلامٌ موصوف إذا هزّ القناة شرط، شفاها جزا، جملہ صفت شدہ خبر۔

اشعار مذکورہ میں پہلے شعر کا اختتام لفظ "شفاها" پر ہوا ہے اور دوسرے

شعر کا آغاز بھی لفظ "شفاھا" ہی سے ہوا ہے۔

(۲) محسنات لفظیہ کی دوسری قسم جناس ہے۔ جناس کے لغوی معنی ہیں مشابہ ہونا، ہم جنس ہونا، اور اصطلاح بلاغت میں جناس کا مطلب یہ ہے کہ دو لفظ تلفظ میں مشابہ ہوں، اور معنی میں مختلف ہوں جناس کی دو قسمیں ہیں (۱) جناس تام (۲) جناس غیر تام۔

جناس تام: وہ جناس ہے جس میں تمام حروف چار چیزوں یعنی ہیئت، نوع، عدد اور ترتیب میں متفق ہوں ہیئت سے مراد حرکات وسکنات اور نقطہ ہیں، اور نوع سے مراد حروف ہجاء ہیں، یعنی الف تا ی۔ عدد سے مراد مقدار حروف اور ترتیب سے حروف کی تقدیم وتاخیر مراد ہے۔ جناس تام کی چار قسمیں ہیں (۱) متماثل (۲) مستوفی (۳) متشابہ (۴) مفروق۔

متماثل: وہ جناس تام ہے جس میں دو ہم جنس لفظ ایک ہی نوع کے ہوں یعنی دونوں اسم یا فعل یا حرف ہوں، جیسے شاعر معری کا یہ شعر ؎

لم نلق غيرك انسانا يلاذ به　　فلا برحت لعين الدهر إنسانا

لغات: لَقِيَ يَلْقٰى لِقَاءً (س) ملنا، ملاقات کرنا، لَاذَ يَلُوذُ لَوذًا (ن) پناہ گیر ہونا، انسان العين (ج) أناسي آنکھ کی پتلی۔

ترکیب: لم نلق فعل وفاعل، غيرك مفعول اول، انسانًا موصوف، يلاذ به صفت، موصوف با صفت، مفعول ثانی جملہ خبریہ، فا تفصیلیہ، لا برحت فعل ناقص واسم، لعين الدهير متعلق بہ برحت، انسانًا خبر۔

شعر مذکور میں محل استشہاد دونوں "إنسان" ہیں دونوں ایک ہی نوع کے ہیں یعنی اسم ہیں، البتہ معنی ایک نہیں ہے چناں چہ پہلے انسان سے مراد "آدمی" ہے جب کہ دوسرے سے مراد "آنکھ کی پتلی" ہے۔

مستوفی: وہ جناس تام ہے جس میں دو لفظ دو نوع کے ہوں مثلاً ایک فعل ہو

تو دوسرا اسم ہو، جیسے ابن فضالہ کا مندرجہ ذیل شعر: ؎

فدارهم مادمت في دارهم وأرضهم مادامت في أرضهم

لغات: داریٰ یداري مداراة (مفاعلة) رواداری کرنا، مدارات کرنا، دارٌ (ج) دُورٌ و دِيَارٌ گھر۔ أرضٰی إرضَاء (افعال) خوش کرنا۔

ترکیب: فاتفسیریہ، داریٰ فعل بافاعل، هم مفعول بہ، مادمت فعل ناقص واسم، في دراهم محذوف کے متعلق ہوکر خبر، یہی ترکیب وأرضهم مادمت في أرضهم کی ہوگی۔

شعر مذکور میں محل استشہاد دونوں "دارهم" اور دونوں "ارضهم" ہے بایں طور کہ پہلا "دار" فعل ہے جو مداراة سے امر واحد مذکر حاضر ہے اور دوسرا "دار" اسم ہے جو بمعنی "گھر" ہے اور "هم" ضمیر پہلے میں مفعول ہے اور دوسرے میں مضاف، دونوں میں ضمیر مضاف الیہ ہے اسی طریقے سے "أرضهم" میں سے پہلا ارض فعل امر ہے جو "ارضاء" سے مشتق ہے اور دوسرا "ارض" اسم ہے جو زمین کے معنی میں ہے اور یہاں بھی "هم" ضمیر پہلے میں مفعول ہے جب کہ دوسرے میں مضاف الیہ ہے، دونوں جگہ مضاف الیہ کی ضمیر ہے۔

متشابہ: وہ جناس تام ہے جس میں دو متشابہ لفظوں میں سے ایک مرکب اور دوسرا مفرد ہو اور لکھنے میں دونوں یکساں ہوں، جیسے ابو الفتح کا یہ شعر ؎

إذا ملك لم يكن ذاهبة فدعه فدولته ذاهبة

لغات: ملك (ج) ملوك، بادشاہ، هِبَةٌ (ج) هِبَاتٌ داد و دہش، عطیہ، دَوْلَة (ج) دُوَلٌ سلطنت، حکومت۔

ترکیب: إذا شرطیہ، لم یکن فعل ناقص، ملك اسم (وزن شعری کی وجہ سے مقدم ہوگیا ہے) ذاهبة مرکب اضافی ہوکر خبر جملہ شرط، فا جزائیہ، دعهٔ فعل

بافاعل ومفعول جزا، فا تعلیلیہ،ہو لہ مبتدا، ذاهبۃ خبر۔

شعر مذکور میں محل استشہاد دونوں ''ذاهبة'' ہیں جن میں سے ایک مرکب اور دوسرا مفرد ہے اور خط دونوں کا یکساں ہے چنانچہ پہلے ''ذاهبة'' میں ''ذا'' بمعنی ''والا'' اور ''هبة'' بمعنی ''داد ودہش'' سے مرکب ہے اور دوسرا ذاهبة، ذهب یَذْهَبُ سے صیغہ اسم فاعل مؤنث ہے۔

مفروق: وہ جناس تام ہے جس میں ایک لفظ مرکب اور دوسرا مفرد ہو اور خط میں دونوں یکساں نہ ہوں جیسے

کلکم قد أخذ الجام ولاجام لنا ما الذي ضر مدير الجام لو جاملنا

لغات: ضرّ یضرّ ضرًّا (ن) نقصان پہنچانا، أدار إدارةً (افعال) گھمانا، جامل مجاملة اچھا معاملہ کرنا۔

ترکیب: کلکم مبتدا، قد أخذ فعل بافاعل، الجام مفعول بہ، جملہ خبر مبتدا، واو عاطفہ، لا برائے نفی جنس جام اسم. لنا محذوف سے متعلق ہوکر خبر، ما بمعنی أي شي موصوف، الذي موصول ضرّ فعل فاعل مدير الجام مفعول بہ، جملہ صفت شدہ مبتدا، لو جاملنا شرط، جزا محذوف۔

شعر مذکور میں محل استشہاد ''جام لنا'' اور ''جاملنا'' ہیں پہلا لفظ ''جام'' اور ''لنا'' سے مرکب ہے اور دوسرا لفظ ''جاملنا'' مفرد ہے اور ہر ایک کے لکھنے کا طریقہ الگ الگ ہے۔

وَغيرُ التَّامّ مَا اخْتلِفَ فِي وَاحدٍ مِّن الأربعةِ المُتقدِّمة، وهو مُحرَّف إنْ اختلَفَ لَفظاهُ فِي هَيئةِ الحُرُوفِ فقط، نحوُ قَوله:

جُبّةُ البُرْدِ جُنّةُ البَرْدِ

وَمُطَرَّفٌ إن اختلفَا فِي عددِ الحُرُوفِ فقط وكانتِ الزّيادةُ أوّلاً نحو؎

إِنْ كَانَ فِرَاقُنَا مَعَ الصُّبْحِ بَدَا لَا أَسْفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ صُبْحٌ أَبَدَا

وَمُذَيَّلٌ إِنْ كَانَتِ الزِّيَادَةُ آخِرًا نَحْوُ ۔

يَمُدُّوْنَ مِنْ أَيْدٍ عَوَاصٍ عَوَاصِمٍ تَصُولُ بِأَسْيَافٍ قَوَاضٍ قَوَاضِبِ

وَمُضَارِعٌ إِنِ اخْتَلَفَا فِيْ حَرْفَيْنِ غَيْرَ مُتَبَاعِدَيِ الْمَخْرَجِ نَحْوُ يَنْهَوْنَ وَيَنْئَوْنَ ، وَلَاحِقٌ إِنْ تَبَاعَدَا نَحْوُ "إِنَّهُ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ .

وَجِنَاسُ قَلْبٍ إِنِ اخْتَلَفَا فِيْ تَرْتِيْبِ الْحُرُوفِ فَقَطْ كَنِيلٍ وَلِيْنٍ وَسَاقٍ وَقَاسٍ .

ترجمہ: اور غیر تام وہ جناس ہے جو مذکورہ چار وامور (ہیئت، نوع، عدد ترکیب) میں سے کسی ایک میں مختلف ہو اور وہ محرف ہے اگر اس کے دونوں لفظ صرف ہیئتِ حروف میں مختلف ہوں، جیسے شاعر کا شعر جبة البرد الخ

دھاری دار کپڑے کا جبہ سردی کا ڈھال ہے۔

اور مطرف ہے اگر وہ وہ دونوں صرف عدد حروف میں مختلف ہوں اور زیادتی شروع میں ہو جیسے شاعر کا یہ شعر ان کان فراقنا الخ:

اگر صبح کے ساتھ ساتھ ہی ہمارے درمیان فراق کا ظہور ہونے والا ہے تو خدا کرے اس کے بعد صبح ہی کا ظہور نہ ہو۔

اور مذیل ہے اگر زیادتی آخر میں ہو، جیسے شاعر کا شعر یمدون من اید الخ

وہ لوگ ایسے ہاتھوں کو پھیلانے والے ہیں جو لاٹھی سے وار کرنے والے ہیں (دشمنوں پر) اور حفاظت کرنے والے ہیں (دوستوں کی)۔

وہ ایسی تلواروں سے حملہ کرتے ہیں جو فیصلہ کرنے والی اور خاتمہ کرنے والی ہیں (دشمنوں کا)

اور مضارع ہے اگر وہ دونوں دو ایسے حروف میں مختلف ہوں جو بعید المخرج

نہ ہوں جیسے ینهون عنه وینئون عنه وہ لوگ اس سے روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں، اور لاحق ہے اگر بعید المخرج ہوں جیسے انه علی ذٰلك الخ اور اس کو (انسان کو) خود بھی اس کی خبر ہے اور وہ مال کی محبت میں غرق ہے۔

اور جناس قلب ہے اگر دونوں لفظ صرف ترتیب حروف میں مختلف ہوں، جیسے "نیل ولین وساق وقاس" دریائے نیل، نرم، پنڈلی، سخت۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفؒ جناس غیر تام کی وضاحت فرمائی ہے اور اس کے اقسام کو شمار کیا ہے چناں چہ فرمایا کہ جناس غیر تام وہ جناس ہے جو مذکورہ چاروامور (ہیئت، نوع، عدد، ترکیب) میں سے کسی ایک میں مختلف ہو اس کے بعد جناس غیر تام کی چھ قسمیں بیان کی ہیں (۱) محرف (۲) مطرف (۳) مذیل (۴) مضارع (۵) لاحق (۶) جناس قلب۔

محرف: وہ جناس غیر تام ہے جس میں دونوں لفظ نوع، عدد، ترتیب میں تو متفق ہوں لیکن ہیئت حروف یعنی حرکت وسکون تشدید میں مختلف ہوں، جیسے جُبَّةُ البُردِ جُنَّةُ البَردِ مثال مذکور میں "بُرد" میں با کو ضمہ ہے اور "بَرْدٌ" میں با کو فتحہ ہے، اور نوع، ترتیب، اور عددِ حروف میں یکسانیت ہے۔

لغات: جُبَّةٌ (ج) جُبَبٌ جبہ، زرہ، بُردٌ (ج) بُرودٌ دھاری دار کپڑا، جُنَّةٌ (ج) جُنَنٌ ڈھال، بَرَدَ یَبْرُدُ بَرْدًا (ن) ٹھنڈا ہونا۔

مطرف: وہ جناس غیر تام ہے جس میں دو لفظ صرف تعداد حروف میں مختلف ہوں اور زیادتی متجانس کے شروع میں ہو مطلب یہ ہے کہ دو لفظوں میں سے ایک میں زائد اور دوسرے میں کم ہو یہ زیادتی اگر شروع میں ہے تو اسی کا نام مطرف ہے، جیسے ؎

إن كان فراقنا مع الصبح بدا لا أسفر بعد ذٰلك صبح أبدا

لغات: فارق مفارقة وفراقا (مفاعلة) آپس میں جدائیگی ہونا،

أسفر إسفارًا (افعال) روشن ہونا۔

ترکیب: إن شرطیہ، کان فعل ناقص، فراقنا اسم، بدامع الصبح جملہ خبر، لا اسفر فعل، صبح فاعل، بعد ذلك ظرف، أبدا ظرف ثانی۔

شعر مذکور میں محل استشہاد "بدا" اور "أبدا" ہے بایں طور کہ پہلے مصرعہ کا آخری لفظ "بدا" ہے اور دوسرے مصرعہ کا آخری لفظ "ابدا" ہے جس میں "الف" زائد ہے اور زیادتی شروع میں ہے۔

دوسری مثال آیت قرآنی "والتفت الساق بالساق إلى ربك يومئذ المساق" ہے۔ اور ایک پنڈلی دوسرے پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے اس دن تیرے پروردگار کی طرف جانا ہوتا ہے۔ اس آیت میں ساق کے مقابلے میں لفظ مساق میں ایک حرف میم شروع میں زائد ہے۔

مذیل: وہ جناس غیر تام ہے جس میں دو لفظ صرف تعداد حروف میں مختلف ہوں اور زیادتی آخر میں ہو، جیسے ابوتمام کا شعر:

يمدون من أيد عواص عواصم تصول بأسياف قواض قواضب

لغات: مدّ يمدّ مدّا (ن) دراز کرنا، پھیلانا، أيد (واحد) يدٌ ہاتھ، عصا يعْصُو عصوًا (ن) لاٹھی سے وار کرنا۔ عصم يعْصِمُ عصْماً (ض) محفوظ رکھنا، صَالَ يَصُولُ صَوْلاً (ن) حملہ کرنا، قواض (واحد) قاضية، فیصلہ کرنے والی، قَضٰى يَقْضِي قَضَاءًا (ض) فیصلہ کرنا، قواضِبُ (واحد) قَاضِبَةٌ، بہت تیز کاٹنے والی، قَضَبَ يَقْضِبُ قَضْبًا (ض) کاٹنا۔

ترکیب: يمدّون فعل بافاعل، من جارہ، أيد موصوف، عواصٍ عواصم ہر دو صفت، موصوف باصفت مجرور شدہ متعلق بہ يمدون جملہ خبریہ، تصول فعل بافاعل، با جارہ، أسياف موصوف، قواضٍ قواضب ہر دو صفت شدہ مجرور بہ تصول، جملہ خبریہ۔

شعرمذکور میں محل استشہاد "عواصٍ وعَواصمُ" اور "قَواضٍ وقواضب" ہے "عواصم" کے آخر میں ایک حرف میم "قواضٍ" کے مقابلے میں زائد ہے، ایسے ہی "قواضب" کے آخر میں ایک حرف "ب" قواض کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

مضارع: وہ جناس غیر تام ہے جس میں دونوں الفاظ کے حروف مختلف ہوں لیکن وہ دونوں مختلف لفظ قریب المخرج ہوں بعید المخرج نہ ہوں، جیسے "ینھون وینئون" اس میں "ھا" اور "ھمزہ" دو مختلف جنس کے حروف ہیں اور قریب المخرج ہیں چناں چہ دونوں کا مخرج، اقصی حلق یعنی حلق کا پچھلا حصہ ہے (سینے کی طرف)

لاحق: وہ جناس غیر تام ہے جس میں دو لفظ کے حروف تو یکساں ہوں مگر صرف ایک ایک حرف مختلف ہو اور دونوں مختلف حروف قریب المخرج نہ ہوں بل کہ بعید المخرج ہوں جیسے "إنه علی ذٰلك لشهيد وإنّه لحب الخير لشديد" یہاں "شهيد" اور "شديدٌ" کے درمیان تجنیس ہے اور "شهيد" میں "ہ" اور "شديدٌ" میں "دال" بعید المخرج ہیں، کیوں کہ "ھا" کا مخرج اقصائے حلق اور دال کا مخرج زبان کی نوک اور ثنایا علیا کی جڑ ہے۔

جناس قلب: وہ جناس ہے جس میں دونوں ہم جنس لفظ صرف حروف کی ترتیب میں مختلف ہوں، جیسے "نیل" "لین" "ساق" "قاس" یہاں "نیلٌ" اور "لینٌ" اسی طرح ساقٌ اور قاسٌ دونوں لفظ حروف میں متحد ہیں، البتہ ترتیب میں مختلف ہیں۔

(۳) التَّصْدِيرُ ويُسَمّٰى رَدَّ العَجْزِ علَى الصَّدرِ ، هُوَ فِيْ النَّثْرِ أَنْ يُّجْعَلَ أَحَدُ اللَّفْظَينِ المُكَرَّرَينِ أوِ المُتَجَانِسَينِ أوِ المُلْحَقَينِ بِهِمَا (بِأَنْ جَمَعَهُمَا اِشْتِقَاقٌ أَوْ شِبْهُهُ) فِيْ أَوَّلِ الفِقْرَةِ ، والثَّانِيْ فِيْ آخِرِهَا نحوُ قَوْلِهِ

تعَالٰی "وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰهُ أحَقُّ أنْ تخْشَاهُ" وقَولِكَ "سَائِلُ اللَّئِيمِ يَرْجِعُ وَ دَمْعُهُ سَائِلٌ" ألأوَّلُ مِنَ السُّوَالِ وَالثَّانِي مِنَ السَّيْلا ن ، وَنحوُ "اِسْتَغفِرُوْا رَبَّكُم إنَّهُ كَانَ غَفَّارًا" ونحوُ "قَالَ إنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِنَ القَالِيْنَ" وَفِيْ النَّظْمِ أنْ يَكُونَ أَحَدُهُمَا فِيْ آخِرِ البَيتِ والآخَرُ فِيْ صدرِ المِصْرَاعِ الأوَّلِ أو بعدَهُ نحوُ قَولِهِ: ؎

سَرِيعٌ إلٰى ابْنِ العَمِّ يَلْطِمُ وَجْهَهُ وَلَيسَ إلٰى دَاعِي النَّدٰى بِسَرِيعِ

وَقَوْلِهِ: ؎

تَمَتَّعْ مِنْ شَمِيمِ عَرَارِ نَجْدٍ فَمَا بَعْدَ العَشِيَّةِ مِنْ عَرَارٍ

ترجمہ: (۳) تصدیر اور اس کا نام ردالعجز علی الصدر بھی رکھا جاتا ہے، وہ (اس کی صورت) نثر میں یہ ہے کہ دو لفظ مکرر یا ہم جنس یا ایسے دو لفظ جو ہم جنس کے ساتھ ملحق ہوں بایں طور کہ ان دونوں کو اشتقاق یا شبہ اشتقاق نے جمع کر دیا ہو، ان میں سے ایک کو جملے کے شروع میں لایا جائے اور دوسرے کو جملے کے آخر میں، جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان "وتخشی الناس واللّٰه أحق أن تخشاه" اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے، اور جیسے تمہارا قول "سائل اللئیم الخ" کمینے سے سوال کرنے والا اس حال میں لوٹتا ہے کہ اس کے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ پہلا "سائل" سوالٌ سے مشتق اور دوسرا "سیلانٌ" سے اور جیسے "استغفر واربکم الخ" اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو بے شک وہ بہت معاف کرنے والا ہے اور جیسے "قال إنی لعملکم الخ" حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہارے کام سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ اور نظم میں تصدیر یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک شعر کے آخر میں ہو اور دوسرا پہلے مصرعہ کے شروع میں ہو یا یہ کہ بعد میں ہو، جیسے سریع الخ

وہ چچازاد بھائی کے چہرے پر طمانچہ مارنے میں بہت تیز ہے مگر بخشش کے

طلب گار کی طرف تیز نہیں ہے۔

اور جیسے شاعر کا شعر "تمتع من شميم الخ" ؎

نجد کے درختِ عرار کی خوشبو سے لطف اندوز ہولو؛ کیوں کہ (آج کی) شام کے بعد عرار ملنے والا نہیں ہے۔

تشریح: عبارت بالا میں مصنفینؒ نے محسنات لفظیہ کی تیسری قسم تصدیر اور رد العجز علی الصدر کی وضاحت کی ہے چناں چہ فرمایا کہ: تصدیر نثر اور نظم دونوں میں مستعمل ہے مگر دونوں کی صورت مختلف ہے، نثر میں تصدیر کی صورت یہ ہے کہ دو لفظ مکرر یا ہم جنس یا ملحق بہ ہم جنس میں سے ایک کو جملے کے شروع میں اور دوسرے کو جملے کے آخر میں لایا جائے۔

بأن يجمعهما اشتقاق او شبهه: اس عبارت میں مصنفین الحاق بالمجانست کی صورت کو بیان کیا ہے کہ الحاق بالمجانست کے پائے جانے کی دو شکلیں ہیں (۱) دونوں الفاظ کا مشتق منہ ایک ہو (۲) مشتق منہ تو ایک نہیں مگر ایک ہونے کے مشابہ ہو یعنی بہ ظاہر دونوں کا مشتق منہ ایک معلوم ہو مثال آرہی ہے۔

نثر کی مثال جیسے "وتخشى الناس والله أحق أن تخشاه" آیت کریمہ میں محل استشہاد "تخشى" ہے جو مکرر ہے یعنی جملے کے شروع میں بھی ہے اور آخر میں بھی، دونوں الفاظ کی صورت اور دونوں کا معنی بھی ایک ہے، اور دوسری مثال "سائل اللئيم يرجع ودمعه سائل" یہ مثال ہم جنس کی ہے، چناں چہ پہلے "سائل" اور دوسرے "سائل" دونوں کی شکل وجنس ایک ہے مگر مشتق منہ دونوں کا الگ الگ ہے اسی لیے معنی بھی دونوں کے الگ الگ ہیں پہلا "سائل" "سوال" سے مشتق ہے جب کہ دوسرا "سائل" "سیلان" سے مشتق ہے۔

تیسری مثال "استغفروا ربكم إنه كان غفارًا" یہ مثال ملحق بہ ہم جنس باعتبار اشتقاق کی ہے، چناں چہ "استغفروا" اور "غفارًا" دونوں کا مشتق منہ ایک

ہے اور وہ "غفر" ہے چوتھی مثال "قال إني لعملکم من القالین" یہ مثال ملحق بہ ہم جنس باعتبار شبہ اشتقاق کی ہے، بایں طور کہ "قال" جو جملے کے شروع میں ہے اور "قالین" جو جملے کے آخر میں ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک مصدر سے ملحق ہیں (اور یہی شبہ اشتقاق ہے) حالاں کہ ایسا نہیں بل کہ پہلا "قال یقول قولاً (ن) بمعنی" کہنا" سے مشتق ہے جب کہ دوسرا قَلِيَ يَقْلَى قِلًى (س) بمعنی بغض رکھنا، برا سمجھنا، سے مشتق ہے۔

وفي النظم أن یکون: نظم میں تصدیر کے پائے جانے کی صورت یہ ہے کہ مذکورہ بالا چار طرح کے دولفظوں میں سے ایک شعر کے آخر میں اور دوسرا پہلے مصرعے کے شروع میں یا ایک تو شعر کے آخر میں ہو اور دوسرا شروع میں نہ ہو بل کہ کچھ بعد میں ہو، جیسے مندرجہ ذیل دونوں اشعار:

سریع إلی ابن العم یلطم وجهه ولیس إلی داعي الندی بسریع
تمتع من شمیم عرار نجد فما بعد العشیة من عرار

لغات: سریعٌ صیغۂ صفت ہے، تیز رفتار، سرُع یسرُع سراعة (ک) تیز رفتار ہونا، الندی (ج) أنداء بخشش، بھلائی کے کام، تمتع تمتعًا (تفعل) لفظ اندوز ہونا، شمیم عمدہ خوشبو۔ عرارٌ (واحد) عرارةٌ ایک خوشبودار پھول جس کا نام گاؤچشم ہے۔

ترکیب: ھو مبتدا محذوف، سریعٌ صیغہ صفت، إلی ابن العم، جار مجرور متعلق بہ سریع، یلطم وجهه ضمیر "سریع" سے حال واقع ہے، لیس فعل ناقص إلی داعي الندی متعلق مقدم بہ سریع، سریعٌ بہ متعلق خود مجرور شدہ متعلق بہ محذوف، محذوف بہ متعلق خبر لیس، تمتع فعل با فاعل، من جارہ، شمیم عرار نجد مرکب اضافی شدہ مجرور، متعلق بہ تمتع جملہ انشائیہ، فا تعلیلیہ، ما مشابہ بہ لیس من زائدہ، عرار اسم ما، بعد العشیة خبر۔

پہلے شعر میں محل استشہاد "سریع" ہے جو مکرر ہے ایک شعر کے آخر میں اور ایک مصرعہ اول کے شروع میں اور دوسرے شعر میں محل استشہاد "عرار" ہے جو مکرر ہے ایک تو شعر کے آخر میں ہے اور دوسرا مصرع اول کے شروع میں تو نہیں ہے بل کہ اس کے بعد ہے یعنی درمیان میں۔

(٤) ألسَّجعُ هُوَ تَوَافُقُ الفَاصِلَتَينِ نَثرًا فِي الحَرفِ الأخِيرِ وَهُوَ ثَلٰثَةُ أنوَاعٍ: مُطَرَّفٌ إن اختَلَفَ الفَاصِلَتَانِ فِي الوَزنِ ، نحوُ "الإنسانُ بِآدَابِهِ لا بِزِيِّهِ وَثِيَابِهِ" وَمُتَوَازٍ إن اتَّفَقَتَا فِيهِ ، نحوُ "المَرءُ بِعِلمِهِ وأدَابِهِ لابِحَسَبِهِ وَنَسَبِهِ" وَمُرَصَّعٌ إن اتَّفَقَت ألفَاظُ الفِقرَتَينِ أو أكثَرُهَا فِي الوَزنِ و التَّقفِيَةِ نحوُ "يَطبَعُ الأسجَاعَ بِجَوَاهِرِ لَفظِهِ وَيَقرَعُ الأسمَاعَ بِزَوَاجِرِ وَعظِهِ".

(٥) مَا لَا يَستَحِيلُ بِالانعِكَاسِ وَيُسَمّٰى القَلبَ هُوَ كَونُ اللَّفظِ يُقرَءُ طَردًا وَعَكسًا نَحوُ "كُن كَمَا أمكَنَكَ" وَ "رَبَّكَ فَكَبِّر"

(٦) ألعَكسُ هُوَ أن يُقَدَّمَ جُزءٌ فِي الكَلامِ عَلٰى آخَرَ ثُمَّ يُعكَسُ، نحوُ قَولِكَ "قَولُ الإمامِ إمامُ القَولِ" "كَلامُ الحُرِّ حُرُّ الكلامِ"

(٧) ألتَّشرِيعُ هُوَ بِنَاءُ البَيتِ عَلٰى قَافِيَتَينِ بِحَيثُ إذَا سَقَطَ بَعضُهُ كَانَ البَاقِي شِعرًا مُفِيدًا كَقَولِهِ :

يَا أيُّهَا المَلِكُ الَّذِي عَمَّ الوَرىٰ مَا فِي الكِرَامِ لَهُ نَظِيرٌ يُنظَرُ
لَو كَانَ مِثلُكَ آخَر فِي عَصرِنَا مَا كَانَ فِي الدُّنيَا فَقِيرٌ مُعسِرٌ

فَإنَّهُ يَصِحُّ أن تُحذَفَ أوَاخِرُ الشُّطُورِ الأربَعَةِ وَيَبقٰى :

يَاأيُّهَا المَلِكُ الَّذِي مَا فِي الكِرَامِ لَهُ نَظِيرٌ
لَو كَانَ مِثلُكَ آخَرَ مَا كَانَ فِي الدُّنيَا فَقِيرٌ

ترجمہ: (۴) سجع وہ نثر کے اعتبار سے دو فاصلوں کا آخری حرف میں متفق ہونا ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں ان میں سے ایک مطرف ہے۔ اگر دونوں جملے

وزن میں مختلف ہوں، جیسے "الانسان الخ" انسان اپنے اخلاق وآداب سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ اپنے کپڑے اور لباس سے۔ان میں کا دوسرا متوازی ہے اگر وہ دونوں وزن میں متفق ہوں، جیسے "المرء بعلمه الخ" آدمی اپنے علم وادب سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ اپنے حسب ونسب سے۔اوران میں کا تیسرا مرصع ہے اگر دونوں جملوں کے مکمل الفاظ یا اکثر وبیشتر وزن اور قافیہ میں متفق ہوں، جیسے "یَطْبَعُ الأَسْجَاعَ الخ" وہ اپنے الفاظ کے جواہرات سے مقفی کلام ڈھالتا ہے اور اپنے وعظ کی تنبیہات سے کانوں کوکھٹکھٹاتا ہے۔

(۵) مالا یستحیل بالانعکاس: اوراس کا نام قلب بھی ہے وہ لفظ کا اس طور پر ہونا ہے جسے سیدھا اور الٹا پڑھا جاسکے، جیسے "کن کما أمکنك وربك فکبر" ہوجاؤ جیسا تمہارے لیے ممکن ہو۔اورآپ اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے۔

(٦) عکس وہ یہ ہے کہ کلام میں ایک جز کودوسرے پر مقدم کردیا جائے پھر الٹ دیا جائے، جیسے تمہارا قول "قول الإمام الخ" امام کا قول، قول کا امام ہوتا ہے، آزادآدمی کا کلام کلاموں میں آزاد ہوتا ہے۔

(۷) تشریع وہ شعر کی بنیاد کا دوقافیوں پر اس طریقے سے ہونا ہے کہ اگر اس کا کچھ حصہ ساقط ہوجائے تو باقی حصہ ایک مفید شعر رہے جیسے شاعر کا شعر: یاأیُّها الملك الخ:

اے وہ بادشاہ جس کے احسانات پوری مخلوق کو عام ہیں فیاضوں میں اس کا کوئی نظیر نہیں جونظر آئے اگر ہمارے زمانے میں آپ جیسا کوئی اور (بادشاہ) ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی فقیر اور تنگ دست نہ رہتا۔

کیوں کہ یہ صحیح ہے کہ ان چاروں اشعار کے آخری حصے حذف کردئے جائیں اور باقی ماندہ الفاظ اس طرح (شعر مفید) رہیں۔ ؎

اے وہ بادشاہ جس کی فیاضوں میں کوئی نظیر نہیں۔اگر آپ جیسا کوئی اور ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی فقیر نہ رہتا۔

تشریح: عبارت بالا میں حضرات مصنفینؒ نے محسنات لفظیہ کی چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں قسم کو بیان کیا ہے، چناں چہ فرمایا کہ محسنات لفظیہ کی چوتھی قسم سجع ہے سَجَعَ يَسْجَعُ سجعًا (ف) کے لغوی معنی آتے ہیں، مقفی کلام بولنا اور بلاغت کی اصطلاح میں سجع یہ ہے کہ دو یا زیادہ جملے آخری حرف میں موافق ہوں یعنی پہلے جملے کا آخری حرف جو ہو وہی دوسرے جملے کا بھی آخری حرف ہو، سجع کی تین قسمیں ہیں (۱) مطرف (۲) متوازی (۳) مرصع۔

سجع مطرف: یہ ہے کہ دونوں جملوں کے کلمے وزن میں مختلف ہوں جیسے "الانسان بآدابه لابزيه وثيابه" مثال مذکور میں "الانسان بآدابه" ایک جملہ ہے اور "لابزيه وثيابه" دوسرا جملہ ہے اور دونوں جملوں کا آخری حرف ایک ہے (ہ) ضمیر غائب، مگر وزن دونوں کا ایک نہیں ہے چناں چہ پہلا (آدابه) "فَاعَاله" کے وزن پر ہے۔جب کہ دوسرا (ثيابه) "فِعَاله" کے وزن پر ہے۔

سجع متوازی: یہ ہے کہ دونوں جملوں کے کلمے وزن میں متفق ہوں جیسے "المر بعلمه وأدبه لابحسبه ونسبه" آدمی کا معیار اپنے علم اور ادب سے ہوتا ہے نہ کہ حسب ونسب سے، مثال مذکور میں "علمه وأدبه" کا جو وزن ہے وہی حسبه ونسبه کا بھی ہے یعنی دونوں جملوں کے کلمے وزن میں متفق ہیں۔

سجع مرصع: یہ ہے کہ دونوں جملوں کے کل یا اکثر الفاظ وزن اور قافیہ میں برابر ہوں، جیسے "يطبع الأسجاع بجواهر لفظه ويقرع الأسماع بزواجر وعظه".

لغات: طَبَعَ يَطْبَعُ طبعًا (ف) ڈھالنا، کسی چیز کی تصویر بنانا۔أسجاعٌ (واحد) سجع مقفی کلام۔جواهر (واحد) جوهرةٌ کسی چیز کی اصل۔قَرَعَ

يقْرَعُ قرعًا (ف) کھٹکھٹانا۔ اسماعٌ (واحد) سمعٌ کان۔ زواجر (واحد) زاجرۃ تنبیہ کی چیز۔ زَجَرَ يزْجُرُ زجرًا (ن) ڈانٹنا۔ وَعَظَ يعِظُ عِظَةً (ض) وعظ ونصیحت کرنا۔

عبارت بالا میں تمام الفاظ ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں چناں چہ "يطبع" اور "يقْرَعُ" ایک وزن اور ایک قافیے کے ہیں اسی طرح "أسْجَاعُ" اور "أسْمَاعُ" جَوَاهِرُ اور زَوَاجِرُ اور لفظِهِ اور وعظِهِ سب وزن اور قافیے میں بالکل برابر ہیں

مالا يستحيل بالإنعكاس :(جس کی حالت پلٹنے سے تبدیل نہ ہو)

اس کا دوسرا نام قلب ہے قلب کے لغوی معنی ہیں پلٹنا اور بلاغت کی اصطلاح میں قلب یہ ہے کہ لفظ کو الٹا سیدھا دونوں طریقے سے پڑھا جا سکے یعنی حروف کے الٹ دینے سے پھر وہی عبارت بن جائے جو پہلے تھی جیسے "كن كما أمكنك"

اس مثال میں "كن كما" میں پہلا حرف کاف دوسرا نون تیسرا کاف چوتھا میم اور پانچواں الف ہے۔ اب اگر اس کو الٹ دیا جائے تو أمكنك بن جائے گا اور "أمكنك" کی جو ترتیب ہے اگر اس کے حروف الٹ دئے جائیں تو "كن كما" ہو جائے گا۔

اسی طریقے سے "وربك فكبر" میں "ربك" اور "كبر" کے حروف کی جو ترتیب ہے اگر اس کو الٹ دیا جائے تو لفظ "ربَّك" "كبِّرْ" اور لفظ "كَبِّرْ" "ربك" بن جائے گا۔

العكس: عکس کے لغوی معنی ہیں الٹنا اور اصطلاح میں عکس کہتے ہیں کہ کلام کے ایک جز کو دوسرے جز پر مقدم کر دیا جائے پھر اس کو الٹ دیا جائے جیسے "قول الإمام إمام القول" اس میں "قول" کو "الامام" پر مقدم کیا گیا پھر اسی کو پلٹ کر "إمام" کو مقدم اور "قول" کو مؤخر کر دیا گیا، اور بعینہ یہی طریقہ "كلام الحر حر الكلام" میں اپنایا گیا ہے۔

التشريع: محسنات لفظیہ کی ساتویں قسم تشریع ہے، شَرَّعَ الطَّرِيقَ يُشَرِّعُ تشْرِيعًا کے لغوی معنی ہیں راستہ ظاہر کرنا اور تشريع الحبل کے معنی ہیں رسی کی گرہ کھولنا، اصطلاح بلاغت میں تشریع یہ ہے کہ شعر کی بنیاد دو قافیوں پر ہو اس طرح کہ اگر شعر کا کچھ حصہ ساقط ہو جائے تو بقیہ حصہ ایک مفید شعر رہے یعنی شعر کے مطلب میں کوئی خرابی نہ ہو، جیسے شاعر کا شعر ؎

يا أيها الملك الذي عم الورىٰ ما في الكرام له نظير ينظر
لو كان مثلك آخر في عصرنا ما كان في الدنيا فقير معسر

لغات: عَمَّ يعُمُّ عُمُومًا (ن) عام ہونا۔ وری مخلوق۔ کرام (واحد) کریم فیاض، دریا دل۔ نظیر (ج) نظراء نظیر مثیل۔ عصر (ج) عصور زمانہ۔ فقیر (ج) فقراء محتاج۔ معسر تنگ دست۔ أعسرَ إعسَارًا (افعال) تنگ دست ہونا۔

ترکیب: يا حرف ندا، أيها مرکب اضافی ہوکر موصوف، الملك صفت اول، الذي اسم موصول، عمّ الورىٰ جملہ ہوکر صلہ، موصول با صلہ صفت ثانی، موصوف باہر دو صفت منادیٰ، ما مشابہ بہ لیس، نظير ينظر موصوف با صفت اسم ما، في الكرام اور "لهٗ" "ثابتا" کے متعلق ہوکر خبر ما۔

"لو" شرطیہ كان فعل ناقص، مثلُك اسم، آخَرَ خبر، جملہ شرط، ماكان في الدنيا فقيرٌ معسرٌ کی ترکیب شعر اول کے مصرع ثانی کی طرح ہوگی، یہ جملہ جزا ہے۔

شعر مذکور کی بنیاد دو قافیوں پر ہے ایک تو "الورىٰ ويُنظرُ" پر پہلے شعر میں، اور "عصرِنا ومعسِر" پر دوسرے شعر میں، اور دوسرے قافیے کی بنیاد "الذي ونظير" پر، پہلے شعر میں، اور "آخر وفقير" پر دوسرے شعر میں، اسی وجہ سے اگر عم الورىٰ ونظير کو اور "في عصرنا ومعسر" کو ساقط کر دیا جائے تب

بھی مطلب بالکل صحیح رہتا ہے جیسا کہ ماقبل میں گذرا۔

(۸) ألمُوارَبَةُ هِيَ أن يجعَلَ المُتكَلِّمُ كَلامَهُ بِحيثُ يُمكِنهُ أن يُغيِّرَ مَعنَاهُ بِتحرِيفٍ أو تصْحِيفٍ أو غيرِهِمَا، لِيَسلَمَ مِنَ المُواخَذةِ كَقولِ أبِي نُوَّاسٍ:

لَقَد ضَاعَ شِعْرِى علىٰ بَابِكُمْ كَمَا ضَاعَ عِقْدٌ علىٰ خَالِصة

فَلَمَّا أنْكَرَ علَيهِ الرَّشِيدُ ذٰلكَ قَالَ لم اقُلْ إلاَّ :

لَقَدْ ضَاءَ شِعرِى علىٰ بَابِكُم كَمَا ضَاءَ عِقدٌ علىٰ خالِصة

(۹) اِئْتِلافُ اللَّفظِ معَ اللَّفظِ هُوَ كونُ ألفاظِ العِبارةِ مِن وادٍ واحدٍ فِيْ الغرَابَةِ وَالتَّاهُّلِ كقَولهٖ تعالىٰ "تَاللّٰهِ تَفتَؤُ تَذْكُرُ يوسُفَ" لمَّا اُتِيَ بِالتَّاءِ الَّتِيْ هِيَ أغرَبُ حُرُوفِ القَسَمِ اُتِيَ بِـ"تَفتَأُ" الَّتِي هِيَ أغرَبُ أفْعالِ الاستِمرَارِ.

ترجمہ: (۸) موار بہ وہ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام کو اس طریقے سے پیش کرے کہ اس کے لیے اس کے معنی کا بدلنا تعریف وتصحیف یا ان دونوں کے علاوہ کے ذریعہ ممکن ہو، تا کہ وہ گرفت سے بچ جائے جیسے ابونواس کا شعر لقد ضاع الخ

میرا شعر آپ کے دربار پر ایسے ہی ضائع ہوگیا جیسے ہار ضائع ہوگیا خالصہ (نامی باندی) پر۔

تو جب خلیفہ ہارون رشید نے اس پر اس کی نکیر کی تو اس نے کہا میں نے تو صرف یہ کہا ہے "لقد ضاء الخ"

میرا شعر آپ کے دروازے پر اس طرح چمکا جیسے کہ ہار خالصہ پر۔

ائتلاف اللفظ مع الفظ : وہ عبارت کے الفاظ کا غیر مانوس اور مانوس میں ایک ہی نوع سے ہونا ہے جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ کا قول "تاللّٰہِ تفتؤ الخ" بخدا آپ یوسف کا تذکرہ سدا کرتے ہی رہیں گے۔ جب اُس تا کو استعمال کیا گیا

جو قسم کے حروف میں سب سے زیادہ غیر مانوس ہے تو اس "تفتؤ" کو لایا گیا جو استمرار کے الفاظ میں سب سے زیادہ غیر مانوس ہے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفینؒ نے محسنات لفظیہ کی آٹھویں اور نویں قسم کو بیان کیا ہے چناں چہ فرمایا کہ آٹھویں قسم موار بہ ہے، موار بہ کے لغوی معنی ہیں فریب دینا، مکاری کرنا، اور بلاغت کی اصطلاح میں موار بہ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام کو لوگوں کے سامنے اس طریقے سے پیش کرے کہ بوقت ضرورت تحریف یعنی حرکت کی تبدیلی کر کے یا تصحیف یعنی لفظ کو بدل کر یا ان کے علاوہ کسی اور طریقے سے کلام میں تبدیلی کر سکے تا کہ مواخذہ اور گرفت سے بچ جائے، جیسے ؎

لقد ضاع شعری علٰی بابکم کما ضاع عقد علٰی خالصة

لغات: ضَاعَ يضِيعُ ضِيَاعًا (ض) ضائع ہونا، عِقدٌ (ج) عقُودٌ ہار، خالصہ خلیفہ ہارون رشید کی چہیتی باندی، ضاء یضوء ضوءً (ن) روشن ہونا چمکنا۔

ترکیب: لقد ضاع فعل، شعري فاعل، علٰی بابکم مجرور شدہ متعلق بہ شعری، کاف جارہ بمعنی مثل مضاف، ما موصولہ، ضاع فعل، عقدٌ فاعل، علٰی خالصة جار با مجرور متعلق بہ ضاع، جملہ شدہ مضاف الیہ مجرور شدہ متعلق بہ ضاع

یہ شعر ابونواس کا ہے جو اس نے خلیفہ ہارون رشید کے متعلق اس وقت کہا تھا جب خلیفہ نے اسے انعام سے محروم رکھا تھا، یہ سن کر خلیفہ اس پر بگڑ گیا اور اسے طلب کیا تو اس نے عین کو ہمزہ سے بدل دیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت! میں نے تو یہ اشعار کہے ہیں۔

لقد ضاء شعري علٰی بابکم کما ضاء عقد علٰی خالصة

تو بادشاہ خوش ہو گیا اور اسی خطیر رقم سے نوازا۔ شعر مذکور میں "تصحیف" بایں طور ہے کہ شاعر نے لفظ "ضاع" کو "ضَاءَ" سے بدل دیا ہے جس کی وجہ سے

شعر کا مطلب ہی بدل گیا ہے۔

ائتلاف اللفظ مع اللفظ: یہ محسنات لفظیہ کی نویں اور آخری قسم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عبارت کے الفاظ مانوس وغیر مانوس ہونے میں یکساں ہوں یعنی اگر جملے میں مانوس الاستعمال الفاظ ہوں تو سبھی ایسے ہی ہوں، ایسا نہ ہو کہ ایک لفظ غیر مانوس اور دوسرا لفظ مانوس الاستعمال ہو، جیسے "تاللّٰہ تفتؤ تذکر یوسف" آیت مذکورہ میں "تا" کو استعمال کیا گیا ہے جو قسم کے حروف میں سب سے زیادہ غیر مانوس ہے تو اس کے بعد اسی جملے میں "تفتؤ" کو بھی لایا گیا جو استمرار کا معنی دینے والے الفاظ میں سب سے زیادہ غیر مانوس الاستعمال ہے تاکہ یکسانیت برقرار رہے۔

خاتمة

سَرِقةُ الكَلامِ أنواعٌ .

(مِنْهَا) أنْ ياخُذَ النَّاثِرُ أوِ الشَّاعِرُ مَعْنًى لِغَيرِهِ بِدُون تَغْيِيرٍ لِنَظْمِهِ كَمَا أخذَ عَبْدُ اللّٰهِ بنُ زُبَيرٍ بَيتَيْ مُعَنٍ وَادَّعَاهُمَا لِنَفْسِهِ وهُمَا :

إِذَا أنتَ لَمْ تُنصِفْ أخاكَ وجدْتَّهُ عَلَى طرَفِ الهَجْرانِ إنْ كانَ يَعْقِلُ
وَيَركَبُ حَدَّ السَّيفِ مِنْ أن تَضِيمَهُ إذَا لم يكُنْ عنْ شفرةِ السَّيفِ مزحلُ

وَمِثلُ هذا يُسمّٰى نسخًا وانتِحَالاً ، وَمَنْ قبِيلِهِ أنْ تُبدَّلَ الألفَاظُ بِمَا يُرادِفُهَا كأنْ يُقَالَ فِيْ قَولِ الحُطَيئَةِ :

دَعِ المَكارِمَ لاتَرحَلْ لِبُغْيَتِهَا واقْعدْ فإنَّكَ أنتَ الطَّاعِمُ الكَاسِيْ
ذَرِ المَآثِرَ لاتَذْهَبْ لِطَلبِهَا واجلِسْ فَإنَّكَ أنتَ الآكِلُ اللَّابِسُ

وقَرِيبٌ مِنْهُ أن تُبدَّلَ الألفَاظُ ، بِمَا يُضادُّهَا فِيْ المعنٰى معَ رِعَايَةِ النَّظْمِ وَالتَّرتِيبِ كمَا لَو قِيلَ فِيْ قولِ حسَّانَ :

بِيضُ الوُجُوهِ كَرِيمَةٌ أحسابُهُمْ شُمُّ الأُنُوفِ مِنَ الطِّرازِ الأوَّلِ
سُودُ الوُجُوهِ لئِيمَةٌ أحسَابُهُمْ فُطسُ الأُنوفِ مِنَ الطِّرازِ الآخِرِ

خاتمہ

کلام کے سرقے کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ نثر نگار یا شاعر کسی دوسرے مضمون کو لے، بغیر اس کے کہ نظم کلام میں کوئی تبدیلی کرے جیسے کہ عبد اللہ بن زبیر شاعر نے معن کے دو شعر لیے اور ان دونوں کو اپنی طرف منسوب کر دیا اور وہ دونوں شعر یہ ہیں "إذا أنت الخ"

اگر تم اپنے بھائی کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں کرو گے تو تم اس کو جدائی کے دہانے پر پاؤ گے اگر عقلمند ہے، اور وہ تمہارے ظلم سے بچنے کے لیے تلوار کی دھار پر بھی سوار ہو جائے گا جب تلوار کی دھار سے چھٹکارا ممکن نہ ہو۔

اور اس جیسے سرقے کا نام نسخ اور انتحال رکھا جاتا ہے اور اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ الفاظ کو بدل دیا جائے ایسے الفاظ کے ذریعہ جو اس کے مرادف اور ہم معنی ہوں جیسا کہ کہا جاتا ہے حطیہ کے شعر میں "دع المكارم الخ"

تم عمدہ اخلاق کو چھوڑ دو اس کی تلاش میں مت پھرو اور بیٹھے رہو کیوں کہ تم (اچھا) کھانے اور پہننے والے ہو۔

تم کارناموں کو بالائے طاق رکھ دو ان کے حصول کی خاطر سفر مت کرو اور بیٹھے رہو کیوں کہ تم کھانے اور پہننے والے ہو۔

اور اسی کے قریب یہ بھی ہے کہ الفاظ بدل دئے جائیں ایسے الفاظ سے جو نظم کلام اور ترتیب کی رعایت کے ساتھ معنی میں مخالف ہوں جیسے کہ حضرت حسان ؓ کے شعر میں پڑھا جائے "بيض الوجوه الخ"

وہ لوگ خوب رو ہیں ان کا خاندان بہت ہی معزز ہے اول درجے کے لوگ

ہیں، اونچی ناک والے ہیں۔

وہ سیاہ چہرے والے ہیں رذیل خاندان والے ہیں، نیچی ناک والے تھرڈ کلاس کے لوگوں میں سے ہیں۔

تشریح: محسنات معنویہ ولفظیہ کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد مصنفینؒ خاتمہ کی بحث کا آغاز فرمارہے ہیں، سب سے پہلے حضرات مصنفینؒ نے سرقۂ کلام کے اقسام کو بیان کیا ہے کہ ایک نثر نگار اور شاعر دوسروں کے کلام سے کن کن طریقوں سے اشعار، مضمون وغیرہ کی ترتیب دیتا ہے، چناں چہ فرمایا کہ سرقے کی چند قسمیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی نثر نگار اور شاعر دوسروں کے مضمون میں بغیر کسی لفظی ومعنوی ترمیم اور حذف واضافے کے یہ دعویٰ کردے کہ یہ کلام میرا ہے یعنی بعینہٖ دوسرے کے کلام کو اپنی طرف منسوب کردے، جیسے کہ معن بن اوس کے دوشعروں کے بارے میں عبداللہ بن زبیر نے یہ دعویٰ کردیا کہ یہ اشعار میرے ہیں۔

إذا أنت لم تنصف أخاك وجدته على طرف الهجرن إن كان يعقل

ويركب حد السيف من أن تضيمهٗ إذا لم يكن عن شفرة السيف مزحل

لغات: أنصف ينصف إنصافًا (افعال) انصاف کرنا، هجَرَ يهجُرُ هجرًا وهِجرانًا (ن) قطع تعلق کرنا، جدا ہونا، عَقَلَ يعقِلُ عقلاً (ض) دانشمند ہونا، عاقل ہونا، حَدٌّ (ج) حُدُودٌ دھار، حدَّ السَّيفَ يحُدُّ حدًّا (ن) تلوار تیز کرنا، ضَامَ يضِيمُ ضيمًا (ض) ظلم کرنا، شفرَةٌ (ج) شفرَاتٌ دھار، کنارہ، زَحَلَ عن مكانه يزْحَلُ زُحُولاً (ف) دور ہونا، علیحدہ ہونا۔

ترکیب: إذا شرطیہ، أنت مبتدا، لم تنصف فعل بافاعل، أخاك مفعول بہ جملہ خبریہ شدہ خبر مبتدا، مبتدا باخبر جملہ شدہ شرط، وجدتہٗ فعل وفاعل ومفعول على طرف الهجران جار بامجرور متعلق بہ وجدته، جملہ جزا، إن كان

یفعل شر، جزا محذوف جس پر جملہ سابقہ دال ہے، یرکب حد السّیف، فعل فاعل ومفعول، من جارہ، أن تضیمهٗ بتاویل مصدر شدہ مجرور، متعلق بہ یرکب جملہ جزاء مقدم، إذا لم یکن الخ شرط مزحل، لم یکن کا اسم ہے، من شفرة السیف خبر۔

اشعار بالا کے بارے میں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ شاعر کا نام عبداللہ بن زبیر ہے (زاء کے فتحہ اور با کے کسرہ کے ساتھ) یہ عرب کے مشہور شعراء میں سے ہے، صحابی رسول حضرت عبداللہ بن زبیر نہیں ہیں ان کا نام زاء کے ضمہ اور با کے فتحہ کے ساتھ ہے، اسی طریقے سے دوسرے شاعر کا نام معن ہے (بضم المیم وفتح العین) جو اوس کے بیٹے ہیں معن بن زائدہ مشہور شاعر عرب مراد نہیں ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کا ساتھ اسی وقت تک دے سکتا ہے جب تک وہ اس کے ساتھ اخوت و بھائی چارگی اور عدل وانصاف کا معاملہ کرے مگر جب ظلم پر اتر آئے گا اور ظلم حد سے تجاوز کر جائے گا تو پھر یقیناً ساتھ چھوڑ دے گا، اور ظلم سے بچنے کے لیے ہر وہ تدبیر اپنانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے ممکن ہو سکے گا۔

اس قسم کو فن بلاغت کی اصطلاح میں نسخ اور انتحال کہا جاتا ہے، انتحال کے لغوی معنی بھی یہی ہیں یعنی دوسرے کے شعر یا قول کو اپنی طرف منسوب کرنا۔

ومن قبیله: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ نسخ ہی کے قبیل سے یہ بھی ہے کہ دوسرے کے کلام کو تو بعینہ اپنا کلام نہ کہا جائے البتہ دوسرے کے کلام کے الفاظ کو دوسرے ہم معنی الفاظ سے بدل دیا جائے جیسے کہ حطیہ کے شعر میں:

دع المکارم لاترحل لبغیتها   واقعد فإنك أنت الطاعم الکاسي

ذر المآثر لاتذهب لمطلبها   واجلس فإنك أنت الآکل اللابس

لغات: ودَعَ یدَعُ ودْعًا (ف) چھوڑنا، رَحَلَ یرْحَلُ رحْلاً

(ف) کوچ کرنا، سفر کرنا، بَغٰی یبغِی بُغیةً (ض) طلب کرنا، تلاش کرنا، قَعَدَ یقْعُدُ قُعُودًا (ن) بیٹھنا، طَعِمَ یطْعَمُ طَعْمًا (س) کھانا کھانا، کَسِيَ یکسٰی کسًا (س) کپڑا پہننا، وذَرَیذِرُ وَذْرًا (ض) چھوڑنا، مآثر (واحد) مآثرة کارنامہ، لَبِسَ یَلْبَسُ لُبْسًا (س) کپڑا پہننا۔

ترکیب: دَعْ فعل بافاعل، المکارم مفعول بہ جملہ انشائیہ، لاترحل فعل بافاعل، لِبُغیَتِهَا جار مجرور متعلق بہ لاترحل، جملہ انشائیہ، فا تعلیلیہ إن حرف مشبہ بہ فعل، ك اسم، أنت مبتدا، الطاعم خبر اول، الکاسي خبر ثانی جملہ خبر إنّ، یہی ترکیب دوسرے شعر کی بھی ہوگی۔

اشعار مذکورہ میں پہلے اور دوسرے شعر کے الفاظ تو بدلے ہوئے ہیں مگر معنی دونوں اشعار کے ایک ہی ہیں جیسا کہ ترجمے اور لغات کی تشریح سے واضح ہے اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مفاخر اور کارناموں سے کیا مطلب؟ وہ تو دوسروں کا میدان ہے تم اس میدان کے آدمی نہیں ہو تمہیں کھانا اور کپڑا چاہیے اور یہ دونوں چیزیں تو تمہیں مہیا ہی ہیں۔

وقریب منه: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ نسخ ہی کے قریب قریب یہ بھی ہے کہ کلام کو ایسے الفاظ سے بدل دیا جائے جو معنی میں پہلے کلام کے الفاظ سے مختلف ہوں مگر نظم کلام اور ترتیب کی رعایت میں متحد ہوں، جیسے کہ حضرت حسانؓ کے شعر میں:

بیض الوجوه کریمة أحسابهم   شم الأنوف من الطراز الأول
سود الوجوه لئیمة أحسابهم   فطس الأنوف من الطراز الآخر

لغات: باضَ یَبِیضُ بَیضًا (ض) سفیدی میں غالب ہونا، وَجُوهٌ (واحد) وجْهٌ چہرہ، بیض الوجوه اصل میں الوجوه البیض تھا، اضافة الصفت الی الموصوف کے قبیل سے ہے، أحسابٌ (واحد) حسبٌ حسب

ونسب، حیثیت شمّ (واحد) أشمّ نک چڑھا خوددار، أنوفٌ (واحد) أنفٌ ناک، یہ بھی اصل میں "الأنوف الشم" تھا، سود (واحد) أسود، سیاہ لئیمة لئیم کا مونث ہے (ج) لئام خسیس، کمینہ، لؤم یلؤم لؤمًا (ک) کم درجہ والا ہونا، کمینہ ہونا، فطسٌ (واحد) أفطس، چپٹی ناک والا، فطس یفطسُ فطسًا (س) چپٹی ناک والا ہونا۔

ترکیب: هم مبتدا، بیض الوجوہ مرکب اضافی خبر اول، کریمة أحسابهم، صیغۂ صفت با فاعل خود خبر ثانی، شم الأنوف خبر ثالث، من الطراز الأول محذوف سے متعلق ہو کر خبر رابع، مبتدا تمام خبروں سے مل کر جملہ اسمیہ خبریہ، یہی ترکیب دوسرے شعر کی بھی ہے۔

اشعار مذکورہ میں پہلے اور دوسرے اشعار کے الفاظ ومعانی دونوں بدلے ہوئے ہیں مگر دونوں اشعار کے الفاظ ایسے ہیں جن کے اوزان اور ترتیب میں یکسانیت ہے، پہلا شعر مدحیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تو مدتوں سے شریف مانے جارہے ہیں، حسب نسب کے اعتبار سے بھی عالی ہیں ان کی ناک تو ہر زمانے میں اونچی رہی ہے اور دوسرا شعر ذم کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ پہلے لوگوں کی برابری کہاں کر پائیں گے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اُن کے چہرے سفید، اِن کے چہرے سیاہ، اُن کا حسب ونسب عالی، یہ حسب ونسب کی بلندی سے خالی، اُن کی ناک اونچی، اِن کی نیچی، کوئی جوڑ ہی نہیں۔

(وَمِنْهَا) أَنْ يَّأخُذَ المَعْنٰى وَيُغَيِّرَ اللَّفظَ ويَكُونُ الكَلامُ الثَّانِي دُونَ الأَوَّلِ أو مُسَاوِيًا لَهُ كَمَا قَالَ أَبُو الطَّيِّبِ فِيْ قَولِ أَبِيْ تَمَّامٍ: ؎

هَيْهَاتَ لَايَاتِيْ الزَّمَانُ بِمِثْلِهٖ اِنَّ الزَّمَانَ بِمِثْلِهٖ لَبَخِيلُ
أَعدىٰ الزَّمَانَ سَخَاؤُهُ فَسَخَابِهٖ وَلَقَدْ يَكُونُ بِهٖ الزَّمَانُ بَخِيلاً

فَالمِصراعُ الثَّانِي مَاخُوذٌ مِنَ المِصراعِ الثَّانِي لِأَبِي تَمَّامٍ وَالأَوَّلُ أَجوَدُ سبكًا ومِثلُ هٰذا يُسَمّٰى إغَارَةً ومَسْخًا .

(وَمِنْهَا) أنْ يَاخُذَ المَعْنٰى وَحْدَهُ ويَكُونُ الثَّانِي دُونَ الأَوَّلِ أو مُساوِيًا لهُ كَمَا قَالَ أَبُو تَمَّامٍ فِي قولِ مَنْ رثٰى ابنَهُ : ؎

وَالصَّبرُ يُحْمَدُ فِي المَوَاطِنِ كُلِّهَا اِلَّا عَلَيكَ فَإِنَّهُ لا يُحْمَدُ
وَقَدْ كَانَ يُدعٰى لابِسُ الصَّبرِ حَازِمًا فَأصبَحَ يُدْعٰى حَازِمًا حِينَ يَجْزِعُ

وَهٰذَا يُسَمّٰى إلْمَامًا وسلْخًا .

(۲) الإقْتِبَاسُ هُوَ أن يَضمَنَ الكَلامُ شَيئًا مِنَ القُرآنِ أوِ الحَدِيثِ لاعَلٰى أَنَّهُ مِنْهُ كَقَولِهِ : ؎

لاتَكُنْ ظَالِمًا ولَا تَرْضَ بِالظُّلمِ وَأَنكِرْ بِكُلِّ مَا يُسْتَطَاعُ
يَومَ يَاتِي الحِسابُ بِالظَّلُومِ مَا مِنْ حَمِيمٍ وَّلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ

وقَولِهِ : ؎

لاتُعَادِ النَّاسَ فِي أوطَانِهِمْ قَلَّمَا يُرعٰى غَرِيبُ الوَطَنِ
وَاِذَا مَا شِئْتَ عَيشًا بَينَهُمْ خَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ

وَلَا بَأسَ بِتَغْيِيرٍ يَسِيرٍ فِي اللَّفظِ المُقْتَبَسِ لِلوَزْنِ أو غيرِهِ نحوُ: ؎

قَدْ كَانَ مَا خِفْتُ أنْ يَكُونَا اِنَّـا اِلَى اللّٰهِ رَاجِعُونَا

وفِي القُرآنِ "إنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيهِ رَاجِعُونَ"

ترجمہ: اور اسی (سرقہ کلام) میں سے یہ بھی ہے کہ شاعر دوسرے کے کلام کے معنی کو لے لے اور لفظ بدل دے اور دوسرا کلام پہلے سے کم تر ہو یا اس کے مساوی ہو، جیسا کہ شاعر متنبی نے ابوتمام کے قول میں کہا ہے "ھیھات الخ"

افسوس زمانہ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتا بے شک زمانہ اس کی نظیر (پیش کرنے) سے عاجز اور بخیل ہے۔

اس کی سخاوت زمانے پر عام ہوگئی تو اس زمانے نے بھی اس کی بھی سخاوت کی بخدا زمانہ اس پر سخاوت کے بارے میں بخیل تھا۔

دوسرا مصرع ابوتمام کے دوسرے مصرعے سے ماخوذ ہے اور پہلا زیادہ عمدہ ہے سلاست کے اعتبار سے، اور اس جیسے سرقے کا نام اغارہ اور مسخ ہے۔

اور اسی سرقہ کلام میں سے یہ بھی ہے کہ صرف معنی کو لے لے اور دوسرا پہلے سے کم تر یا اس کے مساوی ہو، جیسا کہ ابوتمام نے اس شخص کے کلام میں سرقہ کر کے کہا ہے جس نے اپنے بیٹے کا مرثیہ کہا تھا ''والصبر یحمد الخ''

اور صبر تمام مواقع میں قابل ستائش ہے سوائے تمہارے اوپر کیوں کہ یہاں قابل ستائش نہیں۔

اور صبر کرنے والے کو دور اندیش سمجھا جاتا تھا اب اسی شخص کو دور اندیش کہا جانے لگا جو بے صبری کے وقت اظہار بے صبری کرے۔

اور اس جیسے سرقے کا نام المام اور سلخ ہے۔

(۲) اقتباس وہ یہ ہے کہ کلام قرآن یا حدیث کے کسی جزو کو متضمن ہو اس طریقے پر نہیں کہ وہ کلام ہی اس میں سے (قرآن وحدیث میں سے) ہو، جیسے شاعر کا شعر ''لاتکن ظالماً الخ'' ہے

نہ تو تم ظالم بنو اور نہ ہی ظلم سے خوش ہو اور ہر ممکن طریقے سے تم اس پر نکیر کرو، جس دن ظالموں کا حساب ہوگا تو نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی کوئی سفارشی جس کی سفارش قابل قبول ہو۔

اور جیسے شاعر کا شعر ''لاتُعادِ النّاس الخ''

لوگوں سے ان کے وطنوں میں عداوت مت رکھو بہت کم پردیسی کا لحاظ کیا جاتا ہے۔

اور اگر تم ان کے درمیان زندگی گذارنا چاہتے ہو تو لوگوں کے ساتھ حسن

اخلاق سے پیش آ ؤ۔

اور کوئی حرج نہیں ہے اقتباس کئے ہوئے لفظ میں تھوڑی سی تبدیلی کر دینا وزن وغیرہ کے لیے، جیسے شاعر کا شعر "قد كان ما الخ"

وہی ہوا جس کے ہونے کا اندیشہ تھا بے شک ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

اور قرآن کریم میں ہے "إنا لله الخ" ہم سب اللہ ہی کی ملک میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفینؒ نے سرقہ کلام کی ایک اور صورت بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کے کلام کے معنی اور مفہوم کو لے لیا جائے اور الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے اور دوسرا کلام پہلے سے کم تر درجے کا ہو یا پہلے کے مساوی اور برابر ہو، جیسا کہ متنبّی نے ابوتمام کے قول میں کیا ہے ؎

هيهات لاياتي الزمان بمثله　　إن الزمان بمثله لبخيل

أعدى الزمان سخاؤه فسخابه　　ولقد يكون به الزمان بخيلا

لغات: بَخِيْلٌ (ج) بُخَلاءُ بُخَيل۔ بَخِلَ يَبْخَلُ بُخلاً (س) بخل کرنا۔ أعدىٰ إعداء (افعال) دوسرے تک پہنچانا۔ سخا يسخو سخاءً (ن) سخی ہونا۔

ترکیب: هيهات بمعنی بعد جملہ خبریہ، لايأتي فعل، الزمان فاعل، بمثله متعلق بہ لاياتي جملہ خبریہ، إنّ حرف مشبہ بہ فعل، الزمان اسم، لبخيل خبر بمثله متعلق بہ بخيل، أعدىٰ فعل، الزمان مفعول بہ، سخاؤه فاعل، فا تفصیلیہ، سخا فعل، به متعلق جملہ خبریہ، لقد يكون فعل ناقص الزمان اسم، بخيلاً خبر، به متعلق بہ بخيلاً۔

مذکورہ دونوں اشعار میں سے پہلا شعر ابوتمام کا ہے جو اس نے محمد بن حمید

کے مرثیے میں کہا تھا اور دوسرا شعر متنبّی کا ہے، متنبّی کے شعر کے دوسرے مصرعے کا مفہوم اور مطلب وہی ہے جو ابوتمام کے شعر کے دوسرے مصرعے کا ہے دونوں شعر کا مطلب یہی ہے کہ زمانہ ممدوح کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، مگر ابوتمام کا مصرعہ متنبّی کے مصرعے کے مقابلے میں زیادہ بامعنی اور بلاغت آمیز ہے، کیوں کہ ابوتمام نے اپنے مضمون کو جملہ اسمیہ سے ادا کیا ہے، برخلاف متنبّی کے کہ اس نے جملہ فعلیہ استعمال کیا ہے، پھر فعل میں بھی ماضی نہیں مضارع ہے جس میں یقین کے معنی نہیں ہوتا، فن بلاغت میں اس جیسے سرقے کا نام اغارہ اور مسخ ہے، اور اسے معنی لغوی سے بھی مناسبت ہے، کیوں کہ اِغارۃ اور مسخ دونوں کے معنی بدل دینے کے ہیں۔

ومنها أن ياخذ المعنى: سرقۂ کلام ہی کی ایک تیسری صورت یہ ہے کہ دوسرے کے کلام کے صرف مفہوم کو لے لیا جائے اور الفاظ بالکل پہلے سے میل نہ کھائیں، البتہ دوسرا پہلے سے کم تر ہو یا اس کے مساوی ہو، جیسے ابوتمام نے اس شخص کے قول میں کہا ہے جس نے اپنے بیٹے کا مرثیہ کہا ہے۔ ؎

والصبر يحمد في المواطن كلّها إلا عليك فإنه لايحمد

وقد كان يدعى لابس الصبر حازمًا فأصبح يدعى حازمًا حين يجزع

لغات: مَواطِن (واحد) مَوطِنٌ جائے سکونت، حزُمَ يَحْزُمُ حَزْمًا (ک) ہوشیاری اور دور اندیشی سے کام لینا، جَزِعَ يَجْزَعُ جَزَعًا (س) بے صبری کرنا۔

ترکیب: واو مستانفہ، الصبر مبتدا، يُحْمَدُ فعل بافاعل، في المواطِن في جارہ، المواطن موکد، كلّها تاکید، موکد باتاکید مجرور شدہ مستثنیٰ منہ، إلا حرف استثنا، عليك جار مجرور مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ با مستثنیٰ متعلق بہ يحمد، فا تعلیلیہ، إنّه لايحمد إن بااسم وخبر جملہ اسمیہ، واو مستانفہ، قد برائے تحقیق، كان يدعى

فعل، لابس الصبر نائب فاعل، حازمًا مفعول بہ، جملہ خبریہ، فاعاطفہ، اصبح فعل ناقص، ضمیر اسم، یدعی حازمًا جملہ خبریہ، حین یجزع مضاف با مضاف الیہ ظرف۔

مذکورہ دونوں اشعار میں سے دوسرا شعر جو ابوتمام کا ہے اس کا مفہوم اور مطلب وہی ہے جو پہلے شعر کا ہے یعنی صبر فی نفسہ ایک صفت محمود ہے جو قابل اختیار ہے مگر تمام مواقع میں نہیں؛ بل کہ بعض مواقع میں بے صبری ہی محموداور لائق ستائش ہوا کرتی ہے، مگر یہ مفہوم جس انداز سے پہلے شعر سے ادا ہورہا ہے دوسرے سے نہیں دوسرا اس سے کم درجے کا ہے، فن بلاغت میں اس کا نام المام اور سلخ ہے

(۲) الاقتباس الخ: اقتباس یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں قرآن کریم یا حدیث شریف کا کوئی جز لائے مگر اس طریقے پر نہیں کہ اس کا مقصد قرآن یا حدیث کے اس حصے کو پیش کرنا ہو؛ بل کہ یہ محض کلام میں عمدگی اور حسن پیدا کرنے کے لیے ہو، جیسے کہ

لاتكن ظالمًا ولا ترض بالظلم وأنكر بكل ما يستطاع
يوم ياتي الحساب بِالظلوم ما من حميم ولا شفيع يطاع

لغات: رَضِيَ يَرضى رضًى (س) خوش ہونا، أنكر ينكر إنكارًا (افعال) نکیر کرنا، معیوب سمجھنا، حميم (ج) أحمّاء دوست، شفيع (ج) شفعاء سفارشی، شفع يشفع شفاعة (ف) سفارش کرنا، أطاع يطيع إطاعة اطاعت کرنا، کہنا ماننا۔

ترکیب: لاتكن فعل ناقص، ضمیر اسم، ظالماً خبر جملہ معطوف علیہ، واو عاطفہ، لاترض فعل با فاعل، بالظلم متعلق جملہ معطوف علیہ معطوف، واو عاطفہ، أنكر فعل با فاعل، با جارہ كل مضاف، ما موصولہ، يستطاع جملہ صلہ، موصول با صلہ مضاف الیہ ومجرور شدہ، أنكر سے متعلق ہوا، يوم ظرف مقدم، ياتي

الحساب فعل بافاعل جملہ خبریہ، بالظلوم متعلق بہ یاتی، ما مشابہ بہ لیس من زائدہ حمیم معطوف علیہ، واو عاطفہ، لازائد، شفیع یطاع موصوف باصفت معطوف، معطوف علیہ بامعطوف اسم، خبر محذوف۔

مذکورہ دونوں اشعار میں سے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع قرآن کریم کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، جو محض کلام میں عمدگی پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

دوسری مثال جیسے شاعر کا شعر:

لاتعاد النّاس في أوطانهم قَلّما يرعى غريب الوطن
وإذا ماشئت عيشا بينهم خالق الناس بخلق حسن

لغات: عَادىٰ يُعَادِيْ مُعَادَاة (مفاعلة) عداوت رکھنا، دشمنی کرنا، رَعىٰ يَرعىٰ رَعْياً الحُرْمَةَ (ف) پاس عزت کرنا، لحاظ کرنا، غریب الوطن (ج) غرباء پردیسی، خالق مُخالقَةً (مفاعلة) خوش خوئی کیساتھ معاشرت کرنا

ترکیب: لاتعاد الناس فعل فاعل ومفعول، في أوطانهم متعلق جملہ انشائیہ، إذا شرطیہ، ما زائد، شئت فعل بافاعل عیشا مفعول، بینهم ظرف، جملہ شرط، خالق الناس فعل فاعل ومفعول، بخلق حسن موصوف باصفت مجرور شدہ متعلق بہ خالق، جملہ انشائیہ۔

ان اشعار میں سے دوسرے شعر کا دوسرا مصرع "خالق الناس بخلق حسن" حدیث ہے اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو پردیس میں پردیسی اور مسافر کی طرح ہی رہنا چاہئے یعنی عداوت اور جھگڑے سے بالکلیہ اجتناب کرنا چاہئے اور آپس میں بھی خوش اخلاقی ونرم خوئی کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہئے۔

ولابأس بتغيير الخ: مصنفینؒ فرماتے ہیں کہ اگر اقتباس کئے ہوئے الفاظ میں وزن وغیرہ کے لیے کچھ تبدیلی کردیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، جیسے

قد كان ما خفت أن يكونا إنـا إلى اللهِ راجـعونا

شعر مذکور کا دوسرا مصرع آیت قرآنی "إنا للّٰهِ وإنّا اليهِ راجِعُون" سے مقتبس ہے، اور وزن کو برقرار رکھنے کے لیے الف اشباع کا اضافہ کردیا ہے، مگر اس کی وجہ سے اقتباس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

(٣) اَلتَّضْمِينُ ويُسمّٰى الإيْداعَ هُوَ أن يَضمنَ الشِّعرُ شَيئًا مِنْ شعْرٍ آخَرَ مَعَ التَّنْبِيهِ علَيهِ إنْ لَمْ يَشْتَهِرْ كَقَولِهِ:

إذا ضَاقَ صَدْرِيْ وَخِفْتُ العِدىٰ تَمَثَّلتُ بيتًا بِحَالِيْ يَلِيقُ
فَبِاللّٰهِ ابْلُغُ مَا ارتَجِیْ وَبِاللّٰهِ أدفَعُ مَالا أُطِيقُ

وَلَا بَأسَ بِالتَّغْيِيرِ اليَسِيْرِ كَقَولِهِ : ـ

أقُولُ لِمَعْشَرٍ غَلِطُوْا وَغَضُّوْا مِنَ الشَّيخِ الرَّشِيدِ وأنكَرُوهُ
هُوَ ابنُ جَلاَ وَطَلاَّعُ الثَّنَايَا مَتىٰ يَضَعُ العِمَامَةَ تَعرِفُوهُ

(٤) (العَقْدُ والحَلُّ) ألاوَّلُ نظْمُ المَنثُورِ وَالثَّانِي نَثرُ المَنْظُومِ فَالأوَّلُ نحوُ : ـ

وَالظُّلمُ مِنْ شِيَمِ النُّفُوسِ فإنْ تجِدْ ذَا عِفَّةٍ فلِعِلَّةٍ لَا يَظْلِمُ

عُقِدَ فِيهِ قَولُ حكِيمٍ "الظُّلمُ مِنْ طِباعِ النَّفسِ وإنَّما يَصُدُّها عَنْهُ إحدىٰ عِلَّتَينِ: دِينِيَّةٌ وَهِيَ خَوفُ المَعَادِ وَدُنيَوِيَّةٌ وَهِيَ خوفُ العَقَابِ الدُّنيَوِيِّ" والثَّانِي نحوُ قَولِهِ "العِيَادَةُ سُنَّةٌ مَا جُورَةٌ وَمَكْرَمةٌ مَاثُورةٌ وَمَعَ هٰذَا فنَحنُ المَرْضٰى ونحنُ العَوَّادُ وكُلُّ وِدادٍ لايَدُومُ فلَيسَ بوِدَادٍ" وحُلَّ فِيهِ قولُ القَائِلِ : ـ

إذا مَرِضْنَا أتيناكُمْ تَعُودكُمْ وتُذْنِبُونَ فَنَأتِيكُمْ وَنَعْتَذِرُ

ترجمہ: (٣) تضمین: اور اس کو ایداع بھی کہا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ شعر کسی دوسرے شعر کے کچھ حصے کو متضمن ہو اس تضمین پر تنبیہ کرنے کے ساتھ اگر مشہور نہ ہوا ہو، جیسے شاعر کا شعر "إذا ضاق صدري الخ" ـ

جب میرا دل تنگ ہو جاتا ہے اور دشمنوں کا خوف ہو جاتا ہے تو میں اپنے حال کے مناسب کوئی شعر گنگنانے لگتا ہوں۔

تو بخدا میں اپنے مقصد تک پہنچ جاتا ہوں اور بخدا میں اس مصیبت کو بھی پیچھے ڈال دیتا ہوں جس کے دفعیے کی مجھ میں سکت نہیں ہوتی۔

اور معمولی سی تبدیلی میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ شاعر کا شعر "اقول لمعشر الخ" ۔

میں اس جماعت سے کہتا ہوں جس نے (حق کو پہچاننے میں) غلطی کی اور سیدھے سادھے بوڑھے سے نظر پھیر لی اور اسے اجنبی سمجھا۔

وہ ایک شہرت یافتہ اور تجربے کار شخص کا فرزند ہے جب وہ دستار رکھے گا تو تم اسے پہچان لوگے۔

(۴) عقد وحل، اول، کلام منثور کو منظوم کرنا ہے اور دوسرا، کلام منظوم کو نثر بنانا ہے تو اول جیسے "والظلم الخ" ۔

اور ظلم لوگوں کی عادات میں سے ہے لہٰذا اگر تم کسی پاک دامن سے ملاقات کرو (تو سمجھ لو) کہ کسی علت ہی کی وجہ سے ظلم نہیں کر رہا ہے۔

اس میں ایک دانش مند کے قول کو منظوم کیا گیا ہے کہ ظلم نفس کے خصائل میں سے ہے اور نفس کو ظلم سے دو علتوں میں سے ایک ہی علت روک سکتی ہے، ان میں سے ایک علت دینیہ ہے اور وہ خوف آخرت ہے اور دوسری علت دنیویہ ہے اور وہ دنیوی سزا کا خوف ہے۔

اور دوسرے (یعنی حل کی مثال) جیسے "العیادۃ الخ" تیمارداری ایک ایسی سنت ہے جو باعث ثواب ہے اور ایک اچھا کام ہے جو پہلے لوگوں سے منقول چلا آرہا ہے اور اس کے باوجود ہم ہی مریض ہیں اور ہم ہی تیماردار بھی اور ہر وہ دوستی جو باقی نہ رہے وہ دوستی ہی نہیں، اسی مضمون میں شاعر کے قول کو کھولا گیا ہے "إذا

مرضنا الخ"

جب بیمار ہوتے ہیں تو ہم تمہارے پاس تمہاری عیادت کے لیے آتے ہیں اور تم جرم کے مرتکب ہوتے ہو تو ہم تمہارے پاس معذرت طلب کرتے ہوئے آتے ہیں۔

تشریح: یہاں سے حضرات مصنفین تضمین اور حل وعقد کا بیان فرمارہے ہیں، چناں چہ فرمایا کہ تضمین کا دوسرا نام ایداع بھی ہے، تضمین کے لغوی معنی آتے ہیں ملانا، شامل کرنا، اور فن بلاغت کی اصطلاح میں تضمین یہ ہے کہ شاعر اپنے شعر میں دوسرے شاعر کے شعر کا کچھ حصہ ذکر کرے اور یہ بھی بتادے کہ یہ فلاں کا شعر ہے، بشرطے کہ وہ شعر زبان دانوں میں مشہور نہ ہو، جیسے عبد القاہر تمیمی کا یہ شعر:

إذا ضاق صدري وخفت العدا تمثّلت بيتا بحالي يليق
فبالله ابلغ ما ارتجي وباللهِ ادفع مالا أطيق

لغات: ضاقَ يضِيقُ ضِيقًا (ض) تنگ ہونا، صدر (ج) صدور سینہ، دل، عدی (واحد) عدو، دشمن، تمثل البيت تمثلاً (تفعل) شعر پڑھنا، لاقَ الأمرُ يلِيقُ لَيقًا (ض) مناسب ہونا، ارتجی يرتجي ارتجاءً (افتعال) امید کرنا، أطاقَ إطاقةً (افعال) طاقت رکھنا۔

ترکیب: إذا شرطیہ، ضاق صدري معطوف علیہ، خفت العدى معطوف، جملہ شرط، تمثّلت فعل بافاعل بیتاً موصوف يليق جملہ صفت بحالي متعلق بہ يليق جملہ جزا، فا تفصیلیہ، باللہ اقسم سے متعلق ہوکر قسم، ابلغ فعل بافاعل، ماموصول ارتجي جملہ صلہ، موصول باصلہ مفعول، جملہ جواب قسم، قسم باجواب قسم معطوف علیہ، واو عاطفہ باللہ ادفع مالا أطيق مثل ترکیب سابق جملہ قسمیہ معطوف۔

مذکورہ دونوں اشعار میں سے دوسرا شعر دوسرے شاعر کا ہے جس کی طرف

شاعر عبد القاہر نے تمثلت بیتاً سے اشارہ کردیا ہے مگر یہاں اس کو اپنے شعر کے ساتھ ملا دیا ہے

ولا بأس بالتغير اليسير: فرماتے ہیں کہ اگر تضمین میں تھوڑی بہت تبدیلی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں ہے پھر بھی وہ تضمین ہی مانا جائے گا، جیسے:

اقول لمعشر غلطوا وغضوا　من الشيخ الرّشيد وأنكروه
هو ابن جلا وطلاع الثنايا　متى يضع العمامة تعرفوه

لغات: معشر (ج) معاشر جماعت، غَلِطَ يَغْلَطُ غَلَطًا (س) غلطی کرنا، غَضَّ البَصَرَ يَغُضُّ غَضًّا (ن) نگاہ نیچی کرنا، أنكَرَ إنكارًا پردیسی سمجھنا، جَلاَ يجلُوْا جلاءً (ن) روشن ہونا، ابن جلا شہرت یافتہ شخص کا بیٹا، طَلَعَ علَى الأمرِ يَطْلعُ طلُوعًا (ف ن) واقف ہونا، طَلاَّع صیغہ مبالغہ ہے، هُو طلاَّعُ الثَّنَايا ایک کہاوت ہے، یعنی وہ بڑے بڑے امور کا قصد کرتا ہے، یا وہ امور میں تجربہ کار ہے۔

ترکیب: أقول فعل بافاعل، لمعشر لام جارہ، معشر موصوف، غلطوا وعضوا من الشيخ الرشيد وانكروه جملے معطوف علیہ با معطوف صفت، موصوف صفت مجرور شدہ متعلق بہ أقول جملہ خبریہ، هو مبتدا ابن جلا مرکب اضافی معطوف علیہ، طلّاع الثنايا معطوف، معطوف علیہ با معطوف خبر، متى يضع العمامة شرط، تعرفوه جملہ جزا۔

مذکورہ دونوں اشعار ضیاء الدین موسیٰ کاتب کے ہیں مگر دوسرے شعر میں تضمین کر رکھا ہے، دوسرا شعر اصل میں اس طرح تھا۔

أنا بن جلا وطلاع الثنايا　حتى اضعُ العمامة تعرفوني

یہ شعر سحیم بن وثیل کا ہے جس میں معمولی سی ترمیم کرکے ضیاء الدین نے اپنے شعر میں شامل کردیا ہے اور ترمیم یہ کی ہے کہ صیغۂ تکلم کو صیغۂ غائب سے بدل دیا ہے۔

العقد والحل: تضمین کی تشریح وتوضیح کرنے کے بعد اب حل وعقد کی وضاحت فرمارہے ہیں، حل اور عقد یہ دو لفظ ہیں، حَلَّ العُقْدة يَحُلُّ حلاً (ن) کے معنی آتے ہیں گرہ کھولنا، اور عقَدَ يَعْقِدُ عقْدًا (ض) کے معنی آتے ہیں باندھنا، گرہ لگانا، فن بلاغت کی اصطلاح میں ''عقد'' کہتے ہیں نثر کو نظم بنادینا اور ''حل'' کہتے ہیں نظم کو نثر بنادینا، عقد کی مثال، جیسے ؎

والظلم من شيم النفوس فإن تجد ذاعفة فلعلة لايظلم

لغات: شيمٌ (واحد) شيمة عادت، خصلت۔ عَفَّ يَعِفُّ عِفَّةً (ض) پاک دامن ہونا۔ علة (ج) عللٌ سبب۔

ترکیب: واو مستانفہ، الظلم مبتدا، من شيم النفوس جار مجرور ثابت سے متعلق ہوکر خبر، فا تفصیلیہ، إن شرطیہ، تجد فعل با فاعل ذاعفة مرکب اضافی شدہ مفعول، فا جزائیہ، لِعِلَّة جار با مجرور متعلق مقدم بہ لايظلم جملہ جزا۔

شعر مذکور مشہور شاعر متنبی کا ہے جس نے ایک حکیم کے قول "الظلم من طباع النفس وإنما يصدها عنه الخ" کو نظم میں بیان کیا ہے، عبارت مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت اور طبیعت ظلم بن چکی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کی جائے، ان کی حق تلفی کی جائے اگر کوئی ظلم سے باز رہتا ہے تو اس کی صرف دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ اسے آخرت کا خوف ہے، دوسرے یہ کہ دنیاوی سزا کا اندیشہ ہے۔

والثاني: مثال مذکور تو عقد کی تھی اور حل کی مثال، جیسے "العيادة سنة ماجورة ومكرمة ماثورة الخ" اس پوری عبارت کے مفہوم کو ایک شاعر نے اپنے اس نظم میں بیان کیا ہے:

إذا مرضنا أتينا كم نعودكم وتذنبون فناتيكم ونعتذر

لغات: مَرِضَ يَمْرَضُ مَرَضًا (س) بیمار ہونا، عَادَ يَعُودُ عِيَادةً

(ن) مزاج پرسی کرنا، تیمار داری کرنا، أذنب إذنابًا (افعال) گناہ کا ارتکاب کرنا، اِعْتَذَرَ يَعْتَذِرُ اِعْتِذَارًا (افتعال) معذرت طلب کرنا۔

ترکیب: إذا شرطیہ، مرضنا فعل با فاعل جملہ شرط، أتينا فعل با فاعل، ضمیر ذوالحال، کم مفعول، نعود کم، جملہ حال، ذوالحال با حال فاعل، جملہ جزاء، واو عاطفہ، تذنبون جملہ خبریہ، فا تفصیلیہ ناتیکم جملہ معطوف علیہ نعتذر معطوف۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیماروں کی مزاج پرسی اور تیمار داری جو ایک باعث اجر اور ایک ایسا عمدہ کام ہے جس سے آپسی محبت و اخوت میں اضافہ ہوتا ہے اور بزرگوں کا طریقہ کار رہا ہے لوگوں نے اسے ترک کر دیا ہے اب کوئی کسی کی مزاج پرسی کرنے والا نہیں، اب حال یہ ہے ہم ہی بیمار ہیں اور ہم ہی تیمار دار بھی، جرم کا ارتکاب کوئی اور کرتا ہے معذرت ہم طلب کرتے ہیں اس لیے کہ ہمیں تعلق برقرار رکھنا ہے خواہ دوسرے لوگ اس کی رعایت کریں یا نہ کریں۔

(٥) اَلتَّلْمِيحُ هُوَ أَنْ يُشِيْرَ الْمُتَكَلِّمُ فِيْ كَلَامِهِ إِلٰى آيةٍ أو حَدِيْثٍ أَوْ شِعْرٍ مَشْهُورٍ أَوْ مَثَلٍ سَائِرٍ أو قِصَّةٍ كَقَوْلِهِ ۔

لَعَمْرٌو ومَعَ الرَّمْضَاءِ وَالنَّارِ تَلْتَظِيْ أَرَقُّ وَأَحْفٰى مِنْكَ فِيْ سَاعَةِ الْكَرْبِ

أَشَارَ إِلَى الْبيتِ الْمَشْهُورِ وَهُوَ ۔

أَلْمُسْتَجِيْرُ بِعَمْرٍو عِنْدَ كُرْبَتِهِ كَالْمُسْتَجِيْرِ مِنَ الرَّمْضَاءِ بِالنَّارِ

(٦) حُسْنُ الابْتِدَاءِ هُوَ اَنْ يَّجْعَلَ الْمُتَكَلِّمُ مَبْدَءَ كَلَامِهِ عَذْبَ اللَّفْظِ حُسْنَ السَّبْكِ صَحِيْحَ الْمَعْنٰى فَإِذَا اشْتَمَلَ عَلٰى إِشَارَةٍ لَطِيفَةٍ إِلَى الْمَقْصُودِ سُمِّيَ بَرَاعَةَ الاسْتِهْلَالِ كَقَوْلِهِ فِيْ تَهْنِيَةٍ بِزَوَالِ مَرَضٍ :

أَلْمَجْدُ عُوْفِيَ إِذْ عُوْفِيتَ وَالْكَرَمُ وَزَالَ عَنْكَ إِلٰى أَعْدَائِكَ السُّقْمُ

وَكَقَوْلِ الآخَرِ فِي التَّهْنِيَةِ بِبِنَاءِ قَصْرٍ: ۔

قَصْرٌ عَلَيْهِ تَحِيَّةٌ وَسَلَامٌ خَلَعَتْ عَلَيْهِ جَمَالَهَا الأَيَّامُ

(٧) حُسْنُ التَّخَلُّصِ هُوَ الانْتِقَالُ مِمَّا افْتَتَحَ بِهِ الكَلام إلَى المَقْصُودِ مَعَ رِعَايَةِ المُنَاسَبَةِ بَينَهُمَا كَقَولِهِ : ؎

دَعَتِ النَّوىٰ بِفِرَاقِهِمْ فَتَشَتَّتُوْا وَقَضَى الزَّمانُ بينَهُمْ فَتبَدَّدُوْا

دَهْرٌ ذَمِيمُ الحالَتَينِ فَمَا بِهِ شَيْءٌ سِوَى جُوادِ ابنِ أرتَقَ يُحْمَدُ

ترجمہ: (۵) تلمیح وہ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی آیت یا کسی حدیث یا کسی مشہور شعر یا کسی معروف مثل یا قصے کی طرف اشارہ کرے، جیسے کہ شاعر کا شعر "لعمر مع الرمضاء" ؎

بخدا عمرو گرمی کی تپش اور جلتی ہوئی آگ کے ساتھ بھی مصیبت کے وقت میں تم سے زیادہ نرم دل اور مہربان ہے۔

شاعر نے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ شعر یہ ہے "المستجیر بعمرو الخ" ؎

جو شخص اپنی مصیبت کے وقت عمرو کا پناہ لینے والا ہے، وہ ایسے ہی ہے جیسے وہ شخص جو گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے آگ کی پناہ لے رہا ہو۔

(٦) حسن ابتدا وہ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام کا آغاز شریں الفاظ، بہترین ترتیب اور صحیح المعنی کلمات سے کرے پھر جب یہ کلام ایسے لطیف اشارے پر مشتمل ہو جائے جس سے مقصود کا پتہ چلتا ہو تو اس کا نام براعت استہلال رکھا جاتا ہے، جیسے شاعر کا وہ شعر جو مرض سے شفایاب ہونے کی مبارک کے بادی سلسلے میں ہے "المجد عوفي الخ"

شرافت وسخاوت کو عافیت مل گئی جب آپ کو عافیت ملی اور بیماری آپ سے زائل ہو کر دشمنوں کی طرف منتقل ہوگئی۔

اور جیسے دوسرے شاعر کا شعر محل کی تعمیر کی مبارک بادی کے سلسلے میں "قصر علیه الخ" ؎

محل، اس پر ہمیشہ دعا اور سلام پہنچے جس پر زمانے نے اپنے جمال کا جوڑا ڈال دیا ہے۔

(۷) حسن تخلص وہ منتقل ہونا ہے اس عبارت سے جس سے کلام کا آغاز کیا تھا مقصد کی طرف ان دونوں کے درمیان مناسبت کی رعایت کے ساتھ، جیسے شاعر کا شعر "دعت النوی الخ" ۔

دوری ان کی جدائی کا باعث ہوئی تو وہ سب کے سب علیحدہ ہو گئے اور زمانے نے بھی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جس کی وجہ سے وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

زمانہ دونوں حالتوں میں قابل مذمت ہے چناں چہ اس کے ساتھ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو لائق ستائش ہو سوائے ابن ارتق کی سخاوت کے۔

تشریح: عبارت مذکورہ میں مصنفینؒ نے تلمیح، حسن ابتدا اور حسن تخلص کی وضاحت فرمائی ہے، تلمیح کے لغوی معنی ہیں اشارہ کرنا اور بلاغت کی اصطلاح میں تلمیح یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی آیت، یا حدیث، یا شعر مشہور، یا کہاوت اور قصے کی طرف اشارہ کرے مگر آیت وحدیث وغیرہ کی صراحت نہ کرے، جیسے شاعر کا شعر: ؎

لعمر ومع الرمضاء والنار تلتظي . أرق وأحفى منك في ساعة الكرب

لغات: استجار يستجير استجارةً (استفعال) پناہ چاہنا۔ استجار من أحدٍ استجارةً کسی سے بچنے کے لیے پناہ چاہنا۔ كُربَةٌ (ج) كُرَبٌ مصیبت۔

لام برائے تاکید، عمروٌ مبتدا، أرقَ معطوف علیہ، أحفى معطوف، منك متعلق بہ أحفى معطوف علیہ با معطوف خبر، مَعَ مضاف، الرمضاء معطوف علیہ، واو عاطفہ، النار ذوالحال، تلتظي حال، ذوالحال با حال مضاف الیہ شدہ ظرف ہوا، أرق وأحفى کا۔

شعر مذکور میں شاعر نے مخاطب سے اس کے ظلم کا شکوہ کیا ہے کہ اگر ایک طرف مصیبت کی گھڑی میں زمین کی تپش، سورج کی گرمی اور شقی القلب عمر کا ظلم رکھ دیا جائے اور دوسری طرف تمہارا ظلم ہو تو تمہارا ظلم بقیہ تمام مظالم پر بھاری رہے گا

اس شعر سے شاعر نے ایک دوسرے مشہور شعر کی جانب اشارہ کیا ہے مگر اس کی تصریح نہیں کی ہے، شعر مشہور یہ ہے ؎

المستجیر بعمرو عند کربتہ　　کالمستجیر من الرمضاء بالنار

واضح رہے کہ عمرو شقاوت قلبی میں اس وجہ سے مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کلیب نامی ایک شخص کو جساس بن مرہ نے تیر مارا جس کی وجہ سے وہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا، اور اسی زخمی ہونے کی حالت میں عمرو بن حارث کا وہاں سے گذر ہوا تو زخمی کلیب نے اس سے پانی طلب کیا، عمرو نے پانی دینے کے بجائے اسے قتل کر دیا، تب ہی سے وہ قساوت قلبی میں مشہور ہو گیا۔

حسن الابتداء: حسن ابتدا یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام کے ابتدا میں شیریں الفاظ، عمدہ ترکیبیں، صحیح معانی اور بلند خیالات وغیرہ لائے اب اگر کلام کے الفاظ مقصود کے مناسب اور اس کی طرف اشارہ کرنے والے ہوں تو اس کا نام براعت استہلال ہے، جیسے کہ شاعر کا شعر ؎

المجد عوفي إذا عوفيت والكرم　　وزال عنكَ إلى أعدائك السقم

لغات: عافى يعافي معافاةً (مفاعلة) صحت عطا کرنا، شفا دینا، کرمٌ سخاوت، سُقْمٌ (ج) اسْقَامٌ بیماری، سَقِمَ يَسْقَمُ سُقْمًا (س) بیمار ہونا۔

ترکیب: المجد معطوف علیہ، واو عاطفہ الکرم معطوف، معطوف علیہ با معطوف مبتدا، عوفي جملہ شدہ خبر، إذا عوفيت جملہ شرط، جزا محذوف ہے أي فالمجد والكرم عوفي، زال فعل، عنك متعلق بہ زال، إلى أعدائك متعلق بہ زال، السقم فاعل، جملہ خبریہ۔

شعر مذکور مشہور شاعر متنبّی کا ہے جس میں شاعر نے انتہائی لطیف پیرائے میں اپنے ممدوح کو بیماری کے ختم ہونے پر مبارک باد پیش کی ہے۔

چناں چہ سب سے پہلے شاعر نے کہا "المجد عوفي" آپ کی شفایابی سے شرافت وسخاوت کی صحت ٹھیک ہوگئی یعنی آپ کی بیماری سے گویا یہ سب چیزیں بیماری میں مبتلا ہوگئی تھیں، اور آج جب آپ شفایاب ہو چکے ہیں تو یہ ساری چیزیں بھی ٹھیک ہوگئی ہیں، لفظ "عوفي" ہی سے ممدوح کی شفایابی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا

دوسری مثال، جیسے:

قصر عليه تحية وسلام خلعت عليه جمالها الأيام

لغات: **قصرٌ** (ج) **قصورٌ** محل، **حيّي يحيّي تحيّةً** (تفعیل) کسی کو زندگی کی دعا دینا، **خلع يخلع خلعاً** (ف) خلعت عطا کرنا۔

ترکیب: **قصرٌ** موصوف **عليه** خبر مقدم، **تحية وسلام** معطوف علیہ با معطوف مبتدا مؤخر جملہ خبر مبتدا اول، **خلعت** فعل، **عليه** متعلق بہ **خلعت**، **جمالها** مفعول بہ مقدم، **الأيّام** فاعل، جملہ خبریہ صفت **قصرٌ** موصوف با صفت مبتدا اول۔

یہ شعر ایک محل کی تعمیر پر مبارک بادی کے سلسلے میں ہے جس میں شاعر نے محل ہی کے لیے سلامتی کی دعا دی ہے اور پہلے ہی لفظ (**قصرٌ**) سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ یہ شعر محل کے بارے میں ہے۔

حسن التخلص: حسن تخلص کا مطلب یہ ہے کہ متکلم نے جس مقصد کے لیے کلام شروع کیا تھا اس سے کسی دوسرے مقصد کی جانب کلام کا رخ پھیر دے اور دونوں غرضوں میں مناسبت بھی پائی جائے، جیسے کہ شاعر کے یہ دو شعر:

دعت النوى بفراقهم فتشتّتوا وقضى الزمان بينهم فتبددوا

دهر ذميم الحالتين فما به شيْ سوى جود بن أرتق يحمد

لغات: **النوى** دوری، وہ جگہ جہاں کا مسافر ارادہ کرے، **فَارَقَ مُفَارَقَةً**

وفِرَاقًا جدا ہونا، تَشتت یتشتت تشتتًا (تفعل) جدا ہونا تبدّد تبدُّدًا (تفعل) منتشر ہونا، جاد یجود جودًا (ن) سخاوت کرنا۔

ترکیب: دعت النوی فعل بافاعل، بفراقهم متعلق بہ دعت، جملہ خبریہ، فا تعلیلیہ تشتتُوا فعل بافاعل جملہ خبریہ، واو مستانفہ، قضی الزمان فعل بافاعل بینهم ظرف جملہ خبریہ فا تعلیلیہ، تبددوا جملہ خبریہ، دهرٌ مبتدا، ذمیم الحالتین خبر، فا تعلیلیہ، ما مشابہ بہ لیس، شیٌ مستثنیٰ منہ، سوی حرف استثناء، جود بن ارتق مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ با مستثنیٰ موصوف، یحمد صفت موصوف صفت اسم ما بہ خبر۔

شعر مذکور میں شاعر نے کلام کا آغاز دوستوں کی مفارقت سے کیا ہے کہ مسافرت ہی نے ان کے درمیان افتراق کا فیصلہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان دوستوں کے درمیان تفریق ہوگئی یہ مسافرت وافتراق زمانے ہی کی دین ہے، پھر مذمتِ زمانہ سے اس نے اپنا روئے سخن مقصد اصلی لقمان ابن ارتق کی سخاوت کی مدح کی جانب پھیر دیا اور دونوں کے درمیان استثناء کی نسبت بھی قائم کردی۔

(۸) بَرَاعَةُ الطَّلَبِ هُوَ أنْ يَشِيْرَ الطَّالِبُ إلىٰ مَا فِيْ نَفْسِهِ دُونَ أن يُصَرِّحَ فِي الطَّلَبِ كَمَا فِيْ قَولِهِ ؎

وفِي النَّفْسِ حَاجَاتٌ وفِيكَ فَطَانَةٌ سُكُوتِيْ كَلامٌ عِنْدَهَا وَخِطَابُ

(۹) حُسنُ الانْتِهَاءِ هُوَ أنْ يُجْعَلَ آخرُ الكَلامِ عَذْبَ اللَّفْظِ حَسَنَ السَّبْكِ صَحِيحَ المعْنىٰ ، فَإن اشْتَمَلَ عَلىٰ مَايُشْعِرُ بِالانْتِهَاءِ سُمِّيَ بَرَاعَةَ المَقْطَعِ كَقَولِهِ ؎

بَقِيتَ بَقَاءَ الدَّهرِ يَا كَهْفَ أهْلِهِ وهٰذَا دُعَاءٌ لِلْبَرِيَّةِ شَامِلُ

ترجمہ: (۸) براعت طلب وہ یہ ہے کہ طالب اس مقصد کی طرف اشارہ کرے جو اس کے دل میں ہے بغیر اس کے کہ وہ طلب میں صراحت کرے جیسے

شاعر کے شعر "وفي النفس الخ" ؎

دل میں ضرورتیں پنہاں ہیں اور آپ ہیں ذہانت ہے اس کے ہوتے ہوئے میرا خاموش رہنا تکلم اور تخاطب ہے۔

(۹) حسن انتہاء: وہ یہ ہے کہ کلام کے آخر کو شیریں لفظ، بہترین ترکیب اور صحیح المعنی بنایا جائے، پس اگر وہ ایسے الفاظ پر مشتمل ہو، جس سے اختتام کا پتہ چلتا ہو تو اس کا نام براعت المقطع ہے، جیسے شاعر کا شعر "بقیت بقاء الدهر الخ"

تمہیں بقاء عطا ہو زمانے کے بقاء کی طرح، اے زمانے والوں کی جائے پناہ! اور یہ دعا پوری مخلوق کو شامل ہو۔

تشریح: عبارت بالا میں براعت طلب اور حسن انتہا کی وضاحت کی گئی ہے، براعت طلب کا مطلب یہ ہے کہ طالب اپنے کلام میں اپنے دل کی باتوں کو واضح کر دے مگر مطلب میں اس کی صراحت نہ کرے، جیسے شاعر کا یہ شعر ؎

وفي النفس حاجات وفيك فطانة سكوتي كلام عندها وخطاب

لغات: فَطِنَ يَفطَنُ فَطَانَةً (س) دانش مند ہونا، سَكَتَ يَسْكُتُ سكوتًا (ن) خاموش رہنا، خَاطَبَ مخاطَبَةً ایک دوسرے سے مخاطب ہونا۔

ترکیب: واو مستانفہ، في النفس ثابتةٌ کے متعلق ہو کر خبر مقدم، حاجاتٌ مبتدا مؤخر، فيك خبر مقدم، فطانة مبتدا مؤخر، سكوتي مبتدا، كلام وخطاب معطوف علیہ و معطوف خبر، عندها ظرف۔

شعر مذکور متنبّی کا ہے جو اس نے کافور اخشیدی کی شان میں کہا ہے، اس شعر میں شاعر نے اپنی ضرورتوں کو بیان کیا ہے کہ میں ضرورت مند ہوں اور اس کی طرف اپنے کلام "وفي النفس حاجات" سے اشارہ کر دیا ہے مگر طلب میں صراحت نہیں کی ہے اور یہ کہہ کر اپنی بات واضح کر دیا ہے کہ رب کریم نے آپ میں اتنی دانش مندی رکھ دی ہے کہ میرا خاموش رہنا ہی گویا آپ سے گفتگو کرنا اور

اپنی ضروریات کو بیان کر دینا ہے۔

حسن الانتهاء: حسن انتہاء کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں شیریں کلمات، عمدہ ترکیب، بہترین ترتیب صحیح معنی لائے اور اگر اسی کے ساتھ ساتھ مضمون بھی ایسا ہو جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ کلام اپنے اختتام پر پہنچا ہے تو اس کا نام براعت مقطع اور حسن اختتام رکھا جاتا ہے، جیسے ۔

بقيت بقاء الدهر يا كهف أهله وهذا دعاء للبرية شامل

لغات: بَقِيَ يَبْقَى بَقَاءً (س) باقی رہنا، دَهْرٌ (ج) دُهُورٌ زمانہ، كَهْفٌ (ج) كُهُوفٌ جائے پناہ۔

ترکیب: بقيت فعل با فاعل، بقاء الدهر مرکب اضافی شدہ مفعول مطلق، جملہ خبریہ، يا كهف أهله، ندا با منادیٰ جملہ ندائیہ انشائیہ، هذا مبتدا، دعاءٌ موصوف، شامل صیغہ صفت للبرية متعلق بہ شامل، موصوف با صفت خبر، مبتدا با خبر جملہ اسمیہ خبریہ۔

شعر مذکور قصیدے کا آخری شعر ہے اس شعر میں جہاں شاعر نے شیریں کلمات، بہترین ترتیب کا استعمال کیا ہے وہیں شعر کا مضمون بھی ایسا ہے جس سے شعر کے خاتمے کی طرف اشارہ مل رہا ہے کیوں کہ آخر میں دعا ہے اور ظاہر ہے دعا آخر میں ہی کی جاتی ہے۔

تم الكتاب بتوفيق الله تعالىٰ وعونه اللّٰهُمَّ اغفِرلِيْ ولِوالدَيَّ ولأسَاتِذَتِيْ ولِجَمِيعِ المؤمِنِينَ والمؤمِنَات والمُسلِمِينَ وَالمُسلِمات، وَتَقبَّلْ مِنَّا إنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ وتُبْ عَلَينا إنَّكَ أنت التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی